سُنّت کی آئینی حیثیّت

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
3- کورٹ سٹریٹ، لوئر مال روڈ، لاہور

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

نام کتاب : سنت کی آئینی حیثیت

مصنف : سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اشاعت : ایڈیشن — تعداد

۲۱ — ۱،۱۰۰

جنوری 2003ء

اہتمام : پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)

ناشر : اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

3- کورٹ سٹریٹ، لوئر مال، لاہور (پاکستان)

فون : 7320961-7248676 فیکس: 7214974

ویب سائٹ : www.islamicpak.com.pk

ای میل : islamicpak@hotmail.com
islamicpak@yahoo.com

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

قیمت : -/96 روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

اس کتاب کے مضامین پہلے رسالہ ترجمان القرآن لاہور کے خاص نمبر "منصب رسالت نمبر" میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب ہم اپنے قارئین کے شدید اصرار پر انہی مضامین کو "سنت کی آئینی حیثیت" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے کچھ معمولی ترمیم و حذف سے کام لینا پڑا ہے اور وہ ترمیم و حذف یہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے تیسرے خط کا بڑا حصہ جو کہ "دشنام طرازی اور تکرار بیان پر مبنی تھا" حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کی بجائے ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے اپنے اس مکتوب میں جو نکات اٹھائے ہیں ان کو ان ہی کے الفاظ میں اعتراضات و سوالات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اور ان کے جواب میں مولانا مودودی صاحب کے وہی الفاظ نقل کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اس طرح قارئین ان لایعنی اور طویل تحریروں کے مطالعہ کی زحمت سے بچ جائیں گے جو ڈاکٹر صاحب کے تیسرے مکتوب میں بکثرت موجود تھیں اور مغز بحث کو زیادہ آسانی سے پالیں گے۔

اس کتاب کے بارے میں ہمارا کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ ترجمان القرآن کے خاص نمبر "منصب رسالت نمبر" کو ملک و بیرون ملک کے ہر طبقہ خیال سے تعلق رکھنے والے حضرات، وکلاء، ادباء، عالمان دین، مصنفین اور صحافیوں نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ مولانا موصوف نے جس شاندار طریقہ سے سنت نبوی کی مدافعت کی ہے اور اس کو جس واضح اور منقح شکل میں پیش کیا ہے، موجودہ زمانہ میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

ہم نے اس معرکہ آرا تالیف کے شایان شان اس کو آفسٹ کی اعلیٰ اور حسین طباعت پر شائع کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ حامیان سنت نبوی اور شائقین علم وکتب اس کی وہی قدر فرمائیں گے جس کی یہ عظیم تالیف مستحق ہے۔

لاہور۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ

مطابق ۳ اگست ۱۹۶۳ء

فہرست مضامین

دیباچہ ۱۳

سنت کی آئینی حیثیت۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب سے ایک مراسلت

ڈاکٹر صاحب کا پہلا خط اور اس کا جواب ۲۵

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خط ۲۷

جواب ۲۹

سنت کیا چیز ہے؟ ۳۰

سنت کس شکل میں موجود ہے؟ ۳۳

کیا سنت متفق علیہ ہے؟ اور اس کی تحقیق کا ذریعہ کیا ہے؟ ۴۰

چار بنیادی حقیقتیں ۴۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی نوعیت ۴۸

حضورؐ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت کا فرق ۴۹

قرآن سے زائد ہونا اور قرآن کے خلاف ہونا ہم معنی نہیں ہے ۵۰

کیا سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے؟ ۵۱

احادیث کے پرکھنے میں روایت اور درایت کا استعمال ۵۳

منصب نبوت، صحیح اور غلط تصور کا فرق۔ ڈاکٹر صاحب سے مزید مراسلت ۵۹

ڈاکٹر صاحب کا خط ۵۹

جواب ۶۶

(۱) منصب نبوت اور اس کے فرائض ۶۷

رسول بحیثیت معلم و مربی ۶۹

رسول بحیثیت شارح کتاب اللہ ۷۱

رسول بحیثیت پیشوا و نمونہ تقلید ۷۲

رسول بحیثیت شارع ۷۳

رسول بحیثیت قاضی ۷۵

رسول بحیثیت حاکم و فرمانروا ۷۶

سنت کے ماخذ قانون ہونے پر امت کا اجماع ۷۹

(۲) رسول پاکؐ کے تشریعی اختیارات ۸۰

حضورؐ کے تشریعی کام کی نوعیت ۸۱

اس تشریعی کام کی چند مثالیں ۸۲

(۳) سنت اور اتباع سنت کا مفہوم ۸۴

(۴) رسول پاکؐ کس وحی کے اتباع پر مامور تھے اور ہم کس کے اتباع پر مامور ہیں۔ ۸۶

(۵) مرکز ملت؟ ۸۹

چند اصولی سوالات ۹۰

(۶) کیا حضورؐ صرف قرآن پہنچانے کی حد تک نبی تھے؟ ۹۳

(۷) حضورؐ کی اجتہادی لغزشوں سے غلط استدلال ۹۶

(۸) موہوم خطرات ۹۹

(۹) خلفائے راشدین پر بہتان ۱۰۳

(۱۰) کیا حضورؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی؟ ۱۱۰

سنت کے متعلق چند مزید سوالات۔ بسلسلہ مراسلت سابقہ ۱۱۶

ڈاکٹر صاحب کا خط ۱۱۶

جواب ۱۱۹

وحی پر ایمان کی وجہ ۱۲۳

ما انزل اللہ سے کیا چیز مراد ہے؟ ۱۲۴

سنت کہاں ہے؟ ۱۲۸

کیا سنت کی حفاظت بھی خدا نے کی ہے؟ ۱۲۹

وحی سے مراد کیا چیز ہے؟ ۱۳۱

محض تکرار سوال ۱۳۲

ایمان و کفر کا مدار ۱۳۳

کیا احکام سنت میں رد و بدل ہو سکتا ہے؟ ۱۳۴

اعتراضات و جوابات: ۱۳۵

۱۔ "بزم طلوع اسلام" سے تعلق؟ ۱۳۵

۲۔ کیا گشتی سوال نامہ کا مقصد علمی تحقیق تھا؟ ۱۳۶

۳۔ رسولؐ کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبویؐ ۱۳۷

۴۔ تعلیمات سنت میں فرق مراتب ۱۴۰

۵۔ علمی تحقیق یا جھگڑالو پن؟ ۱۴۲

۶۔ رسولؐ کی دونوں حیثیتوں میں امتیاز کا اصول اور طریقہ ۱۴۴

۷۔ احادیث قرآن کی طرح لکھوائی کیوں نہیں گئیں؟ ۱۴۶

۸۔ دجل و فریب کا ایک نمونہ ۱۴۸

۹۔ حدیث میں کیا چیز مشکوک ہے اور کیا مشکوک نہیں ہے ۱۴۹

۱۰۔ ایک اور فریب ۱۵۱

۱۱۔ کیا امت میں کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے؟ ۱۵۳

۱۲۔ سنت نے اختلافات کم کیے ہیں یا بڑھائے ہیں؟ ۱۵۴

۱۳۔ منکرین سنت اور منکرین ختم نبوت میں وجوہ مماثلت ۱۵۶

۱۴۔ کیا آئین کی بنیاد صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جس میں اختلاف ممکن نہ ہو؟ ۱۵۸

۱۵۔ قرآن اور سنت دونوں کے معاملہ میں رفع اختلاف کی صورت ایک ہی ہے ۱۵۹

۱۶۔ ایک دلچسپ مغالطہ ۱۶۰

۱۷۔ شخصی قانون اور ملکی قانون میں تفریق کیوں؟ ۱۶۱

۱۸۔ حیثیت رسولؐ کے بارے میں فیصلہ کن بات سے گریز ۱۶۳

۱۹۔ کیا کسی غیر نبی کو نبی کی تمام حیثیات حاصل ہو سکتی ہیں؟ ۱۶۴

۲۰۔ اسلامی نظام کے "امیر" اور منکرین حدیث کے "مرکز ملت" میں عظیم فرق ۱۶۵

۲۱۔ عہد رسالت میں مشاورت کے حدود کیا تھے؟ ۱۷۰
۲۲۔ اذان کا طریقہ مشورے سے طے ہوا تھا یا الہام سے؟ ۱۷۱
۲۳۔ حضورؐ کے عدالتی فیصلے سند و حجت ہیں یا نہیں؟ ۱۷۳
۲۴۔ کج بحثی کا ایک عجیب نمونہ ۱۷۵
۲۵۔ حضورؐ کے ذاتی خیال اور بربنائے وحی کہی ہوئی بات میں واضح امتیاز تھا ۱۷۶
۲۶۔ کیا صحابہؓ اس بات کے قائل تھے کہ حضورؐ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں؟ ۱۷۷
۲۷۔ مسئلہ طلاق ثلاثہ میں حضرت عمرؓ کے استدلال کے فیصلے کی اصل نوعیت ۱۸۰
۲۸۔ مولفۃ القلوب کے بارے میں حضرت عمرؓ کے استدلال کی نوعیت ۱۸۱
۲۹۔ کیا مفتوحہ اراضی کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ حکم رسولؐ کے خلاف تھا؟ ۱۸۲
۳۰۔ وظائف کی تقسیم کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ ۱۸۳
۳۱۔ کیا قرآن کے معاشی احکام عبوری دور کے لیے ہیں؟ ۱۸۳
۳۲۔ عبوری دور کا غلط مفہوم ۱۸۵
۳۳۔ حضورؐ صرف شارح قرآن ہی ہیں یا شارع بھی؟ ۱۸۶
۳۴۔ بصیرت رسولؐ کے خدا داد ہونے کا مفہوم ۱۸۹
۳۵۔ وحی کی اقسام از روئے قرآن ۱۹۱
۳۶۔ وحی غیر متلو پر ایمان ایمان بالرسول کا جز ہے ۱۹۴
۳۷۔ کیا وحی غیر متلو بھی جبریل ہی لاتے تھے؟ ۱۹۷
۳۸۔ کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہیں یا الگ الگ ۱۹۸
۳۹۔ لفظ "تلاوت" کے معنی ۲۰۰
۴۰۔ کتاب کے ساتھ میزان کے نزول کا مطلب ۲۰۱
۴۱۔ ایک اور کج بحثی ۲۰۲
۴۲۔ تحویل قبلہ والی آیت میں کون سا قبلہ مراد ہے؟ ۲۰۴
۴۳۔ قبلے کے معاملہ میں رسول کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا سوال کیسے ۲۰۷

پیدا ہوتا تھا

۴۴۔ نبی پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام ۲۰۸

۴۵۔ لقد صدق اللہ رسولہ الرویا کا مطلب ۲۱۰

۴۶۔ کیا وحی خواب کی صورت میں بھی ہوتی ہے؟ ۲۱۱

۴۷۔ بے معنی اعتراضات اور الزامات ۲۱۴

۴۸۔ نبانی العلیم الخبیر کا مطلب ۲۱۶

۴۹۔ حضرت زینبؓ کا نکاح اللہ کے حکم سے ہوا تھا یا نہیں؟ ۲۱۸

۵۰۔ باذن اللہ سے مراد قاعدہ جاریہ ہے یا حکم الٰہی؟ ۲۲۱

۵۱۔ ایک اور خانہ ساز تاویل ۲۲۳

۵۲۔ سوال از آسمان وجواب از ریسماں ۲۲۵

۵۳۔ وحی بلا الفاظ کی حقیقت و نوعیت ۲۲۶

۵۴۔ وحی متلو اور غیر متلو کا فرق ۲۲۷

۵۵۔ سنت ثابتہ کو ماننے سے انکار اطاعت رسولؐ سے انکار ہے ۲۲۸

عدالت عالیہ مغربی پاکستان کا ایک اہم فیصلہ (ترجمہ ملک غلام علی) ۲۲۹

تبصرہ: (از ابوالاعلیٰ مودودی) ۲۶۹

دو اصولی سوالات ۲۷۰

فقہ حنفی کی اصل حیثیت ۲۷۲

فاضل جج کے بنیادی تصورات ۲۷۸

تصورات مذکورہ پر تنقید ۲۸۱

اجتہاد کے چند نمونے ۲۸۳

تعدد ازواج کے مسئلے میں فاضل جج کا اجتہاد ۲۸۳

اس اجتہاد کی پہلی غلطی ۲۸۴

دوسری غلطی ۲۸۵

تیسری غلطی ۲۸۷

چوتھی غلطی ۲۸۸
پانچویں غلطی ۲۸۹
دوسرا اجتہاد' حد سرقہ کے بارے میں ۲۹۳
تیسرا اجتہاد' حضانت کے مسئلے میں ۲۹۳
بنیادی غلطی ۲۹۳
سنت کے بارے میں فاضل جج کا نقطہ نظر ۲۹۳
سنت کے بارے میں امت کا رویہ ۲۹۵
فاضل جج کے نزدیک دین میں نبی کی حیثیت ۲۹۶
نبی کی اصل حیثیت از روئے قرآن ۲۹۸
کیا وحی صرف قرآن تک محدود ہے؟ ۳۰۳
کیا حضورؐ اپنے خیالات کی پیروی کے لیے آزاد تھے؟ ۳۰۳
حضورؐ کی سنت غلطیوں سے پاک ہے یا نہیں؟ ۳۰۵
اتباع رسولؐ کا حقیقی مفہوم ۳۰۶
کیا حضورؐ کی رہنمائی صرف اپنے زمانے کے لیے تھی؟ ۳۰۷
خلفائے راشدین کے اتباع سنت کی وجہ ۳۰۹
امام ابو حنیفہؒ کا علم حدیث اور اتباع سنت ۳۱۰
فاضل جج کے نزدیک احادیث پر اعتماد نہ کرنے کے وجوہ ۳۱۳
وجوہ مذکورہ پر تنقید ۳۱۷
کیا جھوٹی حدیثیں اسلامی قانون کا ماخذ بنی ہیں؟ ۳۱۷
کیا جھوٹی حدیثیں حضورؐ کے زمانے میں ہی رواج پانے لگی تھیں؟ ۳۱۸
حضرت عمرؓ نے کثرت روایت سے کیوں منع کیا؟ ۳۱۹
امام بخاریؒ کی چھ لاکھ حدیثوں کا افسانہ ۳۲۰
جھوٹی حدیثیں آخر گھڑی ہی کیوں گئیں؟ ۳۲۲
استدلال کی تین غلط بنیادیں ۳۲۳

کتابت حدیث کی ابتدائی ممانعت اور اس کے وجوہ ۳۲۳
کتابت حدیث کی عام اجازت ۳۲۴
احادیث کو زبانی روایت کرنے کی ہمت افزائی بلکہ تاکید ۳۲۶
جھوٹی حدیث روایت کرنے پر سخت وعید ۳۲۸
سنت رسولؐ کے حجت ہونے کی صریح دلیل ۳۲۹
کیا قابل اعتماد صرف لکھی ہوئی چیز ہی ہوتی ہے؟ ۳۳۲
کیا احادیث ڈھائی سو برس تک گوشہ خمول میں پڑی رہیں؟ ۳۳۴
صحابہؓ کی روایت حدیث ۳۳۶
دور صحابہؓ سے امام بخاریؒ کے دور تک علم حدیث کی مسلسل تاریخ ۳۳۷
دوسری صدی ہجری کے جامعین حدیث ۳۴۱
احادیث میں اختلاف کی حقیقت ۳۴۳
کیا حافظہ سے نقل کی ہوئی روایات ناقابل اعتماد ہیں؟ ۳۴۴
احادیث کے محفوظ رہنے کی اصل علت ۳۴۶
احادیث کی صحت کا ایک اہم ثبوت ۳۴۸
چند احادیث پر فاضل جج کے اعتراضات ۳۵۰
بعض احادیث میں عریاں مضامین کیوں ہیں؟ ۳۵۱
اعتراضات کا تفصیلی جائزہ ۳۵۳
دو مزید حدیثوں پر اعتراض ۳۵۷
ایک اور حدیث پر اعتراض ۳۵۸
سنت کے حجت نہ ہونے پر دو مزید دلیلیں ۳۶۰
کیا محدثین کو خود احادیث پر اعتماد نہ تھا؟ ۳۶۱
احادیث میں اجمال اور بے ربطی کی شکایت ۳۶۲
کیا حدیث قرآن میں ترمیم کرتی ہے؟ ۳۶۳
آخری گزارش ۳۶۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

انکار سنت کا فتنہ اسلامی تاریخ میں سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں اٹھا تھا۔ اور اس کے اٹھانے والے خوارج اور معتزلہ تھے۔ خوارج کو اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مسلم معاشرے میں جو انارکی وہ پھیلانا چاہتے تھے' اس کی راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سنت حائل تھی جس نے اس معاشرے کو ایک نظم و ضبط پر قائم کیا تھا۔ اور اس کی راہ میں حضورؐ کے وہ ارشادات حائل تھے جن کی موجودگی میں خوارج کے انتہا پسندانہ نظریات نہ چل سکتے تھے۔ اس بنا پر انہوں نے احادیث کی صحت میں شک اور سنت کے واجب الاتباع ہونے سے انکار کی دوگونہ پالیسی اختیار کی۔ معتزلہ کو اس کی ضرورت اس لیے لاحق ہوئی کہ عجمی اور یونانی فلسفوں سے پہلا سابقہ پیش آتے ہی اسلامی عقائد اور اصول و احکام کے بارے میں جو شکوک و شبہات ذہنوں میں پیدا ہونے لگے تھے انہیں پوری طرح سمجھنے سے پہلے وہ کسی نہ کسی طرح انہیں حل کر دینا چاہتے تھے۔ خود ان فلسفوں میں ان کو وہ بصیرت حاصل نہ ہوئی تھی کہ ان کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کی صحت و قوت جانچ سکتے۔ انہوں نے ہر اس بات کو جو فلسفے کے نام سے آئی' سراسر عقل کا تقاضا سمجھا اور یہ چاہا کہ اسلام کے عقائد اور اصولوں کی ایسی تعبیر کی جائے جس سے وہ ان نام نہاد عقلی تقاضوں کے مطابق ہو جائیں۔ اس راہ میں پھر وہی حدیث و سنت مانع ہوئی۔ اس لیے انہوں نے بھی خوارج کی طرح حدیث کو مشکوک ٹھیرایا اور سنت کو حجت ماننے سے انکار کیا۔

ان دونوں فتنوں کی غرض اور ان کی ٹیکنیک مشترک تھی۔ ان کی غرض یہ تھی کہ قرآن کو اس کے لانے والے کی قولی و عملی تشریح و توضیح سے' اور اس نظام

فکر و عمل سے جو خدا کے پیغمبر نے اپنی رہنمائی میں قائم کر دیا تھا' الگ کر کے مجرد ایک کتاب کی حیثیت سے لے لیا جائے' اور پھر اس کی من مانی تاویلات کر کے ایک دوسرا نظام بنا ڈالا جائے جس پر اسلام کا لیبل چسپاں ہو۔ اس غرض کے لیے جو ٹیکنیک انہوں نے اختیار کی اس کے دو حربے تھے--- ایک یہ کہ احادیث کے بارے میں یہ شک دلوں میں ڈالا جائے کہ وہ فی الواقع حضورؐ کی ہیں بھی یا نہیں۔ دوسرے' یہ اصولی سوال اٹھایا جائے کہ کوئی قول یا فعل حضورؐ کا ہو بھی تو ہم اس کی اطاعت و اتباع کے پابند کب ہیں۔ ان کا نقطہ نظریہ تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک قرآن پہنچانے کے لیے مامور کیے گئے تھے' سو انہوں نے وہ پہنچا دیا۔ اس کے بعد محمدؐ بن عبداللہ ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے ہم ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا اور کیا وہ ہمارے لیے حجت کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ دونوں فتنے تھوڑی مدت چل کر اپنی موت آپ مر گئے اور تیسری صدی کے بعد پھر صدیوں تک اسلامی دنیا میں ان کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ جن بڑے بڑے اسباب نے اس وقت ان فتنوں کا قلع قمع کر ڈالا' وہ حسب ذیل تھے:

۱۔ محدثین کا زبردست تحقیقی کام' جس نے مسلمانوں کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگوں کو مطمئن کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت جن روایات سے ثابت ہوتی ہے' وہ ہرگز مشتبہ نہیں ہیں بلکہ نہایت معتبر ذرائع سے امت کو پہنچی ہیں' اور ان کو مشتبہ روایات سے الگ کرنے کے لیے بہترین علمی ذرائع موجود ہیں۔

۲۔ قرآن کی تصریحات' جن سے اس زمانے کے اہل علم نے عام مسلمانوں کے سامنے یہ بات ثابت کر دی کہ دین کے نظام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حیثیت ہرگز نہیں ہے جو منکرین سنت حضورؐ کو دینا چاہتے ہیں۔ آپؐ قرآن پہنچا دینے کے لیے محض ایک نامہ بر مقرر نہیں کیے گئے تھے' بلکہ آپؐ کو خدا نے معلم' رہنما' مفسر قرآن' شارع قانون اور قاضی و حاکم بھی مقرر کیا تھا۔ لہٰذا

خود قرآن ہی کی رو سے آپؐ کی اطاعت و پیروی ہم پر فرض ہے اور اس سے آزاد ہو کر جو شخص قرآن کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے وہ دراصل قرآن کا پیرو بھی نہیں ہے۔

۳۔ منکرین سنت کی اپنی تاویلات' جن کا کھلونا قرآن کو بنا کر انہوں نے عام مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت بالکل برہنہ کر دی کہ سنت رسول اللہؐ سے جب کتاب اللہ کا تعلق توڑ دیا جائے تو دین کا حلیہ کس بری طرح بگڑتا ہے' خدا کی کتاب کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلے جاتے ہیں' اور اس کی معنوی تحریف کے کیسے مضحکہ انگیز نمونے سامنے آتے ہیں۔

۴۔ امت کا اجتماعی ضمیر' جو کسی طرح یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ مسلمان کبھی رسولؐ کی اطاعت و پیروی سے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ چند سرپھرے انسان تو ہر زمانے اور ہر قوم میں ایسے نکلتے ہیں جو بے تکی باتوں ہی میں تک محسوس کرتے ہوں۔ مگر پوری امت کا سرپھرا ہو جانا بہت مشکل ہے۔ عام مسلمانوں کے ذہنی سانچے میں یہ غیر معقول بات کبھی ٹھیک نہ بیٹھ سکی کہ آدمی رسولؐ کی رسالت پر ایمان بھی لائے اور پھر اس کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن سے اتار بھی پھینکے۔ ایک سیدھا سادھا مسلمان' جس کے دماغ میں ٹیڑھ نہ ہو' عملاً نافرمانی کا مرتکب تو ہو سکتا ہے' لیکن یہ عقیدہ کبھی اختیار نہیں کر سکتا کہ جس رسولؐ پر وہ ایمان لایا ہے اس کی اطاعت کا وہ سرے سے پابند ہی نہیں ہے۔ یہ سب سے بڑی بنیادی چیز تھی جس نے آخرکار منکرین سنت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔۔۔ اس پر مزید یہ کہ مسلمان قوم کا مزاج اتنی بڑی بدعت کو ہضم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہو سکا کہ اس پورے نظام زندگی کو' اس کے تمام قاعدوں اور ضابطوں اور اداروں سمیت' رد کر دیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے شروع ہو کر خلفائے راشدین' صحابہ کرام' تابعین' ائمہ مجتہدین اور فقہائے امت کی رہنمائی میں مسلسل ایک ہموار طریقے سے ارتقاء کرتا چلا آ رہا تھا' اور اسے چھوڑ کر آئے دن ایک نیا

نظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں بنوایا جائے جو دنیا کے ہر فلسفے اور ہر تخیل سے متاثر ہو کر اسلام کا ایک جدید ایڈیشن نکالنا چاہتے ہوں۔

اس طرح فنا کے گھاٹ اتر کر یہ انکار سنت کا فتنہ کئی صدیوں تک اپنی شمشان بھومی میں پڑا رہا' یہاں تک کہ تیرہویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں وہ پھر جی اٹھا۔ اس نے پہلا جنم عراق میں لیا تھا۔ اب یہ دوسرا جنم اس نے ہندوستان میں لیا۔ یہاں اس کی ابتداء کرنے والے سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی تھے۔ پھر مولوی عبداللہ چکڑالوی اس کے علمبردار بنے۔ اس کے بعد مولوی احمد الدین امرتسری نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ پھر مولانا اسلم جیراج پوری اسے لے کر آگے بڑھے اور آخرکار اس کی ریاست چودھری غلام احمد پرویز کے حصے میں آئی جنہوں نے اس کو ضلالت کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

اس کی دوسری پیدائش کا سبب بھی وہی تھا جو دوسری صدی میں پہلی مرتبہ اس کی پیدائش کا سبب بنا تھا' یعنی بیرونی فلسفوں اور غیر اسلامی تہذیبوں سے سابقہ پیش آنے پر ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا ہو جانا' اور تنقید کے بغیر باہر کی ان ساری چیزوں کو سراسر تقاضائے عقل مان کر اسلام کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا۔ لیکن دوسری صدی کی بہ نسبت تیرہویں صدی کے حالات بہت مختلف تھے۔ اس وقت مسلمان فاتح تھے' ان کو فوجی و سیاسی غلبہ حاصل تھا' اور جن فلسفوں سے انہیں سابقہ پیش آیا تھا' وہ مفتوح و مغلوب قوموں کے فلسفے تھے۔ اس وجہ سے ان کے ذہن پر ان فلسفوں کا حملہ بہت ہلکا ثابت ہوا اور بہت جلدی رد کر دیا گیا۔ اس کے برعکس تیرہویں صدی میں یہ حملہ ایسے وقت میں ہوا جبکہ مسلمان ہر میدان میں پٹ چکے تھے۔ ان کے اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی۔ ان کے ملک پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ان کو معاشی حیثیت سے بری طرح کچل ڈالا گیا تھا' ان کا نظام تعلیم درہم برہم کر دیا گیا تھا' اور ان پر فاتح قوم نے اپنی تعلیم' اپنی تہذیب' اپنی زبان' اپنے قوانین' اور اپنے اجتماعی و سیاسی اور معاشی اداروں کو پوری طرح

مسلط کر دیا تھا۔ ان حالات میں جب مسلمانوں کو فاتحوں کے فلسفے اور سائنس سے اور ان کے قوانین اور تہذیبی اصولوں سے سابقہ پیش آیا تو قدیم زمانے کے معتزلہ کی بہ نسبت ہزار درجہ زیادہ سخت مرعوب ذہن رکھنے والے معتزلہ ان کے اندر پیدا ہونے لگے۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ مغرب سے جو نظریات' جو افکار و تخیلات' جو اصول تہذیب و تمدن اور جو قوانین حیات آ رہے ہیں' وہ سراسر معقول ہیں' ان پر اسلام کے نقطہ نظر سے تنقید کر کے حق و باطل کا فیصلہ کرنا محض تاریک خیالی ہے۔ زمانے کے ساتھ چلنے کی صورت بس یہ ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق ڈھال دیا جائے۔

اس غرض سے جب انہوں نے اسلام کی مرمت کرنی چاہی تو انہیں بھی وہی مشکل پیش آئی جو قدیم زمانے کے معتزلہ کو پیش آئی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کے نظام حیات کو جس چیز نے تفصیلی اور عملی صورت میں قائم کیا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اسی سنت نے قرآن کی ہدایات کا مقصد و منشا متعین کر کے مسلمانوں کے تہذیبی تصورات کی تشکیل کی ہے۔ اور اسی نے ہر شعبہ زندگی میں اسلام کے عملی ادارے مضبوط بنیاد پر تعمیر کر دیئے ہیں۔ لہذا اسلام کی کوئی مرمت اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اس سنت سے پیچھا چھڑایا جائے۔ اس کے بعد صرف قرآن کے الفاظ رہ جاتے ہیں جن کے پیچھے نہ کوئی عملی نمونہ ہو گا' نہ کوئی مستند تعبیر و تشریح ہو گی اور نہ کسی قسم کی روایات اور نظیریں ہوں گی۔ ان کو تاویلات کا تختہ مشق بنانا آسان ہو گا اور اس طرح اسلام بالکل ایک موم کا گولہ بن کر رہ جائے گا جسے دنیا کے ہر چلتے ہوئے فلسفے کے مطابق ہر روز ایک نئی صورت دی جا سکے گی۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے پھر وہی ٹیکنیک' انہی دو حربوں کے ساتھ اختیار کیا جو قدیم زمانے میں اختیار کیا گیا' یعنی ایک طرف ان روایات کی صحت میں شک ڈالا جائے جن سے سنت ثابت ہوتی ہے' اور دوسری طرف سنت کو بجائے خود حجت

و سند ہونے سے انکار کر دیا جائے۔ لیکن یہاں پھر حالات کے فرق نے اس ٹیکنیک اور اس کے حربوں کی تفصیلی صورت میں بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔ قدیم زمانے میں جو لوگ اس فتنے کا علم لے کر اٹھے تھے وہ ذی علم لوگ تھے۔ عربی زبان و ادب میں بڑا پایہ رکھتے تھے۔ قرآن' حدیث اور فقہ کے علوم میں کافی درک رکھتے تھے۔ اور ان کو سابقہ بھی اس مسلمان پبلک سے تھا' جس کی علمی زبان عربی تھی' جس میں عام لوگوں کا تعلیمی معیار بہت بلند تھا' جس میں علوم دینی کے ماہرین بہت بڑی تعداد میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ایسی پبلک کے سامنے کوئی کچی پکی بات لا کر ڈال دینے سے خود اس شخص کی ہوا خیزی ہو جانے کا خطرہ تھا جو ایسی بات لے کر آئے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانے کے معتزلہ بہت سنبھل کر بات کرتے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے دور میں جو لوگ اس فتنے کو ہوا دینے کے لیے اٹھے ہیں ان کا اپنا علمی پایہ بھی سرسید کے زمانہ سے لے کر آج تک درجہ بدرجہ ایک دوسرے سے فروتر ہوتا چلا گیا ہے' اور ان کو سابقہ بھی ایسی پبلک سے پیش آیا ہے جس میں عربی زبان اور دینی علوم جاننے والے کا نام "تعلیم یافتہ" نہیں ہے اور "تعلیم یافتہ" اس شخص کا نام ہے جو دنیا میں اور چاہے سب کچھ جانتا ہو' مگر قرآن پر بہت مہربانی کرے تو کبھی کبھار اس کو ترجموں --- اور وہ بھی انگریزی ترجموں --- کی مدد سے پڑھ لے' حدیث اور فقہ کے متعلق حد سے حد کچھ سنی سنائی معلومات --- اور وہ بھی مستشرقین کی پہنچائی ہوئی معلومات --- پر اکتفا کرے' اسلامی روایات پر زیادہ سے زیادہ ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لے اور وہ بھی اس حیثیت سے کہ یہ کچھ بوسیدہ ہڈیوں کا مجموعہ ہے جسے ٹھکرا کر زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے' پھر اس ذخیرۂ علم دین کے بل بوتے پر وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ اسلام کے بارے میں آخری اور فیصلہ کن رائیں قائم کرنے کی وہ پوری اہلیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے حالات میں پرانے اعتزال کی بہ نسبت نئے اعتزال کا معیار جیسا کچھ گھٹیا ہو سکتا ہے ظاہر ہے یہاں علم کم اور بے علمی کی جسارت بہت زیادہ ہے!

اب جو ٹیکنیک اس فتنے کو فروغ دینے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے' اس کے اہم اجزاء یہ ہیں:

(۱) حدیث کو مشتبہ ثابت کرنے کے لیے مغربی مستشرقین نے جتنے حربے استعمال کیے ہیں ان پر ایمان لانا اور اپنی طرف سے حواشی کا اضافہ کر کے انہیں عام مسلمانوں میں پھیلا دینا تاکہ ناواقف لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے سوا کوئی چیز بھی امت کو قابل اعتماد ذرائع سے نہیں ملی ہے۔

(۲) احادیث کے مجموعوں کو عیب چینی کی غرض سے کھنگالنا---- ٹھیک اسی طرح جیسے آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں نے کبھی قرآن کو کھنگالا تھا---- اور ایسی چیزیں نکال نکال کر' بلکہ بنا بنا کر عوام کے سامنے پیش کرنا' جن سے یہ تاثر دیا جا سکے کہ حدیث کی کتابیں نہایت شرمناک یا مضحکہ خیز مواد سے لبریز ہیں' پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر یہ اپیل کرنا کہ اسلام کو رسوائی سے بچانا ہے تو اس سارے دفتر بے معنی کو غرق کر دو۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کو محض ایک ڈاکیے کا منصب قرار دینا جس کا کام بس اس قدر تھا کہ لوگوں کو قرآن پہنچا دے۔

(۴) صرف قرآن کو اسلامی قانون کا ماخذ قرار دینا اور سنت رسول کو اسلام کے قانونی نظام سے خارج کر دینا۔

(۵) امت کے تمام فقہاء' محدثین' مفسرین اور ائمہ لغت کو ساقط الاعتبار قرار دینا تاکہ مسلمان قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے ان کی طرف رجوع نہ کریں' بلکہ ان کے متعلق اس غلط فہمی میں پڑ جائیں کہ ان سب نے قرآن کی حقیقی تعلیمات پر پردے ڈالنے کے لیے ایک سازش کر رکھی تھی۔

(۶) خود ایک نئی لغت تصنیف کر کے قرآن کی تمام اصطلاحات کے معنی بدل ڈالنا اور آیات قرآنی کو وہ معانی پہنانا جن کی کوئی گنجائش دنیا کے کسی عربی دان

آدمی کو قرآن کے الفاظ میں نظر نہ آئے۔ (لطف یہ ہے کہ جو صاحب یہ کام کر رہے ہیں ان کے سامنے اگر قرآن کی چند آیتیں اعراب کے بغیر لکھ کر رکھ دی جائیں تو وہ انہیں صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اب خود عرب بھی عربی نہیں جانتے اس لیے اگر ان کے بیان کردہ معنوں کی گنجائش کسی عرب کو قرآن کے الفاظ میں نظر نہ آئے تو قصور اس عرب ہی کا ہے)۔

اس تخریبی کام کے ساتھ ساتھ ایک نئے اسلام کی تعبیر بھی ہو رہی ہے جس کے بنیادی اصول تعداد میں صرف تین ہیں' مگر دیکھیے کہ کیسے بے نظیر اصول ہیں:

اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ تمام شخصی املاک کو ختم کر کے ایک مرکزی حکومت کے تصرف میں دے دیا جائے اور وہی حکومت افراد کے درمیان تقسیم رزق کی مختار کل ہو۔ اس کا نام ہے "نظام ربوبیت" اور کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اصل مقصود یہی نظام قائم کرنا تھا۔ مگر پچھلے تیرہ سو سال میں کسی کو اسے سمجھنے کی توفیق میسر نہ ہوئی' صرف حضرت مارکس اور ان کے خلیفہ خاص حضرت اعجاز قرآن کے اس مقصد اصل کو پا سکے۔

اس کا دوسرا اصول یہ ہے کہ تمام پارٹیاں اور جماعتیں توڑ دی جائیں اور مسلمانوں کو قطعاً کوئی جماعت بنانے کی اجازت نہ دی جائے' تاکہ وہ معاشی حیثیت سے بے بس ہو جانے کے باوجود اگر مرکزی حکومت کے کسی فیصلے کی مزاحمت کرنا چاہیں تو غیر منظم ہونے کی وجہ سے نہ کر سکیں۔

اس کا تیسرا اصول یہ ہے کہ قرآن میں جس "اللہ اور رسول" پر ایمان لانے' اور جس کی اطاعت بجا لانے' اور جسے آخری سند تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد ہے "مرکز ملت"۔ یہ مرکز ملت چونکہ خود "اللہ اور رسول" ہے۔ اس لیے قرآن کو جو معنی وہ پہنائے وہی اس کے اصل معنی ہیں۔ اس کے حکم یا قانون کے متعلق یہ سوال سرے سے اٹھایا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ جو کچھ وہ حرام کرے وہ حرام اور جو کچھ وہ حلال کرے وہ حلال۔ اس کا فرمان شریعت

ہے اور عبادات سے لے کر معاملات تک جس چیز کی جو شکل بھی وہ تجویز کرے اس کا ماننا فرض بلکہ شرط اسلام ہے۔ جس طرح "بادشاہ" غلطی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح "مرکز ملت" بھی سبوح و قدوس ہے۔ لوگوں کا کام اس کے سامنے بس سر جھکا دینا ہے۔ "اللہ اور رسول" نہ تنقید کے ہدف بن سکتے ہیں' نہ ان کے خطاکار ہونے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے' اور نہ ان کو بدلا ہی جا سکتا ہے۔

اس نئے اسلام کے "نظام ربوبیت" پر ایمان لانے والے تو ابھی بہت کم ہیں لیکن اس کے باقی تمام تعمیری اور تخریبی اجزاء چند مخصوص حلقوں میں بڑے مقبول ہو رہے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کے لیے اس کا تصور "مرکز ملت" بہت اپیل کرنے والا ہے۔ اس لازمی شرط کے ساتھ کہ مرکز ملت وہ خود ہوں اور یہ خیال بھی انہیں بہت پسند آتا ہے کہ تمام ذرائع ان کے تصرف میں ہوں اور قوم پوری طرح غیر منظم ہو کر ان کی مٹھی میں آ جائے۔ ہمارے ججوں اور قانون پیشہ لوگوں کا ایک عنصر اسے اس لیے پسند کرتا ہے کہ انگریزی حکومت کے دور میں جس قانونی نظام کی تعلیم و تربیت انہوں نے پائی ہے' اس کے اصولوں اور بنیادی تصورات و نظریات اور جزئی و فروعی احکام سے اسلام کا معروف قانونی نظام قدم قدم پر ٹکراتا ہے۔ اور اس کے ماخذ تک بھی ان کی دسترس نہیں ہے' اس بنا پر وہ اس خیال کو بہت پسند کرتے ہیں کہ سنت اور فقہ کے جھنجھٹ سے انہیں نجات مل جائے اور صرف قرآن باقی رہ جائے جس کی تاویل کرنا جدید لغت کی مدد سے اب اور بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام مغربیت زدہ لوگوں کو یہ مسلک اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ کیونکہ اسلام سے نکل کر مسلمان رہنے کا اس سے زیادہ اچھا نسخہ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ آخر اس سے زیادہ مزے کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ مغرب میں حلال اور "ملا کے اسلام" میں آج تک حرام ہے وہ حلال بھی ہو جائے اور قرآن کی سند ان حلال کرنے والوں کے ہاتھ میں ہو۔

میں پچھلے پچیس چھبیس سال میں اس فتنے کی تردید کے لیے بہت سے مضامین

لکھ چکا ہوں جو میری متعدد کتابوں میں درج ہیں۔ اس وقت جن مضامین کا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے' وہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں وہ پوری مراسلت یکجا درج کر دی گئی ہے جو سنت کی آئینی حیثیت کے بارے میں میرے اور ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے درمیان ہوئی تھی۔ دوسرے حصے میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ۱۴ر جولائی ۱۹۶۰ء کو مقدمہ رشیدہ بیگم بنام شہاب دین وغیرہ میں صادر فرمایا ہے' اور میں نے اس پر مفصل تنقید کی ہے۔ ان دونوں حصوں میں ناظرین ایک طرف منکرین سنت کے تمام مسائل اور دلائل ان کی اپنی زبان میں ملاحظہ فرما لیں اور دوسری طرف انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ دین کے نظام میں سنت کی اصل حیثیت کیا ہے۔ اس کے بعد یہ رائے قائم کرنا ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ وہ کس مسلک کو قبول کرتا ہے۔

جن حضرات تک یہ مجموعہ مضامین پہنچے ان سے میں ایک خاص گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بحث دین کے ایک نہایت اہم بنیادی مسئلے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس میں کسی ایک پہلو کو ترک اور دوسرے کو اختیار کرنے کے نتائج بڑے دور رس ہیں۔ بدقسمتی سے دین کی اساس کے متعلق یہ بحث ہمارے ملک میں نہ صرف چھڑ چکی ہے بلکہ ایک نازک صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمارے ارباب اقتدار کا ایک معتدبہ عنصر انکار سنت کے مسلک سے متاثر ہو رہا ہے۔ ہماری اعلیٰ عدالتوں کے جج اس کا اثر قبول کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ہائی کورٹ سے ایک فیصلہ کلیتہ انکار سنت کی بنیاد پر صادر ہو چکا ہے جو آگے نہ معلوم اور کن کن مقدمات میں نظیر کا کام دے۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں' اور خصوصاً سرکاری دفتروں میں یہ تحریک منظم طریقے سے چل رہی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جن حضرات تک بھی یہ مجموعہ پہنچے وہ نہ صرف خود گہری نگاہ سے اس کا مطالعہ فرمائیں' بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ سنت کے قائل ہوں یا منکر۔ رائے جو شخص جیسی بھی چاہے' قائم کرے' مگر کسی پڑھے لکھے

آدمی کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ محض یک رخے مطالعہ پر اپنا ایک ذہن بنا لے اور دوسرا رخ دیکھنے سے انکار کر دے۔ اس مجموعہ میں چونکہ دونوں رخ پوری وضاحت کے ساتھ آ گئے ہیں اس لیے امید ہے کہ یہ قائلین سنت اور منکرین سنت، دونوں کو ایک متوازن رائے قائم کرنے میں مدد دے گا۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

لاہور، ۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء

سنت کی آئینی حیثیت

ایک اہم مراسلت

ذیل میں وہ مراسلت درج کی جا رہی ہے جو "بزم طلوع اسلام" کے ایک نمایاں فرد جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مصنف کے درمیان سنت کو اسلام کے آئین کی بنیاد ماننے کے مسئلے پر ہوئی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کا پہلا خط

مخدوم و محترم مولانا! دام ظلکم

السلام علیکم۔ دستوری تدوین کے اس فیصلہ کن مرحلے پر ہر سچے مسلمان کی دینی امنگوں کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کا آئین اسلام کی مستقل اقدار کی اساس پر ترتیب و تکمیل پائے۔ اس سلسلے میں آئین کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں اور آپ اور دیگر حضرات کرام کا یہ متفقہ مطالبہ بھی سامنے آیا ہے کہ آئین پاکستان کی بنیاد "کتاب و سنت" پر ہونی چاہئے۔ مجھے نہ تو "سنت" کی حقیقی اہمیت سے مجال انکار ہے اور نہ اس کی اس اہمیت کو ختم کرنا مقصود لیکن جب اسلامی آئین کی اساس کے طور پر سنت کا ذکر کیا جاتا ہے تو ایک اشکال ذہن میں لازماً پیدا ہوتا ہے اور اس سے جو سوال ابھرتے ہیں، میں انہیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اولین فرصت میں اس اشکال کا حل تحریر فرمائیں گے۔ سوالات حسب ذیل ہیں:

(۱) آپ کے نزدیک "سنت" سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح "کتاب" سے مراد قرآن مجید ہے اسی طرح سنت (یعنی سنت رسول اللہؐ) سے کیا مراد ہے؟

(۲) کیا (قرآن کی طرح) ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنت رسول اللہؐ مرتب شکل میں موجود ہو؟ یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و

مانع کتاب ہے؟

(۳) کیا سنت رسول اللہ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ ہے اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآن کا متن؟

(۴) اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنت رسول اللہؐ ہے یا نہیں؟

میں آپ کو یقین دلا دوں کہ جہاں تک اسلامی آئین کی ضرورت کا تعلق ہے میں قلب و نظر کی پوری ہم آہنگی سے اسے ایک مسلمان کی زندگی کا نصب العین قرار دیتا ہوں۔ میری ان مخلصانہ گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی آئین کا مطالبہ کرتے ہوئے اسلام پسند ذہنوں میں اس کا ایک واضح متفق علیہ اور ممکن العمل تصور موجود ہو' تاکہ ملک کا لادینی ذہن جو پوری شدت سے اسلامی آئین کے خلاف مصروف کار ہے' اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام پسند عناصر میں انتشار کی صورت پیدا نہ کر سکے۔ چونکہ آئین کے سلسلے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے۔ اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ والسلام

نیاز آگیں عبدالودود

جواب

مکرمی' السلام علیکم و رحمتہ اللہ

عنایت نامہ مورخہ ۱۸/ مئی ۱۹۶۰ء وصول ہوا۔ آپ نے جو سوالات کیے ہیں۔ وہ آج پہلی مرتبہ آپ نے پیش نہیں کیے ہیں۔ اس سے پہلے یہی سوالات دوسرے گوشوں سے آ چکے ہیں اور ان کا جواب بھی واضح طور پر میں دے چکا ہوں۔ ایک ہی طرح کے سوالات کا مختلف گوشوں سے بار بار دہرایا جانا اور پہلے کے دیے ہوئے جوابات کو ہمیشہ نظرانداز کر دینا کوئی صحیح بات نہیں ہے۔ اگر بالفرض آپ کے علم

میں میرے وہ جوابات نہیں ہیں جو میں اب سے بہت پہلے دے چکا ہوں۔ تو میں اب آپ کو ان کا حوالہ دیئے دیتا ہوں (ملاحظہ ہو' ترجمان القرآن' جنوری ۵۸ء' صفحہ ۲۰۹ تا ۲۲۰' دسمبر ۵۸ء' صفحہ ۱۴۰ تا ۱۷۰)۔ آپ انہیں پڑھ کر مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب ان میں نہیں ہے۔ اور جن سوالات کا جواب موجود ہے' اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے۔

اگر آپ اپنے اس عنایت نامے کے ساتھ میرے اس جواب کو شائع کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہوں تو براہ کرم میرے مذکورۂ بالا دونوں مضامین بھی بجنسہ شائع فرما دیں۔ کیونکہ دراصل وہی میری طرف سے آپ کے ان سوالات کا جواب ہیں۔ اس لیے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے آپ کو جواب دینے سے پہلو تہی کی ہے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خط

مولانائے محترم! زید مجدکم

السلام علیکم۔ گرامی نامہ ملا۔ جس کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ مجھے اس کا علم ہے کہ اس قسم کے سوالات اس سے پہلے بھی کئی گوشوں سے کیے گئے ہیں۔ لیکن مجھے خاص طور پر استفسار کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میری نظر سے ان سوالات کے ایسے جوابات آج تک نہیں گزرے جو متعین اور واضح ہوں۔

آپ نے اپنے جن مضامین کی نشاندہی فرمائی ہے' میں نے انہیں دیکھا ہے لیکن مجھے بڑے افسوس سے یہ عرض کرنے دیجئے کہ ان سے بھی میرے سوالات کا متعین جواب نہیں مل سکا۔ بلکہ ان سے میری الجھن بڑھ گئی ہے۔

اس لیے کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو آپ کی دوسری تحریروں سے مختلف ہیں۔ بہرحال چونکہ میرا مقصد مناظرہ بازی نہیں (اور نہ آپ کے احترام کے پیش نظر میں ایسی جرات کر سکتا ہوں) بلکہ محض بات کا سمجھنا ہے اس لیے جو کچھ میں

آپ کے مضامین سے سمجھ سکا ہوں' اسے نیچے لکھتا ہوں۔ اگر میں نے مفہوم کو صحیح سمجھا ہے تو توثیق فرما دیجئے اور اگر غلط سمجھا ہے تو براہ کرم اس کی تصریح کر دیجئے۔ اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

(۱) آپ نے فرمایا ہے کہ نبی اکرم (صلعم) نے ۲۳ برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن مجید کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنت رسول اللہؐ کہتے ہیں۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں:

(الف) رسول اللہ (صلعم) نے اس ۲۳ سالہ زندگی میں جو باتیں اپنی شخصی حیثیت سے ارشاد فرمائیں یا عملاً کیں وہ سنت میں داخل نہیں۔

(ب) سنت' قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی۔ اور نہ ہی سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔

(۲) آپ نے فرمایا ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں سنت رسول اللہؐ بہ تمام و کمال درج ہو اور جس کا متن قرآن کے متن کی طرح تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(۳) آپ نے فرمایا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے صحیح احادیث کو الگ کیا جائے گا اس کے لیے روایات کو جانچنے کے جو اصول پہلے سے مقرر ہیں وہ حرف آخر نہیں۔ اصول روایات کے علاوہ درایت سے بھی کام لیا جائے گا اور درایت انہی لوگوں کی معتبر ہو گی جن میں علوم اسلامی کے مطالعہ سے ایک تجربہ کار جوہری کی بصیرت پیدا ہو چکی ہو۔

(۴) احادیث کے اس طرح پرکھنے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ یہ اسی طرح کلام رسولؐ ہیں جس طرح قرآن کی آیات' اللہ کا کلام۔

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

نیاز آگیں

عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی، السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۴ر مئی ۶۰ء ڈاک سے مل چکا تھا۔ اس کے بعد آپ نے دوبارہ ۲۸ر مئی کو دستی بھی اس کی ایک نقل مجھے ارسال فرمادی لیکن میں مسلسل مصروفیت کے باعث اب تک جواب نہ دے سکا جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

مجھے مسرت ہے کہ آپ نے اپنے اس عنایت نامہ میں یہ یقین دلایا ہے کہ آپ کا مقصد اس مراسلت سے کوئی مناظرہ بازی نہیں ہے بلکہ آپ بات سمجھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ جیسے شخص سے اسی چیز کا متوقع بھی تھا۔ لیکن جو طریقہ آپ نے اپنی مراسلت میں بات سمجھنے کے لیے اختیار فرمایا ہے وہ اس یقین دہانی کے ساتھ کچھ مطابقت رکھتا ہوا کم از کم مجھے تو محسوس نہیں ہوتا۔ آپ ذرا اپنا ۲۱ مئی کا خط نکال کر ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں آپ نے ۴ متعین سوالات میرے سامنے پیش کرکے ان کا جواب مانگا تھا۔ میں نے اسی تاریخ کو اس خط کے جواب میں آپ کو لکھا کہ آپ جنوری ۵۸ء اور دسمبر ۵۸ء کے ترجمان القرآن میں میرے فلاں فلاں مضامین ملاحظہ فرماکر "مجھے تفصیل کے ساتھ بتائیں کہ آپ کے سوالات میں سے کس سوال کا جواب ان میں نہیں ہے اور جن سوالات کا جواب موجود ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے"۔ لیکن آپ نے ان مضامین کو ملاحظہ فرماکر اپنے ابتدائی سوالات کی روشنی میں ان پر کوئی کلام کرنے کے بجائے کچھ اور سوالات ان پر قائم کر دیئے اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں ان کا جواب دوں۔ کیا واقعی یہی کسی بات کو سمجھنے کا طریقہ ہے کہ ایک بحث کو طے کرنے سے پہلے دوسری بحث چھیڑ دی جائے اور بلانہایت اسی طرح بات میں سے بات نکالنے کا سلسلہ چلتا رہے؟

آپ کے نئے سوالات پر گفتگو کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ابتدائی سوالات کی طرف پلٹیں اور خود دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک کا میرے

ان مضامین میں کیا جواب آپ کو ملا تھا اور آپ نے اس سے کس طرح گریز کیا ہے۔

سنت کیا چیز ہے؟

آپ نے چار سوالات اس بنا پر اٹھائے تھے کہ ہم نے آئین کمیشن کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے "اسلامی آئین کی اساس کے طور پر سنت کا ذکر کیا ہے"۔ دوسرے الفاظ میں آپ کے یہ سوالات سنت کی قانونی حیثیت سے متعلق تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا پہلا سوال یہ تھا:

> "آپ کے نزدیک سنت سے کیا مراد ہے؟ یعنی جس طرح "کتاب" سے مراد قرآن ہے اسی طرح سنت (یعنی سنت رسول اللہ) سے کیا مراد ہے؟"

اس کے جو جوابات میرے مذکورۂ بالا مضامین میں آپ کے سامنے آئے وہ یہ ہیں:

> یہی محمدی تعلیم وہ بالاتر قانون (Supreme Law) ہے جو حاکم اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ قانون محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو دو شکلوں میں ملا ہے۔ ایک قرآن' جو لفظاً بلفظاً خداوند عالم کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہے۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ' یا آپ کی سنت' جو قرآن کے منشا کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے سوا ان کا کوئی کام نہ ہوتا۔ وہ اس کے مقرر کیے ہوئے رہنما' حاکم اور معلم بھی تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے قول اور عمل سے قانون الٰہی کی تشریح کریں' اس کا صحیح منشا سمجھائیں' اس کے منشا کے مطابق افراد کی تربیت کریں' پھر تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دے کر معاشرے کی اصلاح کے لیے جدوجہد کریں' پھر اصلاح شدہ

معاشرے کو ایک صالح و مصلح ریاست کی صورت دے کر یہ دکھا دیں کہ اسلام کے اصولوں پر ایک مکمل تہذیب کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ کا یہ پورا کام' جو ۲۳ سال کی پیغمبرانہ زندگی میں آپؐ نے انجام دیا' وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے اور اسی قانون برتر کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے"۔ (ترجمان القرآن' جنوری ۵۸ء' صفحہ ۲۱۰۔۲۱۱)

"یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن پہنچا دینے پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ ایک ہمہ گیر تحریک کی رہنمائی بھی کی تھی جس کے نتیجے میں ایک مسلم سوسائٹی پیدا ہوئی' ایک نیا نظام تہذیب و تمدن وجود میں آیا اور ایک ریاست قائم ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پہنچانے کے سوا یہ دوسرے کام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے یہ آخر کس حیثیت سے تھے؟ آیا یہ نبی کی حیثیت سے تھے جس میں آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن؟ یا آپ کی پیغمبرانہ حیثیت قرآن سنا دینے کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد آپ عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان رہ جاتے تھے۔ جس کا قول و فعل اپنے اندر بجائے خود کوئی قانونی سند و حجت نہیں رکھتا؟ پہلی بات تسلیم کی جائے تو سنت کو قرآن کے ساتھ قانونی سند و حجت ماننے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ البتہ دوسری صورت میں اسے قانون قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف نامہ بر نہیں تھے بلکہ خدا کی طرف سے مقرر کیے ہوئے رہبر' حاکم اور معلم بھی تھے جن کی پیروی و اطاعت مسلمانوں پر

لازم تھی اور جن کی زندگی کو تمام اہل ایمان کے لیے نمونہ قرار دیا گیا تھا' جہاں تک عقل کا تعلق ہے وہ یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ ایک نبی صرف خدا کا کلام پڑھ کر سنا دینے کی حد تک تو نبی ہو اور اس کے بعد وہ محض ایک عام آدمی رہ جائے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ آغاز اسلام سے آج تک بالاتفاق ہر زمانے میں اور تمام دنیا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نمونہ واجب الاتباع اور ان کے امر و نہی کو واجب الاطاعت مانتے رہے ہیں۔ حتی کہ کوئی غیر مسلم عالم بھی اس امر واقعی سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آنحضرتؐ کی یہی حیثیت مانی ہے اور اسی بنا پر اسلام کے قانونی نظام میں سنت کو قرآن کے ساتھ دوسرا ماخذ قانون تسلیم کیا گیا ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ کوئی شخص سنت کی اس قانونی حیثیت کو کیسے چیلنج کر سکتا ہے جب تک وہ صاف صاف یہ نہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف تلاوت قرآن کی حد تک نبی تھے اور یہ کام کر دینے کے ساتھ ہی ان کی حیثیت نبوی ختم ہو جاتی تھی۔ پھر اگر وہ ایسا دعویٰ کرے بھی تو اسے بتانا ہو گا کہ یہ مرتبہ وہ آنحضرتؐ کو بطور خود دے رہا ہے یا قرآن نے حضورؐ کو یہی مرتبہ دیا ہے؟ پہلی صورت میں اس کے قول کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوسری صورت میں اسے قرآن سے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہو گا"۔ (ترجمان القرآن' جنوری ۵۸ء' صفحہ ۲۱۶-۲۱۷)

اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اپنے اس سوال کا جواب ملا یا نہیں کہ "سنت سے مراد کیا ہے؟" اور آپ کو یہ معلوم ہوا یا نہیں کہ اسلامی آئین کی اساس کے طور پر جس سنت کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کیا چیز ہے؟ دوسرے سوالات چھیڑنے سے پہلے آپ کو یہ بات صاف کرنی چاہئے تھی کہ آیا آپ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھ کر سنا دینے کے سوا دنیا میں اور کوئی کام کیا ہے یا نہیں؟

اگر کیا ہے تو وہ کس حیثیت میں تھا؟ اگر آپ کی رائے میں یہ کام کر دینے کے بعد آنحضرتؐ صرف ایک مسلمان تھے عام مسلمانوں کی طرح' اور ان زائد از تلاوت قرآن اقوال و افعال میں آنحضرتؐ کی حیثیت ایک نبی کی نہ تھی۔ تو صاف صاف یہ بات کہئے اور یہ بھی بتایئے کہ آپ کی اس رائے کا ماخذ کیا ہے؟ یہ آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا قرآن سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟ اور اگر آپ یہ بات مانتے ہیں کہ خدا کے مقرر کردہ ہادی' حاکم' قاضی' معلم' مربی کی حیثیت سے آنحضورؐ نے ایک مسلم معاشرہ تیار کرنے اور ایک ریاست کا نظام بنا کر اور چلا کر دکھانے کا جو کارنامہ انجام دیا اس میں آپ کی حیثیت ایک نبی کی تھی۔ یہ تو وہی سنت ہے یا نہیں جسے اسلام میں آئین کی اساس کا مرتبہ حاصل ہونا چاہئے؟ یہ بحث بعد کی ہے کہ اس سنت کا اطلاق کن چیزوں پر ہوتا ہے اور کن پر نہیں ہوتا۔ پہلے تو آپ یہ بات صاف کریں کہ قرآن کے علاوہ سنت رسولؐ بجائے خود کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اور اس کو آپ قرآن کے ساتھ ماخذ قانون مانتے ہیں یا نہیں؟ اور نہیں مانتے تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یہ بنیادی بات جب تک صاف نہ ہو لے' ان ضمنی سوالات پر جو آپ نے اپنے دوسرے عنایت نامے میں چھیڑے ہیں' بحث کرنے کا آخر فائدہ کیا ہے؟

سنت کس شکل میں موجود ہے؟

آپ کا دوسرا سوال یہ تھا:

> "کیا قرآن کی طرح ہمارے ہاں ایسی کوئی کتاب موجود ہے جس میں سنت رسولؐ اللہ مرتب شکل میں موجود ہو' یعنی قرآن کی طرح اس کی کوئی جامع و مانع کتاب ہے؟"

اس سوال کا جو جواب میرے محولہ بالا مضامین میں موجود تھا' اور اگر آپ نے ان کو بغور پڑھا ہے تو آپ کے سامنے بھی وہ آیا ہوگا' اسے میں پھر یہاں نقل کیے دیتا ہوں تاکہ جب نہیں تو اب آپ اسے ملاحظہ فرمالیں:

"سنت کو بجائے خود ماخذ قانون تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ اس کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے۔ میں اس کے جواب میں عرض کروں گا کہ آج پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہم کو اس سوال سے سابقہ پیش نہیں آگیا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل جو نبوت مبعوث ہوئی تھی اس نے کیا سنت چھوڑی تھی۔ دو تاریخی حقیقتیں ناقابل انکار ہیں:

ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر جو معاشرہ اسلام کے آغاز میں پہلے دن قائم ہوا تھا وہ اس وقت سے آج تک مسلسل زندہ ہے' اس کی زندگی میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا ہے اور اس کے تمام ادارے اس ساری مدت میں پیہم کام کرتے رہے ہیں۔ آج تمام دنیا کے مسلمانوں میں عقائد اور طرز فکر' اخلاق اور اقدار (Values)' عبادات اور معاملات' نظریہ حیات اور طریق حیات کے اعتبار سے جو گہری مماثلت پائی جاتی ہے' جس میں اختلاف کی بہ نسبت ہم آہنگی کا عنصر بہت زیادہ موجود ہے' جو ان کو تمام روئے زمین پر منتشر ہونے کے باوجود ایک امت بنائے رکھنے کی سب سے بڑی بنیادی وجہ ہے' یہی امر اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اس معاشرے کو کسی ایک ہی سنت پر قائم کیا گیا تھا اور وہ سنت ان طویل صدیوں کے دوران میں مسلسل جاری ہے۔ یہ کوئی گم شدہ چیز نہیں ہے جسے تلاش کرنے کے لیے ہمیں اندھیرے میں ٹٹولنا پڑ رہا ہو۔

دوسری تاریخی حقیقت' جو اتنی ہی روشن ہے' یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعد سے ہر زمانے میں مسلمان یہ معلوم کرنے کی پیہم کوشش کرتے رہے ہیں کہ سنت ثابتہ کیا ہے اور کیا نئی چیز ان کے نظام حیات میں کسی جعلی طریقہ سے داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ سنت ان کے لیے قانون کی حیثیت رکھتی تھی' اسی پر ان کی عدالتوں میں فیصلے ہوئے تھے

اور ان کے گھروں سے لے کر حکومتوں تک کے معاملات چلتے تھے' اس لیے وہ اس کی تحقیق میں بے پروا اور لاابالی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس تحقیق کے ذرائع بھی اور اس کے نتائج بھی ہم کو اسلام کی پہلی خلافت کے زمانہ سے لے کر آج تک نسلاً بعد نسل میراث میں ملے ہیں اور بلاانقطاع ہر نسل کا کیا ہوا کام محفوظ ہے۔

ان دو حقیقتوں کو اگر کوئی اچھی طرح سمجھ لے اور سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع کا باقاعدہ علمی مطالعہ کرے تو اسے کبھی یہ شبہ لاحق نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی لاینحل معما ہے جس سے وہ آج یکایک دوچار ہو گیا ہے۔ (ترجمان القرآن' جنوری ۵۸ء' صفحہ ۲۱۸)

اسی مسئلے پر دوبارہ روشنی ڈالتے ہوئے میں نے اپنے دوسرے مضمون میں' جس کا حوالہ بھی میں پہلے آپ کو دے چکا ہوں' یہ لکھا تھا کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد نبوت میں مسلمانوں کے لیے محض ایک پیرو مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد' رہنما' حاکم' قاضی' شارع' مربی' معلم سب کچھ تھے اور عقائد و تصورات سے لے کر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم سوسائٹی کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتائے' سکھائے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لیے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ نے نماز' روزے اور مناسک حج کی جو تعلیم دی ہو' بس وہی مسلمانوں میں رواج پا گئی ہو اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں۔ بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہوئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں' اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپؐ نے مقرر کیے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا' لین دین کے جو ضابطے آپ نے مقرر کیے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا' مقدمات کے جو فیصلے آپؐ نے

کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے' لڑائیوں میں جو معاملات آپ' نے دشمنوں کے ساتھ' اور فتح پاکر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کیے وہی مسلم مملکت کے ضابطے بن گئے' اور فی الجملہ اسلامی معاشرہ اور اس کا نظام حیات اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا جو آپ نے خود رائج کیں یا جنہیں پہلے کے مروج طریقوں میں سے بعض کو برقرار رکھ کر آپ' نے سنت اسلام کا جز بنا لیا۔

یہ وہ معلوم و متعارف سنتیں تھیں جن پر مسجد سے لے کر خاندان' منڈی' عدالت' ایوان حکومت اور بین الاقوامی سیاست تک مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے تمام ادارات نے حضور' کی زندگی ہی میں عمل درآمد شروع کر دیا تھا اور بعد میں خلفائے راشدین کے عہد سے لے کر دور حاضر تک ہمارے اجتماعی ادارات کے تسلسل میں ایک دن کا انقطاع بھی واقع نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اگر کوئی انقطاع رونما ہوا ہے تو صرف حکومت و عدالت اور پبلک لا کے ادارات عملاً درہم برہم ہو جانے سے ہوا ہے..... ان (سنتوں) کے معاملے میں ایک طرف حدیث کی مستند روایات اور دوسری طرف امت کا متواتر عمل' دونوں ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں"۔ (ترجمان القرآن' دسمبر ۵۸ء' صفحہ ۱۶۷)

پھر اسی سلسلے میں آگے چل کر مزید تشریح کرتے ہوئے میں نے یہ بھی لکھا تھا:

"ان معلوم و متعارف سنتوں کے علاوہ ایک قسم سنتوں کی وہ تھی جنہیں حضور' کی زندگی میں شہرت اور رواج عام حاصل نہ ہوا تھا' جو مختلف اوقات میں حضور' کے کسی فیصلے' ارشاد' امرونہی' تقریر[1] و اجازت'

---

[1] شرعی اصطلاح میں تقریر سے مراد یہ ہے کہ حضور' نے اپنے سامنے کوئی کام ہوتے دیکھا ہو' یا کوئی طریقہ رائج پایا ہو اور اسے منع نہ کیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں تقریر کے معنی ہیں کسی چیز کو برقرار رکھنا۔

یا عمل کو دیکھ کر یا سن کر خاص خاص اشخاص کے علم میں آئی تھی اور عام لوگ ان سے واقف نہ ہو سکے تھے۔

ان سنتوں کا علم جو متفرق افراد کے پاس بکھرا ہوا تھا' امت نے اس کو جمع کرنے کا سلسلہ حضورؐ کی وفات کے بعد فوراً ہی شروع کر دیا۔ کیونکہ خلفا' حکام' قاضی' مفتی اور عوام سب اپنے اپنے دائرہ کار میں پیش آنے والے مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ یا عمل اپنی رائے اور استنباط کی بنا پر کرنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ہدایت تو موجود نہیں ہے۔ اسی ضرورت کی خاطر ہر اس شخص کی تلاش شروع ہوئی جس کے پاس سنت کا کوئی علم تھا' اور ہر اس شخص نے جس کے پاس ایسا کوئی علم تھا' خود بھی اس کو دوسروں تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا۔ یہی روایت حدیث کا نقطہ آغاز ہے اور ۱۱ھ سے تیسری چوتھی صدی تک ان متفرق سنتوں کو فراہم کرنے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ موضوعات گھڑنے والوں نے ان کے اندر آمیزش کرنے کی جتنی کوششیں بھی کیں وہ قریب قریب سب ناکام بنا دی گئیں۔ کیونکہ جن سنتوں سے کوئی حق ثابت یا ساقط ہوتا تھا' جن کی بنا پر کوئی چیز حرام یا حلال ہوتی تھی' جس سے کوئی شخص سزا پا سکتا تھا یا کوئی ملزم بری ہو سکتا تھا' غرض یہ کہ جن سنتوں پر احکام اور قوانین کا مدار تھا' ان کے بارے میں حکومتیں اور عدالتیں اور افتاء کی مسندیں اتنی بے پرواہ نہیں ہو سکتی تھیں کہ یونہی اٹھ کر کوئی شخص قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیتا۔ اسی لیے جو سنتیں احکام سے متعلق تھیں ان کے بارے میں پوری چھان بین کی گئی' سخت تنقید کی چھلنیوں سے ان کو چھانا گیا۔ روایت کے اصولوں پر بھی انہیں پرکھا گیا اور درایت کے اصولوں پر بھی' اور وہ سارا مواد جمع کر دیا گیا' جس کی بنا پر کوئی روایت مانی گئی

ہے یا رد کر دی گئی ہے' تاکہ بعد میں بھی ہر شخص اس کے رد و قبول کے متعلق تحقیق رائے قائم کر سکے"۔ (ترجمان القرآن' دسمبر ۵۸ء' صفحہ ۱۶۸-۱۶۹)

اس جواب کو بغور ملاحظہ فرما لینے کے بعد اب آپ فرمائیں کہ آپ کو اپنے دوسرے سوال کا جواب ملا یا نہیں۔ ممکن ہے آپ اس پر یہ کہیں کہ تم نے "قرآن کی طرح ایک جامع و مانع کتاب" کا نام تو لیا ہی نہیں جس میں "سنت رسول اللہ مرتب شکل میں موجود ہو"۔ مگر میں عرض کروں گا کہ میرے اس جواب پر یہ اعتراض ایک کج بحثی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ آپ ایک پڑھے لکھے ذی ہوش آدمی ہیں۔ کیا آپ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ ایک معاشرے اور ریاست کا پورا نظام صرف ایک مدون کتاب آئین (Code) ہی پر نہیں چلا کرتا ہے' بلکہ اس کتاب کے ساتھ رواجات (Conventions)' روایات (Traditions)' نظائر (Precedents)' عدالتی فیصلوں' انتظامی احکام' اخلاقی روایات وغیرہ کا ایک وسیع سلسلہ بھی ہوتا ہے جو کتاب آئین پر عملاً ایک نظام زندگی چلنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ چیز ایک قوم کے نظام حیات کی جان ہوتی ہے جس سے الگ کر کے محض اس کی کتاب آئین نہ تو اس کے نظام حیات کی پوری تصویر ہی پیش کرتی ہے' نہ وہ ٹھیک طور پر سمجھی ہی جا سکتی ہے اور یہ چیز دنیا میں کہیں بھی کسی "ایک جامع و مانع کتاب" کی شکل میں مرتب نہیں ہوتی' نہ ہو سکتی ہے' نہ ایسی کسی "ایک کتاب" کا فقدان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس قوم کے پاس اس کی کتاب آئین کے سوا کوئی ضابطہ و قانون موجود نہیں ہے۔ آپ انگلستان' امریکہ' یا دنیا کی کسی اور قوم کے سامنے یہ بات ذرا کہہ کر دیکھیں کہ تمہارے پاس تمہارے مدون قانون(Conified Law) کے سوا جو کچھ بھی ہے سب ساقط الاعتبار ہے' اور تمہاری تمام روایات وغیرہ کو یا تو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب ہونا چاہئے' ورنہ انہیں آئینی حیثیت سے بالکل ناقابل لحاظ قرار دیا جانا چاہئے' پھر آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا یہ

ارشاد کتنے وزن کا مستحق قرار پاتا ہے۔

کسی کا یہ کہنا کہ عہد نبویؐ کے رواجات' روایات' نظائر' فیصلوں' احکام اور ہدایات کا پورا ریکارڈ ہم کو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب شدہ ملنا چاہیے تھا' درحقیقت ایک خالص غیر عملی طرز فکر ہے اور وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو خیالی دنیا میں رہتا ہو۔ آپ قدیم زمانے کے عرب کی حالت کو چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے آج اس زمانے کی حالت کو لے لیجیے جب کہ احوال و وقائع کو ریکارڈ کرنے کے ذرائع بے حد ترقی کر چکے ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ اس زمانے میں کوئی لیڈر ایسا موجود ہے جو ۲۳ سال تک شب و روز کی معروف زندگی میں ایک عظیم الشان تحریک برپا کرتا ہے۔ ہزاروں افراد کو اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کرتا ہے۔ ان سے کام لے کر ایک پورے ملک کی فکری' اخلاقی' تمدنی اور معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اپنی قیادت و رہنمائی میں ایک نیا معاشرہ اور ایک نئی ریاست وجود میں لاتا ہے۔ اس معاشرے میں اس کی ذات ہر وقت ایک مستقل نمونہ ہدایت بنی رہتی ہے۔ ہر حالت میں لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر یہ سبق لیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ ہر طرح کے لوگ شب و روز اس سے ملتے رہتے ہیں اور وہ ان کو عقائد و افکار' سیرت و اخلاق' عبادات و معاملات' غرض ہر شعبہ زندگی کے متعلق اصولی ہدایات بھی دیتا ہے اور جزئی احکام بھی۔ پھر اپنی قائم کردہ ریاست کا فرمانروا' قاضی' شارع' مدبر اور سپہ سالار بھی تنہا وہی ہے اور دس سال تک اس مملکت کے تمام شعبوں کو وہ خود اپنے اصولوں پر قائم کرتا اور اپنی رہنمائی میں چلاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج اس زمانے میں بھی یہ سارا کام کسی ایک ملک میں ہو تو اس کا ریکارڈ "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے؟ کیا ہر وقت اس لیڈر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لگا رہ سکتا ہے؟ کیا ہر آن فلم کی مشین اس کی شبانہ روز نقل و حرکت ثبت کرنے میں لگی رہ سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ ٹھپا جو اس لیڈر نے ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی پر پورے معاشرے کی

جینات اور پوری ریاست کے نظام پر چھوڑا ہے' سرے سے کوئی شہادت ہی نہیں ہے۔ جس کا اعتبار کیا جا سکے؟ کیا آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ اس لیڈر کی تقریریں سننے والے' اس کی زندگی دیکھنے والے' اس سے ربط و تعلق رکھنے والے بے شمار اشخاص کی رپورٹیں سب کی سب ناقابل اعتماد ہیں کیونکہ خود اس لیڈر کے سامنے وہ "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب نہیں کی گئیں اور لیڈر نے ان پر اپنے ہاتھ سے مہر تصدیق ثبت نہیں کی؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ اس کے عدالتی فیصلے' اس کے انتظامی احکام' اس کے قانونی فرامین' اس کے صلح و جنگ کے معاملات کے متعلق جتنا مواد بھی بہت سی مختلف صورتوں میں موجود ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے' کیونکہ وہ "ایک جامع و مانع کتاب" کی شکل میں تو ہے ہی نہیں؟

ان امور پر اگر بحث کی نیت سے نہیں بلکہ بات سمجھنے کی نیت سے غور کیا جائے تو ایک ذی فہم آدمی خود محسوس کر لے گا کہ یہ "ایک کتاب" کا مطالبہ کتنا مہمل ہے۔ اس طرح کی باتیں ایک کمرے میں بیٹھ کر چند نیم خواندہ اور فریب خوردہ عقیدت مندوں کے سامنے کر لی جائیں تو مضائقہ نہیں' مگر کھلے میدان میں پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے ان کو چیلنج کے انداز میں پیش کرنا بڑی جسارت ہے۔

کیا سنت متفق علیہ ہے؟ اور اس کی تحقیق کا ذریعہ کیا ہے؟

آپ کا تیسرا سوال یہ تھا: "کیا سنت رسول اللہؐ کی اس کتاب کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک اسی طرح متفق علیہ اور شک و تنقید سے بالاتر ہے جس طرح قرآن کا متن؟"

اور چوتھا سوال یہ کہ:

> "اگر کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تو پھر جس طرح یہ بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فلاں فقرہ قرآن مجید کی آیت ہے اسی طرح یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں بات سنت رسول اللہؐ ہے یا نہیں؟

ان سوالات کے جواب میں اپنے جن مضامین کی طرف میں نے آپ کو توجہ

دلائی تھی ان کو اگر آپ نے پڑھا ہے تو ان کے اندر یہ عبارتیں ضرور آپ کی نظر سے گزری ہوں گی:

"بلاشبہ سنت کی تحقیق اور اس کے تعین میں بہت سے اختلافات ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسے ہی اختلافات قرآن کے بہت سے احکام و اشارات کے معنی متعین کرنے میں بھی ہوئے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ایسے اختلافات اگر قرآن کو چھوڑ دینے کے لیے دلیل نہیں بن سکتے تو سنت کو چھوڑ دینے کے لیے انہیں کیسے دلیل بنایا جا سکتا ہے؟ یہ اصول پہلے بھی مانا گیا ہے اور آج بھی اسے ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو شخص بھی کسی چیز کے حکم قرآن یا حکم سنت ہونے کا دعویٰ کرے وہ اپنے قول کی دلیل دے۔ اس کا قول اگر وزنی ہو گا تو امت کے اہل علم سے، یا کم از کم ان کے کسی بڑے گروہ سے اپنا سکہ منوا لے گا اور جو بات دلیل کے اعتبار سے بے وزن ہو گی وہ بہرحال نہ چل سکے گی۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہب فقہی پر مجتمع ہوئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکام قرآنی کی کسی تفسیر و تعبیر اور سنن ثابتہ کے کسی مجموعہ پر اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قائم کیا ہے۔ (ترجمان القرآن، جنوری ۵۸ء، صفحہ ۲۱۹)

"اگر مختلف فیہ، سنت کا بجائے خود مرجع و سند (Authority) ہونا نہیں ہے بلکہ اختلاف جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے اور ہوا ہے وہ اس امر میں ہے کہ کسی خاص مسئلے میں جس چیز کے سنت ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہو وہ فی الوقت سنت ثابتہ ہے یا نہیں، تو ایسا ہی اختلاف قرآن کی آیات کا مفہوم و منشا متعین کرنے میں بھی واقع ہوتا ہے۔ ہر صاحب علم یہ بحث اٹھا سکتا ہے کہ جو حکم کسی مسئلے میں قرآن سے نکالا جا رہا ہے وہ درحقیقت اس سے نکلتا ہے یا نہیں۔ فاضل مکتوب نگار (جسٹس ایس۔اے رحمٰن) نے

خود قرآن مجید میں اختلاف تفسیر و تعبیر کا ذکر کیا ہے اور اس اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود وہ بجائے خود قرآن کو مرجع و سند مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسی طرح الگ الگ مسائل کے متعلق سنتوں کے ثبوت و تحقیق میں اختلاف کی گنجائش ہونے کے باوجود فی نفسہ "سنت" کو مرجع و سند تسلیم کرنے میں انہیں کیوں تامل ہے۔

یہ بات ایک ایسے فاضل قانون دان سے چھپی نہیں رہ سکتی کہ محترم مکتوب نگار ہیں' مخفی نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص' ادارے یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو' اس کے علم اور دائرۂ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے۔ اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر لے۔ کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ' یا لیجسلیچر' یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لیے حکم رسولؐ ہے۔ اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسولؐ کا حکم وہی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں یہ امر تو ضرور مختلف فیہ رہتا ہے کہ میرے نزدیک خدا یا رسول کا حکم کیا ہے اور آپ نے نزدیک کیا' لیکن جب تک میں اور آپ خدا اور رسولؐ کو آخری سند (Final Authority) مان رہے ہیں' ہمارے درمیان یہ امر مختلف فیہ نہیں ہو سکتا کہ خدا اور اس کے رسولؐ کا حکم بجائے خود ہمارے لیے قانون واجب الاتباع ہے"۔ (ترجمان القرآن' دسمبر ۵۸ء' صفحہ ۱۴۲)

"سنتوں کا معتدبہ حصہ فقہاء اور محدثین کے درمیان متفق علیہ ہے' اور ایک حصے میں اختلافات ہیں۔ بعض لوگوں نے کسی چیز کو سنت مانا ہے اور بعض نے اسے نہیں مانا۔ مگر اس طرح کے تمام اختلافات میں صدیوں

اہل علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطہ نظر کا استدلال اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے' فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحب علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود تحقیق سے کوئی رائے قائم کر سکے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ سنت کے نام سے متوحش ہونے کی کسی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ البتہ ان لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جو اس شعبہ علم سے واقف نہیں ہے۔ اور جنہیں بس دور ہی سے حدیثوں میں اختلافات کا ذکر سن کر گھبراہٹ لاحق ہو گئی ہے"۔ (ترجمان القرآن' دسمبر ۵۸ء' صفحہ ۱۶۹)

میں نے آپ کے مذکورۂ بالا دونوں سوالات کے جواب میں ان عبارات کے مطالعہ کا مشورہ اس امید پر دیا تھا کہ ایک تعلیم یافتہ ذی ہوش آدمی جو بات سمجھنے کی خواہش رکھتا ہو' انہیں پڑھ کر اپنی اس بنیادی غلطی کو خود سمجھ لے گا جو اس کے سوالات میں موجود ہے' اور اس کی سمجھ میں آپ سے آپ یہ بات آ جائے گی کہ سنت کی تحقیق میں اختلاف' اس کو آئین کی بنیاد بنانے میں اسی طرح مانع نہیں ہو سکتا جس طرح قرآن کی تعبیر میں اختلاف رائے آئین کی بنیاد قرار دینے میں مانع نہیں ہے لیکن آپ نے نہ اس غلطی کو محسوس کیا نہ بات سمجھنے کی کوشش فرمائی اور الٹے مزید کچھ سوالات چھیڑ دیئے۔ میں آپ کے چھیڑے ہوئے ان سوالات سے تو بعد میں تعرض کروں گا۔ پہلے آپ یہ بات صاف کریں کہ اگر آپ کے نزدیک صرف وہی چیز آئین کی بنیاد بن سکتی ہے جس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو تو اس آسمان کے نیچے دنیا میں وہ کیا چیز ایسی ہے جو انسانی زندگی کے معاملات و مسائل سے بحث کرتی ہو اور اس میں انسانی ذہن اختلاف کی کوئی گنجائش نہ پا سکیں؟ آپ قرآن کے متعلق اس سے زیادہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس کا متن متفق علیہ ہے اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ فلاں فقرہ قرآن کی آیت ہے۔ لیکن کیا آپ

اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ آیات قرآنی کا منشا سمجھنے' اور ان سے احکام اخذ کرنے میں بے شمار اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں؟ اگر ایک آئین کی اصل غرض الفاظ بیان کرنا نہیں بلکہ احکام بیان کرنا ہے تو اس غرض کے لحاظ سے الفاظ میں اتفاق کا کیا فائدہ ہوا جبکہ احکام اخذ کرنے میں اختلاف ہے' رہا ہے اور ہمیشہ ہو سکتا ہے؟ اس لیے یا تو آپ کو اپنے اس نقطہ نظر میں تبدیلی کرنی ہوگی کہ "آئین کی بنیاد صرف وہی چیز بن سکتی ہے جس میں اختلاف نہ ہو سکے"۔ یا پھر قرآن کو بھی اساس آئین ماننے سے انکار کرنا ہوگا۔ درحقیقت اس شرط کے ساتھ تو دنیا میں سرے سے کوئی آئین ہو ہی نہیں سکتا۔ جن سلطنتوں کا کوئی مکتوب آئین (Written Consitution) سرے سے ہے ہی نہیں (مثلاً برطانیہ) ان کے نظام کا تو خیر خدا ہی حافظ ہے' مگر جن کے ہاں ایک مکتوب آئین موجود ہے' ان کے ہاں بھی صرف آئین کی عبارات ہی متفق علیہ ہیں۔ تعبیرات ان میں سے کسی کی متفق علیہ ہوں تو براہ کرم اس کی نشاندہی فرمائیں۔

چار بنیادی حقیقتیں

اس کے علاوہ میری مذکورۂ بالا عبارات میں چند امور اور بھی ہیں جن سے آپ نے صرف نظر کر کے اصل مسائل سے پیچھا چھڑانے کے لیے دوسرے سوالات چھیڑ دیے ہیں۔ لیکن میں اس راہ گریز کی طرف آپ کو نہ جانے دوں گا جب تک ان امور کے متعلق آپ کوئی متعین بات صاف صاف نہ کہیں۔ یا تو آپ ان کو سیدھی طرح تسلیم کیجئے اور اپنا موقف بدلیے۔ یا پھر محض دعووں سے نہیں بلکہ علمی دلیل سے ان کا انکار کیجئے وہ امور یہ ہیں:

(ا) "سنتوں کا بہت بڑا حصہ امت میں متفق علیہ ہے"۔ اسلامی نظام حیات کا بنیادی ڈھانچہ جن سنتوں سے بنتا ہے وہ تو قریب قریب سب ہی متفق علیہ ہیں۔ ان کے علاوہ اصول اور کلیات شریعت جن سنتوں پر مبنی ہیں' ان میں بھی زیادہ تر اتفاق ہے۔ اختلاف اکثر و بیشتر ان سنتوں میں ہے جن سے جزئی احکام نکلتے ہیں اور وہ بھی

سب مختلف فیہ نہیں ہیں' بلکہ ان کا بھی ایک اچھا خاصا حصہ ایسا ہے جن پر علمائے امت کے درمیان اتفاق پایا جاتا ہے۔ صرف یہ بات کہ ان اختلافی مسائل کو بحثوں اور مناظروں میں زیادہ اچھالا گیا ہے' یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ "سنت" پوری کی پوری مختلف فیہ ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی سنتوں کے بڑے حصے کو متفق علیہ قرار دینے میں مانع نہیں ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے مخبلی اور زیادہ تر بے علم گروہوں نے کبھی کہیں اور کبھی کہیں اٹھ کر متفق علیہ چیزوں کو بھی اختلافی بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے گروہوں نے ایک سنت ہی پر ہاتھ صاف نہیں کیا ہے بلکہ ان میں سے بعض تحریف قرآن تک کے مدعی ہوئے ہیں۔ مگر اس قسم کے چند سرپھرے اور کم سواد لوگوں کا وجود امت مسلمہ کے بحیثیت مجموعی اتفاق کو باطل نہیں کر سکتا۔ ایسے دو چار سو یا دو چار ہزار آدمیوں کو آخر یہ اجازت کیوں دی جائے کہ پورے ملک کے لیے جو آئین بن رہا ہو اس میں سے ایک ایسی چیز کو خارج کر دینے کے لیے کھڑے ہو جائیں جسے قرآن کے بعد ساری امت اسلامی قانون کی دوسری بنیاد مانتی ہے اور ہمیشہ سے مانتی رہی ہے؟

(۲) جزئی احکام سے متعلق جن سنتوں میں اختلاف ہے ان کی نوعیت بھی یہ نہیں ہے کہ فرد فرد ان میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہو' بلکہ "دنیا کے مختلف حصوں میں کروڑوں مسلمان کسی ایک مذہب فقہی پر مجتمع ہو گئے ہیں اور ان کی بڑی بڑی آبادیوں نے احکام قرآنی کی کسی ایک تعبیر و تفسیر اور سنن ثابتہ کے کسی ایک مجموعہ پر اپنی اجتماعی زندگی کے نظام کو قائم کر لیا ہے"۔ مثال کے طور پر اپنے اسی ملک' پاکستان کو لے لیجیے جس کے آئین کا مسئلہ زیر بحث ہے۔ قانون کے معاملہ میں اس ملک کی پوری مسلم آبادی صرف تین بڑے بڑے گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک حنفی' دوسرے شیعہ' تیسرے اہل حدیث۔ ان میں سے ہر ایک گروہ احکام قرآن کی ایک تعبیر اور سنن ثابتہ کے ایک مجموعہ کو مانتا ہے۔ کیا جمہوری اصول پر ہم آئین کے مسئلے کو اس طرح بآسانی حل نہیں کر سکتے کہ شخصی قانون

(پرسنل لاء) کی حد تک ہر ایک گروہ کے لیے احکام قرآن کی وہی تعبیر اور سننِ ثابتہ کا وہی مجموعہ معتبر ہو' جسے وہ مانتا ہے اور ملکی قانون (پبلک لاء) اس تعبیر قرآن اور ان سننِ ثابتہ کے مطابق ہو جس پر اکثریت اتفاق کرے؟

(۳) بجائے خود بھی یہ سوال کہ "یہ کیونکر معلوم کیا جائے گا کہ فلاں سنت رسول اللہؐ ہے یا نہیں"۔ درحقیقت کوئی لاینحل سوال نہیں ہے۔ جن سنتوں کے بارے میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہے کہ وہ ثابت ہیں یا نہیں' ان پر "صدیوں اہل علم کے درمیان بحثیں جاری رہی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ ہر نقطہ نظر کا استدلال اور وہ بنیادی مواد جس پر یہ استدلال مبنی ہے' فقہ اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ آج کسی صاحب علم کے لیے بھی یہ مشکل نہیں ہے کہ کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے متعلق خود تحقیق سے کوئی رائے قائم کر سکے"۔

(۴) پھر آئین اور قانون کی اغراض کے لیے اس مسئلے کا آخری حل یہ ہے کہ "قرآن کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص' ادارے یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو' اس کے علم اور دائرۂ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے' اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ' لیجسلیچر' یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے وہی اس کے لیے حکم رسولؐ ہے' اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسولؐ کا حکم وہی ہے"۔

اب آپ خود ایمانداری کے ساتھ اپنے ضمیر سے پوچھیں کہ یہ امور جو میری محولہ بالا عبارات میں آپ کے سامنے آئے تھے' ان میں آپ کو اپنے تیسرے اور چوتھے سوال کا جواب مل گیا تھا یا نہیں؟ اور ان کا سامنا کر کے ان کے متعلق ایک واضح بات نفیاً یا اثباتاً کہنے کے بجائے آپ نے دوسرے سوالات چھیڑنے کی جو کوشش فرمائی ہے' اس کی معقول وجہ' جس پر آپ کا ضمیر مطمئن ہو' کیا ہے؟

دوسرے خط کا جواب

اس کے بعد آپ کے دوسرے عنایت نامے کو لیتا ہوں۔ اس میں آپ شکایت فرماتے ہیں کہ آپ کے پہلے خط کے جواب میں جن مضامین کی نشاندہی میں نے کی تھی ان سے آپ کو اپنے سوالات کا متعین جواب نہیں مل سکا' بلکہ آپ کی الجھن اور بڑھ گئی۔ لیکن اب آپ کے ان سوالات کے متعلق جو تفصیلی گزارشات میں نے پیش کی ہیں انہیں پڑھ کر آپ خود فیصلہ کریں کہ ان میں آپ کو ہر سوال کا ایک متعین جواب ملا ہے یا نہیں' اور ان سے آپ کی اُلجھن بڑھنے کا اصل سبب آیا ان مضامین میں ہے یا آپ کے اپنے ذہن میں۔

پھر آپ فرماتے ہیں کہ ان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو تمہاری دوسری تحریروں سے مختلف ہیں--- اس کے جواب میں اگر میں یہ عرض کروں کہ براہ کرم میری ان تحریروں کا حوالہ دیجئے اور یہ بتایئے کہ ان میں کیا چیزیں ان مضامین سے مختلف ہیں' تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو گریز کا ایک اور میدان مل جائے گا۔ اس لیے بحث کے دائرے کو زیر بحث مسائل پر مرکوز رکھنے کی خاطر' یہ جواب دینے کے بجائے میں آپ سے عرض کروں گا کہ میری دوسری تحریروں کو چھوڑیئے اب جو باتیں میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کے متعلق فرمایئے کہ انہیں آپ قبول کرتے ہیں یا رد' اور اگر رد کرتے ہیں تو اس کے لیے دلیل معقول کیا ہے؟

چار نکات

اس کے بعد آپ مجھے یہ یقین دلا کر کہ اس مراسلت* سے آپ کا مقصد مناظرہ بازی نہیں بلکہ بات کا سمجھنا ہے' میرے ان مضامین کا عطر چار نکات کی صورت میں نکال کر میرے سامنے پیش فرماتے ہیں اور مجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ یا تو میں اس بات کی توثیق کر دوں کہ میرے ان مضامین کا عطر یہی کچھ ہے' یا یہ تصریح کر دوں کہ آپ نے ان مضامین کا مطلب غلط سمجھا ہے۔

وہ نکات جو آپ نے عطر کے طور پر ان مضامین سے کشید کیے ہیں' ان پر تو

میں ابھی ابھی نمبروار بحث کرتا ہوں' لیکن اس بحث سے پہلے میں آپ سے گزارش کروں گا کہ اپنے مضامین سے جو نکات میں نے اوپر نقل کر کے پیش کیے ہیں ان کے مقابلہ میں اپنے اخذ کردہ ان نکات کو رکھ کر آپ خود دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ جو ذہن ان نکات کے بجائے ان نکات کی طرف ملتفت ہوا ہے وہ بات سمجھنے کا خواہش مند ہے یا مناظرہ بازی کا مریض۔

نکتہ اولیٰ

آپ کا اخذ کردہ پہلا نکتہ یہ ہے:

"آپ نے یہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم (صلعم) نے ۲۳ برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن مجید کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا اسے سنت رسول اللہؐ کہتے ہیں۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں:

(الف) رسول اللہ (صلعم) نے اس ۲۳ سالہ زندگی میں جو باتیں اپنی شخصی حیثیت سے ارشاد فرمائیں یا عملاً کیں وہ سنت میں داخل نہیں ہیں۔

(ب) سنت' قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے۔ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی اور نہ ہی سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے"۔

رسول اللہؐ کے کام کی نوعیت

یہ خلاصہ جو آپ نے میرے کلام سے نکالا ہے اس کا پہلا جز ہی غلط ہے۔ میرے ان مضامین میں' جن سے آپ یہ خلاصہ نکال رہے ہیں' یہ بات کہاں لکھی ہے کہ "نبی اکرمؐ نے ۲۳ برس کی پیغمبرانہ زندگی میں قرآن کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا یا عملاً کیا' اسے سنت رسول اللہؐ کہتے ہیں"۔ میں نے تو اس کے برعکس یہ کہا ہے کہ حضورؐ کی پیغمبرانہ زندگی کا وہ پورا کام جو آپؐ نے ۲۳ سال میں انجام دیا' قرآن کے منشا کی توضیح و تشریح ہے' اور یہ سنت قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ (یعنی اللہ تعالیٰ) کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے' اور یہ سارا کام چونکہ

آنحضورؐ نے نبی کی حیثیت سے کیا تھا لہٰذا اس میں آپ اسی طرح خدا کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے جس طرح کہ قرآن۔ اگر آپ دوسروں کی عبارتوں میں خود اپنے خیالات پڑھنے کے عادی نہیں ہیں تو آپ کے سوال نمبرا کے جواب میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اسے پڑھ کر خود دیکھ لیں کہ میں نے کیا کہا تھا اور آپ نے اسے کیا بنا دیا۔

پھر اس سے جو دو نتیجے آپ نے نکالے ہیں' وہ دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے میری ان عبارتوں میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈنے کے بجائے ایک نئی بحث کا راستہ تلاش کیا ہے' کیونکہ نہ آپ کا پہلا سوال ان مسائل سے متعلق تھا' نہ میں نے اپنے ان مخصوص مضامین کا حوالہ آپ کو اس لیے دیا تھا کہ آپ ان مسائل کا جواب ان میں تلاش کریں۔ تاہم میں آپ کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ آپ کے چھیڑے ہوئے سوالات کا جواب دینے سے میں نے گریز کیا ہے' اس لیے ان دونوں نتیجوں کے متعلق مختصراً عرض کرتا ہوں۔

حضورؐ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت کا فرق

(الف) یہ بات مسلمات شریعت میں ہے کہ سنت واجب الاتباع صرف وہی اقوال و افعال رسول ہیں جو حضورؐ نے رسول کی حیثیت سے کیے ہیں۔ شخصی حیثیت سے جو کچھ آپؐ نے فرمایا یا عملاً کیا ہے وہ واجب الاحترام تو ضرور ہے مگر واجب الاتباع نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں باب بیان اقسام علوم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے اس پر مختصر مگر بڑی جامع بحث کی ہے۔ صحیح مسلم میں امام مسلم نے ایک پورا باب ہی اس اصول کی وضاحت میں مرتب کیا ہے اور اس کا عنوان یہ رکھا ہے: باب وجوب امتثال ما قاله شرعا دون ما ذكر صلى الله عليه وسلم من معايش الدنيا على سبيل الرای (یعنی باب اس بیان میں کہ واجب صرف ان ارشادات کی پیروی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی حیثیت سے فرمائے ہیں نہ کہ ان باتوں کی جو دنیا کے معاملات میں آنحضورؐ نے اپنی رائے کے طور پر بیان فرمائی ہیں) لیکن سوال یہ ہے کہ حضورؐ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں فرق کرکے یہ

فیصلہ آخر کون کرے گا اور کیسے کرے گا کہ آپؐ کے افعال و اقوال میں سے سنت واجب الاتباع کیا چیز ہے اور محض ذاتی و شخصی کیا چیز؟ ظاہر ہے کہ ہم بطور خود یہ تفریق و تحدید کر لینے کے مجاز نہیں ہیں۔ یہ فرق دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو حضورؐ نے اپنے کسی قول و فعل کے متعلق خود تصریح فرما دی ہو کہ وہ ذاتی و شخصی حیثیت میں ہے یا پھر جو اصول شریعت آنحضورؐ کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوتے ہیں ان کی روشنی میں محتاط اہل علم یہ تحقیق کریں کہ آپ کے افعال و اقوال میں سے کس نوعیت کے افعال و اقوال آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کس نوعیت کی باتوں اور کاموں کو شخصی و ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے پر زیادہ تفصیلی بحث میں اپنے ایک مضمون میں کر چکا ہوں جس کا عنوان ہے "رسولؐ کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی"۔ (ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۵۹ء)

قرآن سے زائد ہونا اور قرآن کے خلاف ہونا ہم معنی نہیں ہے

(ب) یہ نتیجہ آپ نے بالکل غلط نکالا ہے کہ سنت قرآنی احکام و اصول کی شارح اس معنی میں ہے کہ "وہ قرآن کے علاوہ دین کے اصول یا احکام تجویز نہیں کرتی"۔ اگر آپ اس کے بجائے "قرآن کے خلاف" کا لفظ استعمال کرتے تو نہ صرف میں آپ سے اتفاق کرتا بلکہ تمام فقہاء و محدثین اس سے متفق ہوتے ہیں۔ لیکن آپ "قرآن کے علاوہ" کا لفظ استعمال کر رہے ہیں جس کے معنی قرآن سے زائد ہی کے ہو سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ "زائد" ہونے اور "خلاف" ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اے سنت اگر قرآن سے زائد کوئی چیز نہ بتائے تو آپ خود

واضح رہے کہ کسی حدیث کو قرآن کے خلاف اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ قرآن ایک کام کا حکم دے اور حدیث اس سے منع کرے۔ یا اس کے برعکس قرآن ایک چیز سے منع کرے اور حدیث اس کا حکم دے۔ لیکن اگر حدیث قرآن کے کسی مجمل حکم کی تفصیل بیان کرتی ہے، یا اس پر عمل درآمد کی شکل بتاتی ہے اور اس کا منشا واضح کرتی ہے تو یہ قرآن کے "خلاف" نہیں ہے بلکہ قرآن سے "زائد" ہے۔

سوچیں کہ اس کی ضرورت کیا ہے۔ اس کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ وہ قرآن کا وہ منشا واضح کرتی ہے جو خود قرآن میں صراحتاً مذکور نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن "اقامت صلوٰۃ" کا حکم دے کر رہ جاتا ہے۔ یہ بات قرآن نہیں بتاتا بلکہ سنت بتاتی ہے کہ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے اور اس کی اقامت کا مطلب کیا ہے۔ اس غرض کے لیے سنت ہی نے مساجد کی تعمیر، پنج وقتہ اذان اور نماز باجماعت کا طریقہ، نماز کے اوقات، نماز کی ہیئت، اس کی رکعتیں اور جمعہ و عیدین کی مخصوص نمازیں اور ان کی عملی صورت اور دوسری بہت سی تفصیلات ہم کو بتائی ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن سے زائد ہے، مگر اس کے خلاف نہیں ہے۔ اسی طرح تمام شعبہ ہائے زندگی میں سنت نے قرآن کے منشا کے مطابق انسانی سیرت و کردار اور اسلامی تہذیب و تمدن و ریاست کی جو صورت گری کی ہے وہ قرآن سے اس قدر زائد ہے کہ قرآنی احکام کے دائرے سے سنت کی ہدایات کا دائرہ بدرجہا زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی چیز قرآن کے خلاف نہیں ہے، اور جو چیز بھی واقعی قرآن کے خلاف ہو، اسے فقہاء و محدثین میں سے کوئی بھی سنت رسول اللہؐ نہیں مانتا۔

کیا سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے؟

اسی سلسلے میں آپ نے ایک اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ "نہ سنت قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے"۔ یہ بات آپ نے ایک غلط فہمی کے تحت لکھی ہے جسے صاف کرنا ضروری ہے۔ فقہائے حنفیہ جس چیز کو "نسخ الکتاب بالسنتہ" کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اس سے مراد دراصل قرآن کے کسی حکم عام کو مخصوص (Qualify) کرنا اور اس کے ایسے مدعا کو بیان (Explain) کرنا ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں والدین اور اقربین کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا (آیت ۱۸۰)۔ پھر سورۂ نساء میں تقسیم میراث کے احکام نازل ہوئے اور فرمایا گیا کہ یہ حصے متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد نکالے جائیں (آیات ۱۱۔۱۲)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یہ فرما دی کہ لاوصیۃ لوارث، یعنی اب

وصیت کے ذریعہ سے کسی وارث کے حصے میں کمی بیشی نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ ان حصوں میں اگر کوئی شخص وصیت کے ذریعہ سے کمی بیشی کرے گا تو قرآن کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس طرح اس سنت نے وصیت کی اجازت عام کو' جو بظاہر قرآن کی ان آیتوں سے مترشح ہوتی تھی' غیر وارث مستحقین کے لیے خاص کر دیا اور یہ بتا دیا کہ شرعاً جو حصے وارثوں کے لیے مقرر کر دیئے گئے ہیں ان میں کمی بیشی کرنے کے لیے وصیت کی اس اجازت عام سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسی طرح قرآن کی آیت وضو (المائدہ۔۶) میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا تھا جس میں کسی حالت کی تخصیص نہ تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسح علی الخفین پر عمل کر کے اور اس کی اجازت دے کر واضح فرما دیا کہ یہ حکم اس حالت کے لیے ہے جبکہ آدمی موزے پہنے ہوئے نہ ہو' اور موزے پہننے کی صورت میں پاؤں دھونے کے بجائے مسح کرنے سے حکم کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ اس چیز کو خواہ نسخ کہا جائے' یا تخصیص' یا بیان۔ اس سے مراد یہی ہے' اور یہ اپنی جگہ بالکل صحیح اور معقول چیز ہے۔ اس پر اعتراض کرنے کا آخر ان لوگوں کا کیا حق پہنچتا ہے جو غیر نبی ہونے کے باوجود قرآن کے بعض صریح احکام کو محض اپنے ذاتی نظریات کی بنیاد پر "عبوری دور کے احکام" قرار دیتے ہیں' جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ عبوری دور جب ان کی رائے نامبارک میں گزر جائے گا تو قرآن کے وہ احکام منسوخ ہو جائیں گے۔[۱]

نکتہ دوم

دوسرا نکتہ جو آپ نے میرے ان مضامین سے اخذ کیا ہے وہ یہ ہے: "آپ

۱۔ جناب پرویز صاحب قرآن مجید کے قانون وراثت اور ان تمام احکام کو جن سے صریحاً شخصی ملکیت کا جواز ثابت ہوتا ہے' عبوری دور کے احکام قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن کے یہ تمام احکام اس وقت منسوخ ہو جائیں گے جب ان کا اپنا تجویز کردہ "نظام ربوبیت" قائم ہو گا۔

نے فرمایا ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں سنت رسول اللہ بہ تمام و کمال درج ہو اور جس کا متن قرآن کے متن کی طرح تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو"۔

یہ خلاصہ جو آپ نے میرے مضامین سے نکالا ہے' اس کے متعلق میں بس اتنا ہی عرض کروں گا کہ اپنے خیالات میں مگن رہنے والے اور معقول بات سمجھنے سے انکار کرنے والے لوگ دوسروں کے کلام سے ایسے ہی خلاصے نکالا کرتے ہیں۔ ابھی ابھی آپ کے پہلے عنایت نامہ پر بحث کرتے ہوئے سوال نمبر۲ پر جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اسے پلٹ کر پھر پڑھ لیجئے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ میں نے کیا کہا ہے اور آپ نے اس کا خلاصہ کیا نکالا ہے۔

نکتہ سوم

آپ کا اخذ کردہ تیسرا نکتہ یہ ہے:

"آپ نے فرمایا ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے صحیح احادیث کو الگ کیا جائے گا۔ اس کے لیے روایات کو جانچنے کے جو اصول پہلے سے مقرر ہیں وہ حرف آخر نہیں۔ اصول روایات کے علاوہ درایت سے بھی کام لیا جائے گا اور درایت انہی لوگوں کی معتبر ہو گی جن میں علوم اسلامی کے مطالعہ سے ایک تجربہ کار جوہری کی بصیرت پیدا ہو چکی ہو۔

احادیث کو پرکھنے میں روایت اور درایت کا استعمال

یہ جن عبارتوں کا عجیب اور انتہائی مسخ شدہ خلاصہ آپ نے نکالا ہے انہیں میں لفظ بلفظ یہاں نقل کیے دیتا ہوں تاکہ جو کچھ میں نے کہا ہے' وہی اصل صورت میں سامنے آجائے اور اس کے من مانے خلاصوں کی حاجت نہ رہے۔

"فن حدیث اسی تنقید (یعنی تاریخی تنقید) ہی کا دوسرا نام ہے۔ پہلی صدی سے آج تک اس فن میں یہی تنقید ہوتی رہی ہے اور کوئی فقیہ یا محدث اس بات کا قائل نہیں رہا ہے کہ عبادات ہوں یا معاملات' کسی

مسئلے کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت دی جانے والی کسی روایت کو تاریخی تنقید کے بغیر حجت کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ یہ فن حقیقت میں اس تنقید کا بہترین نمونہ ہے اور جدید زمانے کی بہتر سے بہتر تاریخی تنقید کو بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ و ترقی (Improvement) کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محدثین کے اصول تنقید اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہوں جن تک موجودہ دور کے ناقدین تاریخ کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر میں بلاخوف تردید یہ کہوں گا کہ دنیا میں صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے۔ ورنہ آج تک دنیا کے کسی انسان اور کسی دور کی تاریخ بھی ایسے ذرائع سے محفوظ نہیں رہی ہے کہ ان سخت معیاروں کے آگے ٹھہر سکے اور اس کو قابل تسلیم تاریخی ریکارڈ مانا جا سکے..... تاہم میں یہ کہوں گا کہ مزید اصلاح و ترقی کا دروازہ بند نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ روایات کو پرکھنے اور جانچنے کے جو اصول محدثین نے اختیار کیے ہیں وہ حرف آخر ہیں۔ آج اگر کوئی ان کے اصول سے اچھی طرح واقفیت پیدا کرنے کے بعد ان میں کسی خامی یا کمی کی نشاندہی کرے اور زیادہ اطمینان بخش تنقید کے لیے کچھ اصول معقول دلائل کے ساتھ سامنے لائے تو یقیناً اس کا خیرمقدم کیا جائے گا۔ ہم میں سے آخر کون نہ چاہے گا کہ کسی چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دینے سے پہلے اس کے سنت ثابت ہونے کا تیقن حاصل کر لیا جائے اور کوئی کچی پکی بات حضورؐ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔

احادیث کے پرکھنے میں روایت کے ساتھ درایت کا استعمال بھی' جس کا ذکر فاضل مکتوب نگار (جسٹس ایس اے رحمٰن) نے کیا ہے' ایک متفق علیہ چیز ہے..... البتہ اس سلسلے میں جو بات پیش نظر رہنی چاہئے' اور مجھے امید ہے کہ فاضل مکتوب نگار کو بھی اس سے اختلاف نہ ہو گا' وہ یہ ہے کہ درایت صرف انہی لوگوں کی معتبر ہو سکتی ہے جو قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے مطالعہ و تحقیق میں اپنی عمر کا کافی حصہ صرف کر چکے ہوں' جن میں ایک مدت کی ممارست نے ایک تجربہ کار جوہری کی سی بصیرت پیدا کر دی ہو' اور خاص طور پر جن کی عقل اسلامی نظام فکرو عمل کے حدود اربعہ سے باہر کے نظریات' اصول اور اقدار لے کر اسلامی روایات کو ان کے معیار پر پرکھنے کا رجحان نہ رکھتی ہو۔ بلاشبہ عقل کے استعمال پر ہم کوئی پابندی نہیں لگا سکتے' نہ کسی کہنے والے کی زبان پکڑ سکتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ اسلامی علوم سے کورے لوگ اناڑی پن کے ساتھ کسی حدیث کو خوش آئند پا کر قبول اور کسی کو اپنی مرضی کے خلاف پا کر رد کرنے لگیں' یا اسلام سے مختلف کسی دوسرے نظام فکرو عمل میں پرورش پائے ہوئے حضرات یکایک اٹھ کر اجنبی معیاروں کے لحاظ سے احادیث کے رد و قبول کا کاروبار پھیلا دیں' تو مسلم ملت میں نہ ان کی درایت مقبول ہو سکتی ہے اور نہ اس ملت کا اجتماعی ضمیر ایسے بے تکے عقلی فیصلوں پر کبھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسلامی حدود میں تو اسلام ہی کی تربیت پائی ہوئی عقل اور اسلام کے مزاج سے ہم آہنگی رکھنے والی عقل ہی ٹھیک کام کر سکتی ہے۔ اجنبی رنگ و مزاج کی عقل' یا غیر تربیت یافتہ عقل بجز اس کے کہ انتشار پھیلائے' کوئی تعمیری خدمت اس دائرے میں انجام نہیں دے سکتی"۔ (ترجمان القرآن' دسمبر ۵۸ء' صفحہ ۱۶۴-۱۶۶)

ان عبارات سے آپ خود ہی اپنے نکالے ہوئے خلاصے کا تقابل فرما لیں۔ آپ پر واضح ہو جائے گا کہ بات سمجھنے کی خواہش کا کتنا اچھا نمونہ آپ نے پیش فرمایا ہے۔

نکتہ چہارم

چوتھا نکتہ جو آپ نے خلاصے کے طور پر میرے مضامین سے نکالا ہے' یہ ہے:

"احادیث کے اس طرح پرکھنے کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ یہ اسی طرح کلام رسولؐ ہیں جس طرح قرآن کی آیات اللہ کا کلام"۔

یہ ایک اور بے نظیر نمونہ ہے جو مناظرہ بازی کے بجائے بات سمجھنے کی خواہش کا آپ نے پیش فرمایا ہے۔ جس عبارت کا یہ خلاصہ آپ نے نکالا ہے' اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"قرآن کے کسی حکم کی مختلف ممکن تعبیرات میں سے جس شخص یا ادارے یا عدالت نے تفسیر و تعبیر کے معروف علمی طریقے استعمال کرنے کے بعد بالآخر جس تعبیر کو حکم کا اصل منشا قرار دیا ہو' اس کے علم اور دائرۂ کار کی حد تک وہی حکم خدا ہے' اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حقیقت میں بھی وہی حکم خدا ہے۔ بالکل اسی طرح سنت کی تحقیق کے علمی ذرائع استعمال کر کے کسی مسئلے میں جو سنت بھی ایک فقیہ' یا لیجسلیچر' یا عدالت کے نزدیک ثابت ہو جائے' وہی اس کے لیے حکم رسول ہے' اگرچہ قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حقیقت میں رسول کا حکم وہی ہے"۔

یہ عبارت اگرچہ میں پہلے نقل کر چکا ہوں' لیکن تکرار کی قباحت کے باوجود میں نے اسے پھر نقل کیا ہے تاکہ آپ خود بھی اپنے جوہر (Extract) نکالنے کے فن کی داد دے سکیں اور اس اخلاقی جسارت کی داد میں اپنی طرف سے آپ کو دیتا ہوں کہ میری عبادت کو میرے ہی سامنے توڑ مروڑ کر پیش کر کے آپ نے واقعی

کمال کر دکھایا ہے۔ میں شخصی طور پر آپ کی بڑی قدر کرتا ہوں' اور ایسی باتوں کی آپ جیسے معقول انسان سے توقع نہ رکھتا تھا' مگر شاید یہ بزم طلوع اسلام کا فیض ہے کہ اس نے آپ کو بھی یہاں تک پہنچا دیا۔

اشاعت کا مطالبہ

آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ اپنے پہلے عنایت نامے کو آپ نے اس فقرے پر ختم فرمایا تھا:

"چونکہ آئین کے سلسلے میں عام لوگوں کے ذہن میں ایک پریشانی سی پائی جاتی ہے اس لیے اگر عوام کی آگاہی کے لیے آپ کے موصولہ جواب کو شائع کر دیا جائے تو مجھے امید ہے کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا"۔

میں اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اعتراض ہونا تو درکنار میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ اس مراسلت کو جوں کا توں شائع فرما دیں۔ میں خود اسے "ترجمان القرآن" میں شائع کر رہا ہوں۔ آپ بھی اس کو "طلوع اسلام" کی کسی قریبی اشاعت میں درج کرنے کا انتظام فرمائیں تاکہ دونوں طرف کے عوام اس سے آگاہ ہو کر پریشانی سے نجات پا سکیں۔

خاکسار۔ ابوالاعلیٰ

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۶۰ء)

منصب نبوت

صحیح اور غلط تصور کا فرق

(صفحات گزشتہ میں سنت کی آئینی حیثیت کے متعلق ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مصنف کی جو مراسلت ناظرین کے ملاحظہ سے گزری ہے' اس کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کا ایک اور خط وصول ہوا' جسے ذیل میں مصنف کے جواب کے ساتھ درج کیا جا رہا ہے)

ڈاکٹر صاحب کا خط

مولانای محترم! السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۸ر اگست ملا۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد بات ذرا اطمینان سے ہو سکے گی۔ آپ نے اپنے خط مورخہ ۲۶ جون میں میرے پہلے سوال کے جواب کے اختتام پر فرمایا تھا:

"دوسرے سوالات چھیڑنے سے پہلے آپ کو یہ بات صاف کرنی چاہیے تھی کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھ کر سنا دینے کے سوا دنیا میں کوئی اور کام کیا تھا یا نہیں' اور اگر کیا تھا تو کس حیثیت میں؟"

نیز یہ بھی کہ:

"پہلے آپ یہ بات صاف کریں کہ آیا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بجائے خود کوئی چیز ہے یا نہیں؟ اور اس کو آپ قرآن کے ساتھ ماخذ قانون مانتے ہیں یا نہیں' اور نہیں مانتے تو اس کی دلیل کیا ہے؟"

چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے موجودہ خط میں مسئلہ زیر بحث کے

صرف اسی حصہ پر گفتگو کروں اور اس کے باقی اجزاء و آئندہ کے لیے ملتوی کر دوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اپنے اولین خط مورخہ ۱۸ر مئی میں صاف طور پر یہ عرض کیا تھا کہ:

"مجھے نہ تو سنت کی حقیقی اہمیت سے مجال انکار ہے اور نہ اس کی اہمیت کو ختم کرنا مقصود"۔

چنانچہ آپ کا یہ سوال کہ میرے نزدیک سنت رسول اللہؐ بجائے خود کوئی چیز ہے یا نہیں؟ غیر ضروری ہے۔ البتہ میرے نزدیک سنت کا مفہوم آپ سے مختلف ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ آیا میں سنت کو قرآن کے ساتھ ماخذ قانون مانتا ہوں یا نہیں؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ اجازت دیجئے کہ میں پہلے اس بات کو صاف کر لوں کہ آیا رسول اللہؐ نے قرآن سنا دینے کے سوا دنیا میں کوئی کام کیا تھا یا نہیں؟ اور اگر کیا تھا تو کس حیثیت میں؟ جب اس کا جواب سامنے آجائے گا تو دلیل خود بخود سامنے آجائے گی۔

مجھے آپ سے سو فیصدی اتفاق ہے کہ حضورؐ معلم بھی تھے، قاضی بھی تھے، سپہ سالار بھی۔ آپ نے افراد کی تربیت کی اور تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دی۔ اور پھر ایک ریاست قائم کی وغیرہ وغیرہ! لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں کہ "۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے جو کچھ کیا تھا یہ وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے"۔

بے شک حضورؐ نے حاکم اعلیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا اور جو کچھ حضورؐ نے عملاً کیا اس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی۔ میرے لیے ناقابل فہم ہے۔ میرے نزدیک وحی پانے کا سلسلہ نبی اکرمؐ کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن رسالت کے فرائض جو حضورؐ نے سرانجام دیئے ان کا مقصد یہ تھا کہ حضورؐ کے بعد بھی انہی خطوط پر معاشرے کا مقام عمل میں لایا جا سکے اور یہ تسلسل قائم رہے۔ اگر حضورؐ نے ما

انزل اللّٰہ کو دوسروں تک پہنچایا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ ماانزل اللّٰہ کو دوسروں تک پہنچائے۔ اگر حضورؐ نے ماانزل اللّٰہ کے مطابق جماعت بنائی' ریاست قائم کی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ انہی خطوط پر عمل کرے۔ اگر حضورؐ نے ماانزل اللّٰہ کے مطابق معاملات کے فیصلے کیے تو امت بھی ماانزل اللّٰہ کے مطابق فیصلے کرے۔ اگر حضورؐ نے "شاورھم فی الامر" کے مطابق امور سلطنت میں مشاورت سے کام کیا تو امت بھی ایسا ہی کرے۔ اگر حضورؐ نے نبوت کے ۲۳ سالہ غزوات میں گھوڑے کی پیٹھ پر گزارے تو امت بھی انہی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر جنگ کرے۔ چنانچہ ماانزل اللّٰہ کے مطابق تربیت' جماعت بندی' ریاست کا قیام' مشاورت' قضا' غزوات' یہ سارے کام امت کرے تو یہ سنت رسولؐ اللہ ہی کی پیروی ہے۔ حضورؐ نے بھی اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ماانزل اللّٰہ پر عمل کرتے ہوئے معاشرے کی تشکیل کی۔ اور سنت رسولؐ اللہ کی پیروی یہ ہے کہ ہر زمانے کی امت زمانے کے تقاضوں کے مطابق ماانزل اللّٰہ پر عمل کرتے ہوئے معاشرے کی تشکیل کرے۔ موجودہ وقت میں ہم جو بھی طرز حکومت' حالات اور موجودہ تقاضوں کے مطابق مناسب سمجھیں عمل میں لائیں۔ لیکن ماانزل اللّٰہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر ہی سنت رسول اللہ پر عمل ہو گا۔ اگر ہم ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جو ماانزل اللّٰہ نے متعین کیے ہیں جنگیں لڑیں تو یہی سنت رسول اللہ پر عمل ہو گا۔ لیکن اگر جیسا کہ ایک مقامی اخبار میں ایک مولوی صاحب نے گزشتہ ہفتہ لکھا تھا کہ حضرت عمرؓ کی فوج کو ایک قلعہ فتح کرنے میں تاخیر اس لیے ہوئی کہ فوج نے کئی دن مسواک نہیں کی تھی یا یہ کہ آج کے ایٹمی دور میں جنگ کے اندر تیروں کا استعمال ہی ضروری ہے کیونکہ حضورؐ نے جنگوں میں تیر استعمال کیے تھے تو اس سے بڑھ کر سنت رسول اللہؐ سے مذاق کیا ہو سکتا ہے۔ ان تمام اعمال میں جو حضورؐ نے ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں کیے وہ اسی ماانزل اللّٰہ کا جو کتاب اللہ میں موجود ہے' اتباع کرتے تھے

اور امت کو بھی یہی حکم ملا کہ اسی کا اتباع کرے۔ جہاں اتبعوا ما انزل اللہ الیک من ربکم (۳:۷) کہہ کر امت کے افراد کو تلقین کی' وہاں یہ بھی اعلان ہوا کہ حضورؐ بھی اسی کا اتباع کرتے ہیں۔ قل اتبع ما یوحی الی من ربی (۲۳۴:۷)۔ نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بنا پر کتاب اللہ کے قانون کو ناکمل قرار دیتے ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو یہ تصور بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ کیا آپ قرآن کریم سے کوئی ایسی آیت پیش فرمائیں گے؟ جس سے معلوم ہو کہ قرآن کا قانون ناکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو انسانوں کی رہنمائی کے لیے صرف ایک ضابطہ قوانین کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو شک و شبہ سے بالاتر ہے' بلکہ اس کی ابتداء ہی ان الفاظ سے کی ہے ذلک الکتٰب لاریب فیہ۔ اور پھر معاملات زندگی میں فیصلوں کے لیے اس ضابطہ حیات کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا' اور یہ بھی واضح طور پر اعلان کر دیا کہ یہ ضابطہ قانون مفصل ہے۔ افغیر اللہ ابتغی حکما وھو الذی انزل الیکم الکتب مفصلا (۱۱۵:۶) بلکہ مومن اور کافر کے درمیان تمیز یہ رکھ دی کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۴۴:۵) کیا قرآن کریم کو کتاب عزیز (ایک غالب کتاب) کہہ کر نہیں پکارا گیا۔ تمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا (۱۱۶:۶) کا اعلان یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں کہ قانون خداوندی مکمل ہو چکا ہے اور جو کچھ باقی رہتا تھا' وہ پورا ہو گیا۔ کافر بھی تو اس کتاب کے علاوہ کوئی چیز اپنی تسلی کے لیے چاہتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا یہ کتاب ان کے لیے کافی نہیں؟ اولم یکفیھم[1] انا انزلنا الیک الکتب یتلی علیھم (۵۱:۲۹)

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ چونکہ دین کا تقاضا یہ تھا کہ کتاب پر عمل اجتماعی شکل میں ہو اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص قرآن پر اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرے اور دوسرا اپنی سمجھ کے مطابق۔ اس لیے نظام کو قائم رکھنے کے

۱۔ صحیح عبارت اولم یکفھم انا انزلنا علیک ہے۔

لیے ایک زندہ شخصیت کی ضرورت ہے اور مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ جہاں اجتماعی نظام کے قیام کا سوال ہو۔ وہاں پہنچانے والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے۔ کیونکہ پیغام اس نے اس لیے پہنچایا کہ وحی اس کے سوا اور کسی کو ملتی نہیں۔ چنانچہ قرآن نے اسی لیے واضح کر دیا کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللّٰہ چنانچہ حضورؐ مرکز ملت بھی تھے اور سنت رسول اللہؐ پر عمل یہی ہے کہ حضورؐ کے بعد بھی اسی طرح مرکزیت کو قائم رکھا جائے۔ چنانچہ اسی نکتہ کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ وما محمدا الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم (۳:۱۴۴)۔ ظاہر ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ (اگر اس کا مقصد وعظ و نصیحت نہیں' اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ سنت رسول اللہ پر عمل کرتے ہوئے مرکز ملت کے قیام کو مسلسل عمل میں لایا جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس ضابطہ قانون پر چلانا حضورؐ کا مقصد تھا اور آئندہ مرکز ملت کا مقصد رہے گا۔ اس ضابطہ قانون کو نامکمل قرار دے دیا جائے۔

آپ کا اگلا سوال یہ ہے کہ جو کام حضورؐ نے ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں سرانجام دیئے ان میں آنحضرتؐ کی پوزیشن کیا تھی؟ میرا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ کر کے دکھایا وہ ایک بشر کی حیثیت سے لیکن ماانزل اللّٰہ کے مطابق کر کے دکھایا۔ میرا یہ جواب کہ حضورؐ کے فرائض رسالت کی سرانجام دہی ایک بشر کی حیثیت سے تھی۔ میرے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خود کتاب اللہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ حضورؐ نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ انا بشر مثلکم قرآن کی آیت سے واضح ہے کہ حضورؐ نظام مملکت کی انجام دہی میں ایک بشر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور کبھی کبھی آنحضرت سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ قل ان ضللت فانما اضل علی نفسی وان اھتدیت فبما یوحی الی ربی انہ سمیع قریب (۳۴:۵۰)۔ اگر یہ اجتہادی غلطیاں ایسی ہوتیں جن کا اثر دین کے اہم گوشے

پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اس کی تادیب بھی آجاتی جیسے کہ ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہنے کی اجازت چاہی اور حضورؐ نے دے دی۔ اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی۔ عفا اللہ عنک لما اذنت لھم حتٰی یتبین لک الذین صدقوا وتعلم الکٰذبین (۹:۴۳)۔ اسی طرح سورۂ عبس میں ہے۔ عبس وتولی ان جاءہ الاعمٰی وما یدریک لعلہ یزکی او یذکر فتنفعہ الذکر اما من استغنٰی فانت لہ تصدی وما علیک الا یتزکی واما من جاءک یسعٰی وھو یخشٰی فانت عنہ تلھی (۸۰:۱۰-۱۱)

مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ وحی کی روشنی میں امور سلطنت کی سرانجام دہی میں جزئی معاملات میں حضورؐ سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ حضورؐ ان امور کو ایک بشر کی حیثیت سے سرانجام دیتے تھے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے دو نتائج لازماً پیدا ہوتے۔ اولاً یہ تصور کہ چونکہ حضورؐ نے جو کچھ کیا وہ ایک نبی کی حیثیت سے کیا۔ اس لیے عام انسان اس کو نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آج بھی مایوسی کے عالم میں بعض جگہ یہ تصور پایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے جو معاشرہ قائم کیا تھا وہ عام انسانوں کے بس کا روگ نہیں۔ اور وہ دوبارہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تصور بجائے خود سنت رسولؐ کی پیروی کی نفی ہے۔ دوسرا نتیجہ اس کا یہ تصور ہو سکتا ہے کہ اس لیے حضورؐ کے بعد نبیوں کے آنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ پھر سے اس قسم کا معاشرہ قائم کر سکیں (چونکہ عام انسان ایسا نہیں کر سکتے) آپ خود سوچئے کہ یہ دونوں نتائج کس قدر خطرناک ہیں جو اس تصور کے نتیجہ کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں کہ حضورؐ نے جو کچھ بھی کیا ایک نبی کی حیثیت سے کیا۔ ختم نبوت انسانیت کے سفر زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے' جہاں سے شخصیتوں کا دور ختم ہوتا ہے اور اصول و اقدار کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تصور کہ حضورؐ نے جو کچھ کیا ایک نبی کی حیثیت سے کیا۔

ختم نبوت کے اصول کی تردید کے مترادف ہے۔ وما محمداً ۱؎ الا رسول..... (۳:۱۴۴) جیسی واضح آیات کے بعد یہ کہنا کہ رسول اللہؐ جو کچھ کرتے تھے' وحی کی رو سے کرتے تھے (اور وحی کا سلسلہ حضورؐ کی ذات کے ساتھ ختم ہو گیا)۔ اس بات کا اعلان ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد دین کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ حضرات خلفائے کرام اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وحی "الکتب" کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد حضورؐ جو کچھ کرتے تھے باہمی مشاورت سے کرتے تھے۔ اس لیے حضورؐ کی وفات کے بعد نظام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سلطنت کی وسعت کے ساتھ تقاضے بڑھتے گئے اس لیے آئے دن نئے نئے امور سامنے آتے تھے جن کے تصفیہ کے لیے اگر کوئی پہلا فیصلہ مل جاتا جس میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی تو اسے علی حالہ قائم رکھتے تھے۔ اگر اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے تبدیلی کر لیتے۔ اور اگر اسے فیصلے کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے نیا فیصلہ کر لیتے۔ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی طریقہ رسول اللہؐ کا تھا۔ اور اسی کو حضورؐ کے جانشینوں نے قائم رکھا۔ اسی کا نام اتباع سنت رسول اللہؐ ہے۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ حضورؐ جو کچھ کرتے تھے وحی کی رو سے کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ خدا کو اپنی طرف سے بھیجی ہوئی ایک قسم کی وحی پر (نعوذ باللہ) تسلی نہ ہوئی۔ چنانچہ دوسری قسم کی وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ یہ دو رنگی وحی آخر کیوں؟ پہلے آنے والے نبیوں پر جب وحی نازل ہوئی تو اس میں نزول قرآن کی طرف اشارہ تھا۔ تو کیا اس اللہ کے لیے جو ہر چیز پر قادر ہے' یہ بڑا مشکل تھا کہ دوسری قسم کی وحی جس کا آپ ذکر کرتے ہیں' اس کا قرآن میں اشارہ کر دیتا۔ مجھے تو قرآن میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کسی

۱؎ محمداً نہیں بلکہ محمد صحیح ہے۔

آیت کی طرف اشارہ فرما سکیں، مشکور ہوں گا۔ والسلام

مخلص ---- عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی، السلام علیکم و رحمتہ اللہ! عنایت نامہ مورخہ ۷ار اگست ۶۰ء ملا۔ اس تازہ عنایت نامے میں آپ نے اپنے پیش کردہ ابتدائی چار سوالات میں سے پہلے سوال پر بحث رکھتے ہوئے نبوت اور سنت کے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کا تصور نبوت ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بنیاد ہی میں غلطی موجود ہو تو بعد کے ان سوالات پر جو اسی بنیاد سے اٹھتے ہیں، بحث کر کے ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ میرے جواب پر مزید سوالات اٹھانے کے بجائے ان اصل مسائل پر گفتگو فرمائیں جو میں نے اپنے جواب میں بیان کیے ہیں۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری اس گزارش کو قبول کر کے اولین بنیادی سوال پر اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔ اب میں آپ کی، اور ان دوسرے لوگوں کی جو اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں، کچھ خدمت انجام دے سکوں گا۔

نبوت اور سنت کا جو تصور آپ نے بیان کیا ہے وہ قرآن مجید کے نہایت ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے اور غضب یہ ہے کہ آپ نے اس ناقص مطالعہ پر اتنا اعتماد کر لیا کہ پہلی صدی سے آج تک اس بارے میں ساری امت کے علماء اور عوام کا بالاتفاق جو عقیدہ اور عمل رہا ہے اسے آپ غلط سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنے نزدیک یہ خیال کر لیا ہے کہ پونے چودہ سو سال کی طویل مدت میں تمام مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کو سمجھنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں، ان کے تمام علمائے قانون نے سنت کو ماخذ قانون ماننے میں غلطی کی ہے، اور ان کی تمام سلطنتیں اپنا قانونی نظام اس بنیاد پر قائم کرنے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہیں۔ آپ کے ان خیالات پر تفصیلی گفتگو تو میں آگے کی سطور میں کروں گا، لیکن اس گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے میں

چاہتا ہوں کہ آپ ٹھنڈے دل سے اپنے دینی علم کی مقدار کا خود جائزہ لیں اور خود ہی سوچیں کہ وہ علم جو آپ نے اس بارے میں حاصل کیا ہے کیا وہ اتنے بڑے زعم کے لیے کافی ہے؟ قرآن تنہا آپ ہی نے تو نہیں پڑھا ہے' کروڑوں مسلمان ہر زمانے میں اور دنیا کے ہر حصے میں اس کو پڑھتے رہے ہیں۔ اور بے شمار ایسے لوگ بھی اسلامی تاریخ میں گزرے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں جن کے لیے قرآن کا مطالعہ ان کے بہت سے مشاغل میں سے ایک ضمنی مشغلہ نہیں رہا ہے بلکہ انہوں نے اپنی عمریں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے مضمرات سمجھنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں صرف کر دی ہیں۔ آخر آپ کو یہ غلط فہمی کیسے لاحق ہو گئی کہ نبوت جیسے بنیادی مسئلے میں یہ سب لوگ قرآن کا منشا بالکل الٹا سمجھ بیٹھے ہیں اور صحیح منشا صرف آپ پر اور آپ جیسے چند اصحاب پر اب منکشف ہوا ہے۔ پوری تاریخ اسلام میں آپ کسی ایک قابل ذکر عالم کا بھی نام نہیں لے سکتے جس نے قرآن سے منصب نبوت کا وہ تصور اخذ کیا ہو جو آپ بیان کر رہے ہیں اور سنت کی وہ حیثیت قرار دی ہو جو آپ قرار دے رہے ہیں۔ اگر ایسے کسی عالم کا حوالہ آپ دے سکتے ہیں تو براہ کرم اس کا نام لیجیے۔

ا۔ منصب نبوت اور اس کے فرائض

آپ کی عقل و ضمیر سے یہ مخلصانہ اپیل کرنے کے بعد اب میں آپ کے پیش کردہ خیالات کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ آپ کی ساری بحث دس نکات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلا نکتہ خود آپ کے الفاظ میں یہ ہے:

> "مجھے آپ سے سو فی صدی اتفاق ہے کہ حضورؐ معلم بھی تھے' حاکم بھی تھے' قاضی بھی تھے' سپہ سالار بھی۔ آپ نے افراد کی تربیت کی اور تربیت یافتہ افراد کو ایک منظم جماعت کی شکل دی اور پھر ایک ریاست قائم کی"۔

یہ سو فی صدی اتفاق جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں' دراصل ایک فی صدی'

بلکہ ۱/۱۰۰۰ فی صدی بھی نہیں ہے' اس لیے کہ آپ نے حضورؐ کو محض معلم' حاکم' قاضی وغیرہ مانا ہے' مامور من اللہ کی لازمی صفت کے ساتھ نہیں مانا ہے۔ حالانکہ سارا فرق اسی صفت کے ماننے اور نہ ماننے سے واقع ہوتا ہے۔ آگے چل کر آپ نے خود یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ سارے کام رسول کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت میں تھے اور اسی وجہ سے اس حیثیت میں حضورؐ نے جو کام کیا ہے اسے آپ وہ سنت نہیں مانتے جو ماخذ قانون ہو۔ دوسرے الفاظ میں آنحضورؐ آپ کے نزدیک ایک معلم تھے مگر خدا کے مقرر کردہ نہیں بلکہ جیسے دنیا میں اور استاد ہوتے ہیں ویسے ہی ایک حضورؐ بھی تھے۔ اسی طرح آپؐ قاضی تھے' مگر خدا نے آپؐ کو اپنی طرف سے قاضی مقرر نہیں کیا تھا بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح ایک جج یا مجسٹریٹ آپؐ بھی تھے۔ یہی پوزیشن حاکم اور مزکی اور قائد و رہنما کے معاملہ میں بھی آپ نے اختیار کی ہے کہ ان میں سے کوئی منصب بھی آپ کے خیال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے حاصل نہ تھا۔

پہلا سوال یہ ہے کہ پھر یہ مناصب حضورؐ کو حاصل کیسے ہوئے۔ کیا مکہ میں اسلام قبول کرنے والوں نے باختیار خود آپؐ کو اپنا لیڈر منتخب کیا تھا اور اس قیادت کے منصب سے وہ آپؐ کو ہٹا دینے کے بھی مجاز تھے؟ کیا مدینہ پہنچ کر جب اسلامی ریاست کی بنا ڈالی گئی۔ اس وقت انصار و مہاجرین نے کوئی مجلس مشاورت منعقد کر کے یہ طے کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری اس ریاست کے صدر اور قاضی اور افواج کے قائد اعلیٰ ہوں گے؟ کیا حضورؐ کی موجودگی میں کوئی دوسرا مسلمان بھی ان مناصب کے لیے منتخب ہو سکتا تھا؟ اور کیا مسلمان اس کے مجاز تھے کہ آپؐ سے یہ سب مناصب' یا ان میں سے کوئی منصب واپس لے کر باہمی مشورے سے کسی اور کو سونپ دیتے؟ پھر کیا یہ بھی واقعہ ہے کہ مدینے کی اس ریاست کے لیے قرآن کے تحت تفصیلی قوانین اور ضابطے بنانے کی غرض سے کوئی لیجسلیچر حضورؐ کے زمانہ

میں قائم کی گئی تھی جس میں آپؐ صحابہؓ کے مشورے سے قرآن کا منشا معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہوں اور اس مجلس کی رائے سے قرآن کا جو مفہوم متعین ہوتا ہو' اس کے مطابق ملکی قوانین بنائے جاتے ہوں؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں ہے تو براہ کرم اس کا کوئی تاریخی ثبوت ارشاد فرمائیں۔ اور اگر نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود رہنما' فرمانروا' قاضی' شارع اور قائداعلیٰ بن بیٹھے تھے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضورؐ کی جو حیثیت آپ قرار دے رہے ہیں کیا قرآن بھی آپؐ کی وہ حیثیت قرار دیتا ہے؟ اس سلسلہ میں ذرا قرآن کھول کر دیکھئے کہ وہ کیا کہتا ہے۔

رسولؐ بحیثیت معلم و مربی

اس کتاب پاک میں چار مقامات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے:

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل..... ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیتک ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم(البقرۃ:۱۲۹)

"اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر (کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (انہوں نے دعا کی)..... اے ہمارے پروردگار' ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما' جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے"۔

کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم اٰیتنا ویزکیکم ویعلمکم الکتب والحکمۃ ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون (البقرۃ:۱۵۱)

"جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو

تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے"۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ (آل عمران: ۱۶۴)

"اللہ نے ایمان لانے والوں پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ (الجمعہ: ۲)

"وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

ان آیات میں بار بار جس بات کو بتاکید دہرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف آیات قرآن سنا دینے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔

ایک یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔

دوسرے یہ کہ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔

اور تیسرے یہ کہ آپ افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں، یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشوونما دیں۔

ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم صرف قرآن کے الفاظ سنا دینے سے زائد ہی کوئی چیز تھی ورنہ اس کا الگ ذکر کرنا بے معنی تھا۔ اسی طرح افراد اور

معاشرے کی تربیت کے لیے آپ جو تدابیر بھی اختیار فرماتے تھے۔ وہ بھی قرآن کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے زائد ہی کچھ تھیں' ورنہ تربیت کی اس الگ خدمت کا ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اب فرمایئے کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ یہ معلم اور مربی کے مناصب جو حضورؐ کو حاصل تھے' ان پر آپ خود قائز ہو بیٹھے تھے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر مامور فرمایا تھا؟ کیا قرآن کی ان صاف اور مکرر تصریحات کے بعد اس کتاب پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناصب رسالت کے اجزاء نہ تھے اور آنحضرتؐ ان مناصب کے فرائض اور خدمات بحیثیت رسول نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے؟ اگر نہیں کہہ سکتا تو بتایئے کہ قرآن کے الفاظ سنانے سے زائد جو باتیں حضورؐ نے تعلیم کتاب و حکمت کے سلسلے میں فرمائیں اور اپنے قول و عمل سے افراد اور معاشرہ کی جو تربیت حضورؐ نے کی اسے من جانب اللہ ماننے اور سند تسلیم کرنے سے انکار خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

رسولؐ بحیثیت شارح کتاب اللہ

سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم (آیت ۴۴)

"اور (اے نبیؐ) یہ ذکر ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے"۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ جو احکام و ہدایات دے' ان کی آپؐ توضیح و تشریح فرمائیں۔ ایک موٹی سی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ سکتا ہے کہ کسی کتاب کی توضیح و تشریح محض اس کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہو جاتی' بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے' اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی

مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرہ (Practical Demonstration) کر کے بتاتا ہے کہ مصنف کا منشا اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پوچھنے والے کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا کسی طفل مکتب کے نزدیک بھی تشریح و توضیح قرار نہیں پا سکتا۔ اب فرمایئے کہ اس آیت کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپؐ کو شارح مقرر کیا تھا؟ یہاں تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسول اپنے قول اور عمل سے اس کا مطلب واضح کرے۔ پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارح قرآن کی حیثیت سے آپؐ کے منصب کو رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے اور آپ کے پہنچائے ہوئے الفاظ قرآن کو لے کر آپؐ کی شرح و تفسیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ انکار خود رسالت کا انکار نہ ہو گا۔

رسولؐ بحیثیت پیشوا و نمونہ تقلید

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قل ان كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله..... قل اطيعوا الله والرسول فان تولوا فان الله لا يحب الكفرين (آیات:۳۱۔۳۲)

(اے نبیؐ) کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا...... کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسولؐ کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اور سورۂ احزاب میں فرماتا ہے:

لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الاخر (آیت:۲۱)

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نمونہ تقلید ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

ان دونوں آیتوں میں خود اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو پیشوا مقرر کر رہا ہے' ان کی پیروی کا حکم دے رہا ہے' ان کی زندگی کو نمونہ تقلید قرار دے رہا ہے' اور صاف فرما رہا ہے کہ یہ روش اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو' میری محبت اس کے بغیر تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی' بلکہ اس سے منہ موڑنا کفر ہے۔ اب فرمایئے کہ حضورؐ رہنما اور لیڈر خود بن بیٹھے تھے؟ یا مسلمانوں نے آپؐ کو منتخب کیا تھا؟ یا اللہ نے اس منصب پر آپؐ کو مامور کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضورؐ کو مامور من اللہ رہنما و پیشوا قرار دے رہے ہیں' تو پھر آپؐ کی پیروی اور آپؐ کے نمونہ زندگی کی تقلید سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے۔ اگر یہ مراد ہوتی تو فاتبعوا القرآن فرمایا جاتا نہ کہ فاتبعونی۔ اور اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسوۂ حسنہ کہنے کے تو کوئی معنی ہی نہ تھے۔

رسولؐ بحیثیت شارع

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر ویحل لھم الطیبت ویحرم علیھم الخبٰئث ویضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم (آیت:۱۵۷)

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتار دیتا ہے' جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کیے ہیں۔ اللہ کی

طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے' بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے' وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے' اس لیے وہ بھی قانون خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ یہی بات سورۂ حشر میں اسی صراحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے:

وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب (آیت:۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کر دے' اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو' اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سے کسی کی یہ تاویل نہیں کی جا سکتی کہ ان میں قرآن کے امر و نہی اور قرآن کی تحلیل و تحریم کا ذکر ہے۔ یہ تاویل نہیں بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہو گی۔ اللہ نے تو یہاں امر و نہی اور تحلیل و تحریم کو رسول کا فعل قرار دیا ہے نہ کہ قرآن کا۔ پھر کیا کوئی شخص اللہ میاں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہو گئی' آپ بھولے سے قرآن کے بجائے رسول کا نام لے گئے؟

رسولؐ بحیثیت قاضی

قرآن میں ایک جگہ نہیں' بکثرت مقامات پر اللہ تعالٰی اس امر کی تصریح فرماتا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی مقرر کیا ہے' مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ

(النساء:۱۰۵)

(اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کرو۔

وقل امنت بما انزل اللہ من کتب وامرت لاعدل بینکم

(الشوریٰ:۱۵)

اور (اے نبیؐ) کہو کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا (النور:۵۱)

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔

واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول رایت المنافقین یصدون عنک صدودا (النساء:۶۱)

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ وہ تم سے کنی کتراتے ہیں۔

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (النساء:۶۵)

پس (اے نبیؐ) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی طرف سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ اسے بسروچشم قبول کرلیں۔

یہ تمام آیتیں اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ساختہ یا مسلمانوں کے مقرر کیے ہوئے جج نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے جج تھے۔ تیسری آیت یہ بتا رہی ہے کہ آپ کی جج ہونے کی حیثیت رسالت کی حیثیت سے الگ نہیں تھی بلکہ رسول ہی کی حیثیت میں آپ جج بھی تھے اور ایک مومن کا ایمان

بالرسالت اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ آپ کی اس حیثیت کے آگے بھی سمع و طاعت کا رویہ نہ اختیار کر لے۔ چوتھی آیت میں ما انزل اللہ (قرآن) اور رسول دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دو مستقل مرجع ہیں' ایک قرآن قانون کی حیثیت سے' دوسرے رسولؐ جج کی حیثیت سے' اور ان دونوں سے منہ موڑنا منافق کا کام ہے' نہ کہ مومن کا۔ آخری آیت میں بالکل بے لاگ طریقے سے کہہ دیا گیا ہے کہ رسولؐ کو جو شخص جج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا وہ مومن ہی نہیں ہے' حتیٰ کہ اگر رسولؐ کے دیئے ہوئے فیصلے پر کوئی شخص اپنے دل میں بھی تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ کیا قرآن کی ان تصریحات کے بعد بھی آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنحضورؐ رسول کی حیثیت سے قاضی نہ تھے بلکہ دنیا کے عام ججوں اور مجسٹریٹوں کی طرح آپؐ بھی ایک جج یا مجسٹریٹ تھے' اس لیے ان کے فیصلوں کی طرح حضورؐ کے فیصلے بھی ماخذ قانون نہیں بن سکتے؟ کیا دنیا کے کسی جج کی یہ حیثیت ہو سکتی ہے کہ اس کا فیصلہ اگر کوئی نہ مانے یا اس پر تنقید کرے یا اپنے دل میں بھی اسے غلط سمجھے تو اس کا ایمان سلب ہو جائے؟

رسولؐ بحیثیت حاکم و فرمانروا

قرآن مجید اسی صراحت اور تکرار کے ساتھ بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم و فرمانروا تھے' اور آپؐ کو یہ منصب بھی رسول ہی کی حیثیت سے عطا ہوا تھا:

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء:۶۴)

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا' مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن (Sanction) سے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء:۸۰)

جو رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ (الفتح:۱۰)

(اے نبیؐ) یقیناً جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

یایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم (محمد:۳۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرلو۔

وماکان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً (الاحزاب:۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسولؐ کردے تو پھر ان کے لیے اپنے اس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرلینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر (النساء:۵۹)

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں' پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو' اللہ اور روز آخر پر۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ رسول کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو' یا جسے لوگوں نے منتخب کرکے سربراہ بنایا ہو' بلکہ

وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی اس کے منصب رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اس کا حاکم مطاع ہونا ہے۔ اس کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں اہل ایمان کو (جن میں ظاہر ہے کہ پوری امت اور اس کے حکمران اور اس کے "مرکز ملت" سب شامل ہیں) قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کرچکا ہو' اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔

ان تمام تصریحات سے بڑھ کر صاف اور قطعی تصریح آخری آیت کرتی ہے جس میں یکے بعد دیگرے تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے:

سب سے پہلے اللہ کی اطاعت۔

اس کے بعد رسولؐ کی اطاعت۔

پھر تیسرے درجے میں اولی الامر (یعنی آپ کے "مرکز ملت") کی اطاعت۔

اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول اولی الامر میں شامل نہیں ہے" بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے۔ اور اس کا درجہ خدا کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع دو ہیں' ایک اللہ' دوسرا اس کے بعد اللہ کا رسولؐ۔ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسول کا الگ ذکر محض بے معنی ہوتا۔ پھر جبکہ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہد رسالت میں خود ذات رسولؐ کی طرف اور اس عہد کے بعد

سنت رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے۔ [1]

سنت کے ماخذ قانون ہونے پر امت کا اجماع

اب اگر آپ واقعی قرآن کو مانتے ہیں' اور اس کتاب مقدس کا نام لے کر خود اپنے من گھڑت نظریات کے معتقد بنے ہوئے نہیں ہیں' تو دیکھ لیجئے کہ قرآن مجید صاف و صریح اور قطعاً غیر مشتبہ الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا معلم' مربی' پیشوا' رہنما' شارح کلام اللہ' شارع (Law Giver) ' قاضی اور حاکم و فرمانروا قرار دے رہا ہے' اور حضورؐ کے یہ تمام مناصب اس کتاب پاک کی رو سے منصب رسالت کے اجزائے لاینفک ہیں۔ کلام الٰہی کی یہی تصریحات ہیں جن کی بنا پر صحابہ کرامؓ کے دور سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں نے بالاتفاق یہ مانا ہے کہ مذکورۂ بالا تمام حیثیات میں حضورؐ نے جو کام کیا ہے وہ قرآن کے بعد دوسرا ماخذ قانون (Source of Law) ہے جب تک کوئی شخص انتہائی برخود غلط نہ ہو' وہ اس پندار میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ تمام دنیا کے مسلمان اور ہر زمانے کے سارے مسلمان قرآن پاک کی ان آیات کو سمجھنے میں غلطی کر گئے ہیں اور ٹھیک مطلب بس اس نے سمجھا ہے کہ حضورؐ صرف قرآن پڑھ کر سنا دینے کی حد تک رسولؐ تھے' اور اس کے بعد آپؐ کی حیثیت ایک عام مسلمان کی تھی۔ آخر اس کے ہاتھ وہ کون سی نرالی لغت آ گئی ہے جس کی مدد سے قرآن کے الفاظ کا وہ مطلب اس نے سمجھا جو پوری امت کی سمجھ میں کبھی نہ آیا؟

---

[1] بلکہ اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود عہد رسالتؐ میں بھی بہت بڑی حد تک سنت رسولؐ ہی مرجع تھی۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت پورے جزیرۂ عرب پر پھیلی ہوئی تھی۔ دس بارہ لاکھ مربع میل کے اس وسیع و عریض ملک میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر معاملہ کا فیصلہ براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا جائے۔ لامحالہ اس زمانے میں بھی اسلامی حکومت کے گورنروں' قاضیوں اور دوسرے حکام کو معاملات کے فیصلے کرنے میں قرآن کے بعد جس دوسرے ماخذ قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا تھا' وہ سنت رسولؐ ہی تھی۔

۲۔ رسول پاکؐ کے تشریعی اختیارات

دوسرا نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

"لیکن اس بات پر آپ سے اتفاق نہیں ہے کہ ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے جو کچھ کیا تھا' یہ وہ سنت ہے جو قرآن کے ساتھ مل کر حاکم اعلیٰ کے قانون برتر کی تشکیل و تکمیل کرتی ہے۔ بے شک حضورؐ نے حاکم اعلیٰ کے قانون کے مطابق معاشرہ کی تشکیل تو فرمائی لیکن یہ کہ کتاب اللہ کا قانون (نعوذ باللہ) نامکمل تھا اور جو کچھ حضورؐ نے عملاً کیا اس سے اس قانون کی تکمیل ہوئی' میرے لیے ناقابل فہم ہے"۔

اسی سلسلے میں آگے چل کر آپ پھر فرماتے ہیں:

"نہ معلوم آپ کن وجوہات کی بنا پر کتاب اللہ کے قانون کو نامکمل قرار دیتے ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو یہ تصور بھی جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ کیا آپ قرآن کریم سے کوئی ایسی چیز فرمائیں گے جس سے معلوم ہو کہ قرآن کا قانون نامکمل ہے"۔

ان فقروں میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے' یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو علم قانون کے ایک مسلم قاعدے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آپ کو لاحق ہوئی ہے۔ دنیا بھر میں یہ قاعدہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قانون سازی کا اختیار اعلیٰ جس کو حاصل ہو وہ اگر ایک مجمل حکم دے کر یا ایک عمل کا حکم دے کر' یا ایک اصول طے کر کے اپنے ماتحت کسی شخص یا ادارے کو اس کی تفصیلات کے بارے میں قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے اختیارات تفویض کر دے تو اس کے مرتب کردہ قواعد و ضوابط قانون سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتے بلکہ اسی قانون کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ قانون ساز کا اپنا منشا یہ ہوتا ہے کہ جس عمل کا حکم بھی میں نے دیا ہے' ذیلی قواعد (-----------) بنا کر اس پر عمل درآمد کا طریقہ (Procedure) مقرر کر دیا جائے' جو اصول اس نے طے کیا ہے اس کے مطابق مفصل قوانین بنائے جائیں'

اور جو مجمل ہدایت اس نے دی ہے اس کے منشا کو تفصیلی شکل میں واضح کر دیا جائے۔ اسی غرض کے لیے وہ خود اپنے ماتحت شخص یا اشخاص یا اداروں کو قواعد و ضوابط مرتب کرنے کا مجاز کرتا ہے۔ یہ ذیلی قواعد بلاشبہ اصل ابتدائی قانون کے ساتھ مل کر اس کی تشکیل و تکمیل کرتے ہیں۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانون ساز نے غلطی سے ناقص قانون بنایا تھا' اور کسی دوسرے نے آکر اس کا نقص دور کیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قانون ساز نے اپنے قانون کا بنیادی حصہ خود بیان کیا اور تفصیلی حصہ اپنے مقرر کیے ہوئے ایک شخص یا ادارے کے ذریعہ سے مرتب کرا دیا۔

حضورؐ کے تشریعی کام کی نوعیت

اللہ تعالیٰ نے اپنی قانون سازی میں یہی قاعدہ استعمال فرمایا ہے۔ اس نے قرآن میں مجمل احکام اور ہدایات دے کر' یا کچھ اصول بیان کر کے' یا اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کر کے یہ کام اپنے رسولؐ کے سپرد کیا کہ وہ نہ صرف لفظی طور پر اس قانون کی تفصیلی شکل مرتب کریں بلکہ عملاً اسے برت کر اور اس کے مطابق کام کر کے بھی دکھا دیں۔ یہ تفویض اختیارات کا فرمان خود قانون کے متن (یعنی قرآن مجید) میں موجود ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم (النحل:۴۴)

اور (اے نبیؐ) ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کر دو اس تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس صریح فرمان تفویض کے بعد آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قولی اور عملی بیان' قرآن کے قانون سے الگ کوئی چیز ہے۔ یہ درحقیقت قرآن ہی کی رو سے اس کے قانون کا ایک حصہ ہے۔ اس کو چیلنج کرنے کے معنی خود قرآن کو اور خدا کے پروانہ تفویض کو چیلنج کرنے کے ہیں۔

اس تشریعی کام کی چند مثالیں

یہ اگرچہ آپ کے نکتے کا پورا جواب ہے' لیکن میں مزید تفہیم کی خاطر چند مثالیں دیتا ہوں جن سے آپ سمجھ سکیں گے کہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرح و بیان کے درمیان کس قسم کا تعلق ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا کہ وہ پاکیزگی کو پسند کرتا ہے۔ واللہ یحب المطھرین (التوبہ:۱۰۸) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی کہ اپنے لباس کو پاک رکھیں۔ وثیابک فطھر (المدثر:۴) حضورؐ نے اس منشا پر عمل درآمد کے لیے استنجا اور طہارت جسم و لباس کے متعلق مفصل ہدایات دیں اور ان پر خود عمل کر کے بتایا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اگر تم کو جنابت لاحق ہو گئی تو پاک ہوئے بغیر نماز نہ پڑھو (النساء:۴۳' المائدہ:۶)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ جنابت سے کیا مراد ہے۔ اس کا اطلاق کن حالتوں پر ہوتا ہے اور کن حالتوں پر نہیں ہوتا اور اس سے پاک ہونے کا طریقہ کیا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنا منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لو' سر پر مسح کرو اور پاؤں دھوؤ' یا ان پر مسح کرو' (المائدہ:۶) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ منہ دھونے کے حکم میں کلی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے۔ کان سر کا ایک حصہ ہیں اور سر کے ساتھ ان پر بھی مسح کرنا چاہیے۔ پاؤں میں موزے ہوں تو مسح کیا جائے اور موزے نہ ہوں تو ان کو دھونا چاہیے۔ اس کے ساتھ آپ نے تفصیل کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ وضو کن حالات میں ٹوٹ جاتا ہے اور کن حالات میں باقی رہتا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزہ رکھنے والا رات کو اس وقت تک کھا پی سکتا ہے جب تک فجر کے وقت کالا تاگا سفید تاگے سے ممیز نہ ہو جائے۔ (حتی یتبین الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر (البقرہ:۱۸۷)۔ نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اس سے مراد تاریکی شب کے مقابلہ میں سپیدۂ صبح کا نمایاں ہونا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اشیاء کے حرام اور بعض کے حلال ہونے کی تصریح کرنے کے بعد باقی اشیاء کے متعلق یہ عام ہدایت فرمائی کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کی گئی ہیں (المائدہ:۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے اس کی تفصیل بتائی کہ پاک چیزیں کیا ہیں جنہیں ہم کھا سکتے ہیں اور ناپاک چیزیں کون سی ہیں جن سے ہم کو بچنا چاہیے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وراثت کا قانون بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر میت کی نرینہ اولاد کوئی نہ ہو اور ایک لڑکی ہو تو وہ نصف ترکہ پائے گی اور .... زائد لڑکیاں ہوں تو ان کو ترکے کا دو تہائی حصہ ملے گا (النساء:۱۱)۔ اس میں یہ بات واضح نہ تھی کہ اگر دو لڑکیاں ہوں تو وہ کتنا حصہ پائیں گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے توضیح فرمائی کہ دو لڑکیوں کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا دو سے زائد لڑکیوں کا مقرر کیا گیا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا (النساء:۲۳)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

قرآن[۱] مردوں کو اجازت دیتا ہے کہ دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کر لیں (النساء:۳)۔ یہ الفاظ اس معاملہ میں قطعاً واضح نہیں ہیں کہ ایک مرد

---

[۱] یہ بات ارشاد فرماتے وقت ڈاکٹر صاحب اس امر واقعہ کو بھول گئے کہ حضورؐ نے پہلا کام تو نبوت کے دعوے کا کیا تھا۔ اس لحاظ سے اتباع سنت کا پہلا تقاضا یہ قرار پاتا ہے کہ نبوت کا دعویٰ کر ڈالا جائے۔

بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ حکم کے اس منشا کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور جن لوگوں کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں ان کو آپ نے حکم دیا کہ زائد بیویوں کو طلاق دے دیں۔

قرآن حج کی فرضیت کا عام حکم دیتا ہے اور یہ صراحت نہیں کرتا کہ اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے آیا ہر مسلمان کو ہر سال حج کرنا چاہئے یا عمر میں ایک بار کافی ہے' یا ایک سے زیادہ مرتبہ جانا چاہئے (آل عمران:۹۷)۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تشریح ہے جس سے ہم کو معلوم ہوا کہ عمر میں صرف ایک مرتبہ حج کر کے آدمی فریضہ حج سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔

قرآن سونے اور چاندی کے جمع کرنے پر سخت وعید فرماتا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۳۴ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے عموم میں اتنی گنجائش بھی نظر نہیں آتی کہ آپ روز مرہ کے خرچ سے زائد ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھ سکیں' یا آپ کے گھر کی خواتین کے پاس سونے یا چاندی کا ایک تار بھی زیور کے طور پر رہ سکے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں جنہوں نے بتایا کہ سونے اور چاندی کا نصاب کیا ہے اور بقدر نصاب یا اس سے زیادہ سونا چاندی رکھنے والا آدمی اگر اس پر ڈھائی فی صدی کے حساب سے زکوٰۃ ادا کر دے تو وہ قرآن مجید کی اس وعید کا مستحق نہیں رہتا)۔

ان چند مثالوں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ تشریعی اختیارات کو استعمال کر کے قرآن کے احکام و ہدایات اور اشارات و مضمرات کی کس طرح شرح و تفسیر فرمائی ہے۔ یہ چیز چونکہ خود قرآن میں دیئے ہوئے فرمان تفویض پر مبنی تھی اس لیے یہ قرآن سے الگ کوئی مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ قرآن کے قانون ہی کا ایک حصہ ہے۔

۳۔ سنت اور اتباع سنت کا مفہوم

تیسرا نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ سنت رسولؐ اللہ کا اتباع یہ ہے کہ جو

کام حضورؐ نے کیا' وہی ہم کریں' نہ یہ کہ جس طرح حضورؐ نے کیا اسی طرح ہم بھی کریں۔ اگر حضورؐ نے ماانزل اللہ کو دوسروں تک پہنچایا تو امت کا بھی فریضہ ہے کہ ماانزل اللہ کو دوسروں تک پہنچائے...."۔

سنت اور اس کے اتباع کا یہ مفہوم جو آپ نے متعین کیا ہے' اس کے متعلق میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ خود اس ماانزل اللہ کے مطابق نہیں ہے جس کے اتباع کو آپ واجب مانتے ہیں۔ ماانزل اللہ کی رو سے تو سنت کا اتباع یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے مقرر کئے ہوئے معلم' مربی' شارع' قاضی' حاکم و فرمانروا اور شارح قرآن ہونے کی حیثیت سے جو کچھ فرمایا اور عمل کر کے دکھایا ہے' اسے آپ سنت رسول' مانیں اور اس کا اتباع کریں۔ اس کے دلائل میں اوپر بیان کر چکا ہوں' اس لیے انھیں دہرانے کی حاجت نہیں ہے۔

اس سلسلے میں آپ نے مسواک والی بات جو لکھی ہے اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ سنجیدہ علمی مباحث میں اس قسم کی مہمل باتوں کو بطور نظیر لا کر کسی مسئلے کا تصفیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر نقطہ نظر کے حامیوں میں کچھ نہ کچھ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنی غیر معقول باتوں سے اپنے نقطہ نظر کو مضحکہ انگیز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی باتوں سے استدلال کرنے کے بجائے خود اس نقطہ نظر کی تردید کرنے کی کوشش اگر آپ کریں گے تو اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہ ہوں گے کہ وزنی دلائل کا مقابلہ کرنے سے پہلو تہی کر کے آپ صرف کمزور باتیں زور آزمائی کے لیے تلاش کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ کی یہ دلیل بھی بہت کمزور ہے کہ اتباع سنت کے معنی آج کے ایٹمی دور میں تیروں سے لڑنے کے ہیں۔ کیونکہ حضورؐ کے زمانے میں تیروں ہی سے جنگ کی جاتی تھی۔ آخر آپ سے کس نے کہا ہے کہ اتباع سنت کے معنی یہ ہیں؟ اتباع سنت کے یہ معنی اہل علم نے کبھی نہیں لیے ہیں کہ ہم جہاد میں وہی اسلحہ

استعمال کریں جو حضورؐ کے زمانہ میں استعمال ہوتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ اس کے معنی یہی سمجھے گئے ہیں کہ ہم جنگ میں ان مقاصد، ان اخلاقی اصولوں اور ان شرعی ضابطوں کو ملحوظ رکھیں جن کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے دی ہے، اور ان اغراض کے لیے لڑنے اور وہ کارروائیاں کرنے سے باز رہیں جن سے آپؐ نے منع فرمایا ہے۔

۴۔ رسول پاکؐ کس وحی کے اتباع پر مامور تھے اور ہم کس کے اتباع پر مامور ہیں؟

آپ کا چوتھا نکتہ آپ کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ:

"ان تمام اعمال میں جو حضورؐ نے ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں کیے۔ وہ اسی ما انزل اللہ کا، جو کتاب اللہ میں موجود ہے، اتباع کرتے تھے اور امت کو بھی یہی حکم ملا کہ اسی کا اتباع کرے۔ جہاں اتبعوا ما انزل اللہ الیکم من ربکم (۷:۳) کہہ کر امت کے افراد کو تلقین کی وہاں یہ بھی اعلان ہوا کہ حضورؐ بھی اسی کا اتباع کرتے ہیں۔ قل اتبع ما یوحیٰ الی عن ربی (۷:۲۳)"

اس عبارت میں آپ نے دو آیتیں نقل کی ہیں اور دونوں نہ صرف یہ کہ غلط نقل کی ہیں، بلکہ نقل میں بھی ایسی غلطیاں کی ہیں جو عربی زبان کی شدبد کا علم رکھنے والا بھی نہیں کر سکتا۔ پہلی آیت دراصل یہ ہے اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم "یعنی پیروی کرو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے"۔ آپ کے نقل کردہ الفاظ کا ترجمہ یہ ہو گا کہ "پیروی کرو اس کی جو اللہ نے تمہارے رب کی جانب سے نازل کیا ہے"۔ دوسری آیت کے اصل الفاظ قرآن مجید میں یہ ہیں قل انما اتباع ما یوحیٰ الی من ربی (۷:۲۰۳) "کہو کہ میں تو اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی جانب سے بھیجی جاتی ہے"۔ آپ نے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے: "کہو کہ پیروی کر اس

وحی کی جو میری طرف میرے رب کی جانب سے بھیجی جاتی ہے"۔ میں نے ان غلطیوں پر آپ کو صرف اس لیے متنبہ کیا ہے کہ آپ کسی وقت ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ایک طرف قرآن سے آپ کی واقفیت کا یہ حال ہے اور دوسری طرف آپ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ساری امت کے اہل علم و تحقیق قرآن کو غلط سمجھے ہیں اور آپ نے اس کو صحیح سمجھا ہے۔

اب رہا اصل مسئلہ' تو اس میں آپ نے دو باتیں کہی ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ ایک بات آپ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی آتی تھی جو قرآن میں موجود ہے اور حضورؐ کو صرف اسی کی پیروی کا حکم تھا۔ حالانکہ خود قرآن سے یہ ثابت ہے کہ حضورؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے اور آپ ان دونوں قسم کی وحیوں کا اتباع کرنے پر مامور تھے۔[۱] دوسری بات آپ یہ فرماتے ہیں کہ امت کو صرف قرآن کی پیروی کا حکم ہے حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ امت کو رسول پاکؐ کی پیروی کا حکم بھی ہے:

۱۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران:۳۱) "اے نبی کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو' اللہ تم سے محبت فرمائے گا"۔

۲۔ ورحمتی وسعت کل شئی فساکتبھا للذین یتقون ویوتون الزکوۃ والذین ھم بایتنا یومنون الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التورٰۃ والانجیل (الاعراف:۱۵۶۔۱۵۷) "میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اس رحمت کو میں ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو تقویٰ کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں' جو پیروی کرتے ہیں اس

۱۔ اس کا ثبوت آخری سوال کے جواب میں پیش کیا جا رہا ہے۔

رسول نبی امی کی جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

۳۔ وما جعلنا القبلة التی کنت علیھا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علٰی عقبیہ (البقرۃ:۱۴۳) "اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے اسی لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔

ان آیات میں رسول کی پیروی کرنے کے حکم کو تاویل کے خراد پر چڑھا کر یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ اس سے مراد دراصل قرآن کی پیروی ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' اگر واقعی مقصود یہی ہوتا کہ لوگ رسول کی نہیں بلکہ قرآن کی پیروی کریں تو آخر کیا وجہ ہے کہ آیت نمبر ۱ میں اللہ تعالیٰ نے فاتبعوا کتاب اللہ کہنے کے بجائے فاتبعونی کے الفاظ استعمال فرمائے؟ کیا آپ کی رائے میں یہاں اللہ میاں سے چوک ہو گئی ہے؟

پھر آیت نمبر ۲ میں تو اس تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اس میں آیات خداوندی پر ایمان لانے کا ذکر الگ ہے اور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا ذکر الگ۔

ان سب سے زیادہ کھلی ہوئی آیت نمبر ۳ ہے جو ایسی ہر تاویل کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور ساتھ ساتھ آپ کے اس مفروضے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی۔ مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا' اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا ہے۔ اگر آیا ہو تو آپ اس کا حوالہ دے دیں۔ یہ واقعہ ناقابل انکار ہے کہ وہ قبلہ آغاز اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا اور تقریباً ۱۴ سال تک اسی کی طرف حضورؐ اور صحابہ کرامؓ نماز ادا کرتے رہے۔ ۱۴ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی اس آیت میں حضورؐ کے اس فعل کی توثیق فرمائی'

اور یہ اعلان فرمایا کہ یہ قبلہ ہمارا مقرر کیا ہوا تھا اور اسے ہم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اس لیے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے منہ موڑتا ہے۔ یہ ایک طرف اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہی آیت پوری صراحت کے ساتھ یہ بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام کا اتباع کرنے پر بھی مامور ہیں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں' حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالت کی آزمائش ہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسولؐ کے ذریعہ سے جو حکم دیا جائے' اسے وہ مانتے ہیں یا نہیں؟ اب آپ اور آپ کے ہم خیال حضرات خود سوچ لیں کہ اپنے آپ کو کس خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں واقعی خدا کا اتنا خوف ہے کہ اس کی ہدایت کے خلاف طرز عمل کا تصور کرنے سے بھی آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے تو میری گزارش ہے کہ بحث و مناظرہ کے جذبے سے اپنے ذہن کو پاک کر کے اوپر کی چند سطروں کو مکرر پڑھیں۔ خدا کرے کہ آپ کے جسم پر کپکپی طاری ہو اور آپ اس گمراہی سے بچ نکلیں جس میں محض اپنے ناقص مطالعے کی وجہ سے پڑ گئے ہیں۔

۵۔ مرکز ملت

پانچواں نکتہ آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں:

"چونکہ دین کا تقاضا یہ تھا کہ کتاب پر عمل اجتماعی شکل میں ہو' اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص قرآن پر اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرے اور دوسرا اپنی سمجھ کے مطابق' اس لیے نظام کو قائم رکھنے کے لیے ایک زندہ شخصیت کی ضرورت ہے اور مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ جہاں اجتماعی نظام کے قیام کا سوال ہو' وہاں پہنچانے والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے' کیونکہ پیغام اس نے اس لیے پہنچایا کہ وحی اس کے سوا

کسی اور کو نہیں ملتی' چنانچہ قرآن نے اسی لیے واضح کر دیا کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ چنانچہ حضورؐ مرکز ملت بھی تھے اور سنت رسول اللہ پر عمل یہی ہے کہ حضورؐ کے بعد بھی اسی طرح مرکزیت کو قائم رکھا جائے' چنانچہ اسی نکتہ کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ وما محمداً الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علٰی اعقابکم۔[1] (۳:۱۴۴)"۔

اس نکتہ کو آپ نے اچھی طرح کھول کر بیان نہیں فرمایا ہے۔ آپ کے مجموعی اشارات کی مدد سے آپ کا جو مدعا سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض اجتماعی نظام قائم کرنے کی خاطر اپنے زمانے میں رسول کے علاوہ "مرکز ملت" بھی بنائے گئے تھے۔ آپؐ کی رسول ہونے کی حیثیت تو دائمی تھی' مگر "مرکز ملت" ہونے کی حیثیت صرف اس وقت تک تھی جب تک آپؐ کی زندہ شخصیت نظام جماعت چلا رہی تھی۔ پھر جب آپ کی وفات ہو گئی تو آپؐ کے بعد جس زندہ شخصیت کو نظام قائم رکھنے کے لیے سربراہ بنایا گیا اور اب بنایا جائے وہ اپنے زمانے کے لیے ویسا ہی "مرکز ملت" تھا اور ہو گا جیسے حضورؐ اپنے زمانے کے لیے تھے۔ اب سنت رسولؐ کی پیروی بس یہی ہے کہ ہم نظام قائم رکھنے کے لیے یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ "مرکز ملت" قائم کرتے رہیں۔ اس معاملہ میں بعد کے مرکزان ملت پر اگر حضورؐ کو کوئی فوقیت ہے تو صرف یہ کہ قرآن پہنچانے والے کی حیثیت سے آپؐ کا مقام بہت آگے ہے۔

چند اصولی سوالات

آپ کے کلام کی یہ تفسیر جو میں نے کی ہے' یہ اگر صحیح نہیں ہے تو آپ صحیح

---

[1] یہاں بھی آیت نقل کرنے میں غلطیاں کی گئی ہیں۔ وما محمداً نہیں بلکہ وما محمد ہے۔ اور من قبلہ الرسل نہیں بلکہ من قبلہ الرسل ہے۔

فرما دیں۔ صاحب کلام ہونے کی حیثیت سے آپ کی اپنی تفسیر صحیح تر ہو گی۔ لیکن اگر میں نے آپ کا مطلب ٹھیک سمجھا ہے' تو اس پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

اول یہ کہ "مرکز ملت" سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی کتاب پہنچانے والے ہیں۔ اس کتاب کی تشریح و توضیح کرنے والے ہیں' اس کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھانے والے ہیں' افراد اور جماعت کا تزکیہ کرنے والے ہیں' مسلمانوں کے لیے نمونہ تقلید ہیں' وہ رہنما ہیں جس کی پیروی خدا کے حکم سے واجب ہے' امر و نہی اور تحلیل و تحریم کے اختیارات رکھنے والے شارع (Law Giver) ہیں' قاضی ہیں' اور حاکم مطاع ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ تمام مناصب حضورؐ کو رسول ہونے کی حیثیت سے حاصل تھے اور منصب رسالت پر آپؐ کے مامور ہونے کا مطلب ہی یہ تھا کہ آپ ان مناصب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیے گئے۔ اس باب میں قرآن کے واضح ارشادات میں پہلے نقل کر چکا ہوں جنہیں دہرانے کی حاجت نہیں۔ اب چونکہ "مرکز ملت" قرآن کی نہیں بلکہ آپ لوگوں کی اپنی بنائی ہوئی اصطلاح ہے' اس لیے براہ کرم آپ یہ بتائیں کہ "مرکز ملت" کا منصب ان مناصب کے ماسوا کچھ ہے؟ یا انہی مناصب کا مجموعہ ہے؟ یا ان میں سے بعض مناصب اس میں شامل ہیں اور بعض نہیں ہیں؟ اگر وہ ان کے ماسوا کچھ ہے تو وہ کیا ہے اور حضورؐ کے اس منصب کا علم آپ کو کس ذریعہ سے حاصل ہوا ہے؟ اگر وہ انہی مناصب کا مجموعہ ہے تو آپ اس کو رسالت سے الگ کیسے قرار دیتے ہیں؟ اور اگر ان میں سے بعض مناصب "مرکز ملت" کے ہیں اور بعض منصب رسالت کے تو وہ کون کون سے مناصب ہیں جو مرکز ملت کے منصب میں شامل ہیں اور ان کو کس دلیل سے آپ منصب رسالت سے الگ کرتے ہیں؟

دوسرا سوال "مرکز ملت" کے تقرر کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تقرر کی تین ہی

صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے مرکز ملت مقرر کرے۔ دوسری یہ کہ مسلمان اپنی مرضی سے اس کو منتخب کریں۔ تیسری یہ کہ وہ طاقت سے مسلط ہو کر زبردستی مرکز ملت بن جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ "مرکز ملت" سے خواہ کچھ بھی مراد ہو' اس منصب پر حضورؐ کا تقرر ان تینوں صورتوں میں سے آخر کس صورت پر ہوا تھا؟ کیا یہ تقرر اللہ نے کیا تھا؟ یا مسلمانوں نے آپ کو اس منصب کے لیے منتخب کیا تھا؟ یا حضورؐ خود "مرکز ملت" بن گئے تھے؟ ان میں سے جو شق بھی آپ اختیار کرتے ہیں اس کی تصریح ہونی چاہیے۔ اور اسی طرح یہ تصریح بھی ہونی چاہیے کہ حضورؐ کے بعد جو بھی "مرکز ملت" بنے گا وہ خداوند عالم کی طرف سے نامزد اور مامور کیا ہوا ہو گا؟ یا مسلمان اس کو مرکز بنائیں گے؟ یا وہ خود اپنے زور سے مرکز بن جائے گا؟ اگر دونوں کے طریق تقرر میں آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے تو صاف صاف یہ بات کہہ دیجئے تاکہ آپ کا موقف مبہم نہ رہے۔ اور اگر فرق ہے تو بتایئے کہ وہ کیا فرق ہے اور اس فرق سے دونوں قسم کے مرکزوں کی حیثیت اور اختیارات میں بھی کوئی بنیادی فرق واقع ہوتا ہے یا نہیں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ "پہنچانے والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے" فرما کر آپ نے ازراہ کرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے "مرکزان ملت" پر جو فوقیت عطا فرمائی ہے یہ محض درجے اور مرتبے کی فوقیت ہے یا آپ کے نزدیک دونوں کے منصبوں کی نوعیت میں بھی کوئی فرق ہے؟ زیادہ واضح الفاظ میں' میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا آپ کے خیال میں وہ سب اختیارات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مرکز ملت" کی حیثیت سے حاصل تھے' آپ کے بعد "مرکز ملت" بننے والے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں؟ اور کیا باعتبار اختیارات دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور کیا دوسروں پر حضورؐ کی فوقیت بس اتنی ہی ہے کہ آپ بعد والے مرکز کی بہ نسبت کچھ زیادہ احترام کے مستحق ہیں کیونکہ آپؐ نے قرآن پہنچایا ہے؟

اگر یہ آپ کا خیال ہے تو بتایئے کہ حضورؐ کے بعد بننے والے یا بنائے جانے والے مرکز کی حیثیت بھی کیا یہی ہے کہ اس کے فیصلے سے سرتابی کرنا تو درکنار' اس کے خلاف دل میں تنگی محسوس کرنے سے بھی آدمی کا ایمان سلب ہو جائے؟ کیا اس کی حیثیت بھی یہی ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں اپنا فیصلہ دے دے تو مسلمانوں کو اس سے مختلف کوئی رائے رکھنے کا حق باقی نہ رہے؟ کیا اس کا مقام بھی یہی ہے کہ اس کے ساتھ مسلمان کوئی نزاع نہیں کر سکتے اور اس کے فرمان کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے کے سوا امت کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اگر وہ مومن رہنا چاہتی ہو؟ کیا وہ زندہ شخصیت یا شخصیتیں جو "مرکز ملت" بنیں یا بنائی جائیں' اسوۂ حسنہ بھی ہیں کہ مسلمان ان کی زندگیوں کو دیکھیں اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو بھی ان کے مطابق ڈھالتے چلے جائیں؟ کیا وہ بھی ہمارے تزکیے اور تعلیم کتاب و حکمت اور تشریح ما انزل اللہ کے لیے "مبعوث" ہوئے ہیں کہ مستند ہو ان کا فرمایا ہوا؟"

کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ان سوالات پر ذرا تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں تاکہ اس "مرکز ملت" کی ٹھیک پوزیشن سب کے سامنے آ جائے جس کا ہم بہت دنوں سے چرچا سن رہے ہیں۔

۶۔ کیا حضورؐ صرف قرآن پہنچانے کی حد تک نبی تھے؟

آپ کا چھٹا نکتہ آپ کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

"آپ کا اگلا سوال یہ ہے کہ جو کام حضورؐ نے ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں سرانجام دیئے ان میں آنحضرتؐ کی پوزیشن کیا تھی؟ میرا جواب یہ ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ کر کے دکھایا' وہ ایک بشر کی حیثیت سے لیکن ما انزل اللہ کے مطابق کر کے دکھایا۔ میرا یہ جواب کہ حضورؐ کے فرائض رسالت کی سرانجام دہی ایک بشر کی حیثیت سے تھی' میرے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خود کتاب اللہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے' حضورؐ نے بار

بار اس بات پر زور دیا کہ انا بشر مثلکم"۔

اس عبارت میں آپ نے میرے جس سوال کا جواب دیا ہے وہ دراصل یہ تھا کہ اس پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے قرآن پہنچانے کے سوا دوسرے جو کام کیے تھے وہ آیا نبی ہونے کی حیثیت میں کیے تھے جن میں آپ قرآن مجید کی طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے' یا ان کاموں میں آپ کی حیثیت محض ایک عام مسلمان کی سی تھی؟ اس کا جواب آپ یہ دیتے ہیں کہ یہ کام حضورؐ نے بشر کی حیثیت سے کیے تھے لیکن ما انزل اللہ کے مطابق کیے تھے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن پہنچا دینے کی حد تک نبی تھے' اس کے بعد ایک قائد و رہنما' ایک معلم' ایک مربی' ایک مقنن' ایک جج اور ایک فرمانروا ہونے کی حیثیت میں آپؐ نے جو کچھ بھی کیا اس میں آپؐ کا مقام ایک نبی کا نہیں بلکہ ایک ایسے انسان کا تھا جو قرآن کے مطابق عمل کرتا۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن نے حضورؐ کی یہی حیثیت بیان کی ہے لیکن اس سے پہلے قرآن کی جو صریح آیات میں نے نقل کی ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کوئی ذی فہم آدمی یہ نہیں مان سکتا کہ قرآن نے واقعی حضورؐ کو یہ حیثیت دی ہے۔

آپ قرآن سے یہ ادھوری بات نقل کر رہے ہیں کہ حضورؐ بار بار انا بشر مثلکم فرماتے تھے۔ پوری بات جو قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے بشر ہیں جسے رسول بنایا گیا ہے۔ (قل سبحان ربی هل کنت الا بشراً رسولاً) اور حضورؐ ایک ایسے بشر ہیں جس پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے (قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی) کیا آپؐ ایک عام بشر اور رسالت و وحی پانے والے بشر کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں سمجھتے؟ جو بشر خدا کا رسول ہو وہ تو لامحالہ خدا کا نمائندہ ہے' اور جس بشر کے پاس وحی آتی ہو وہ خدا کی براہ راست ہدایت کے تحت کام کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اور ایک عام بشر کی حیثیت یکساں کیسے ہو سکتی ہے۔

اسی طرح سورۂ تحریم میں تادیب آگئی یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک (۶۶:۱) اسی طرح سورۂ عبس میں ہے عبس وتولی ان جاءہ الاعمٰی وما یدریک لعلہ یزکی او یذکر فتنفعہ الذکر اما من استغنٰی فانت لہ تصدی وما علیک الا ینزکی ا۔ واما من جاءک یسعٰی وھو یخشٰی فانت عنہ تلھی (۸۰:۱تا۱۰)

یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ کس قدر سرسری مطالعہ کی بنا پر لوگ کتنے بڑے اور نازک مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے اپنی طرف سے ایک رسول بھی بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے اور اسے غلط کار و گمراہ ثابت کرنے کے لیے یہ آیات بھی قرآن میں نازل کر دیں تاکہ کہیں لوگ اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرنے لگیں؟ کاش آپ نے قرآن کا آپریشن کرنے سے پہلے ان آیات پر اتنا ہی غور کر لیا ہوتا جتنا اپنے کسی مریض کی ایکسرے رپورٹ پر غور کرتے ہیں۔

پہلی آیت قل ان ضللت سے آپ یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ خود قرآن کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی گمراہ بھی ہو جاتے تھے اور آپ کی زندگی دراصل ضلالت و ہدایت کا مجموعہ تھی (معاذ اللہ)۔ یہ استدلال کرتے وقت آپ نے کچھ نہ دیکھا کہ یہ آیت کس سیاق و سباق میں آئی ہے۔ سورۂ سبا میں اللہ تعالٰی پہلے کفار مکہ کا یہ الزام نقل فرماتا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے: افتری علی اللہ کذبا ام بہ جنۃ (آیت ۸) "یہ شخص یا تو اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے' یا یہ مجنون ہے"۔ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے آیات ۴۶ تا ۵۰ میں الزام نمبر ۲ کے متعلق فرماتا ہے کہ تم لوگ فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خالصتاً للہ غور کرو' تمہارا دل خود گواہی دے گا کہ یہ شخص جو تمہیں اسلام کی تعلیم دے رہا ہے' اس

ا۔ قرآن میں یزکی ہے نہ کہ ینزکی

آپ جب یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ ماانزل اللہ کے مطابق کام کرتے تھے تو آپ کا مطلب ماانزل اللہ سے صرف قرآن ہوتا ہے۔ اس لیے آپ لفظاً ایک حق بات کر معنی ایک باطل بات کہتے ہیں۔ بلاشبہ حضورؐ ماانزل اللہ کے مطابق کام کرتے تھے، مگر آپ کے اوپر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں پائی جاتی ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی آپ کو وحی کے ذریعہ سے احکام ملتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت میں آپ کے چوتھے نکتے کا جواب دیتے ہوئے پیش کر چکا ہوں۔ مزید ثبوت انشاء اللہ آپ کے دسویں نکتے کی بحث میں دوں گا۔

۷۔ حضورؐ کی اجتہادی لغزشوں سے غلط استدلال

ساتواں نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

"قرآن کی آیات سے واضح ہے کہ حضورؐ نظام مملکت کی سرانجام دہی میں ایک بشر کی حیثیت رکھتے تھے اور کبھی کبھی آنحضرتؐ سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھی۔ قل ان ضللت فانما اضل علی نفسی وان اهتديت فبما يوحى[۱] الی ربی انه سميع قريب[۲]۔ (۵۰:۳۰) اگر یہ اجتہادی غلطیاں ایسی ہوتیں جن کا اثر دین کے اہم گوشے پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اس کی تادیب بھی آجاتی جیسے کہ ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہنے کی اجازت چاہی اور حضورؐ نے دے دی۔ اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی عفا الله عنك لما اذنت[۳]۔ لهم حتى يتبين لك الذين صدقوا وتعلم الكاذبين[۴]۔ (۴۳:۹)

۱۔ صحیح لفظ یوحی ہے نہ کہ یوحی

۲۔ حوالہ غلط ہے۔ یہ سورۂ روم کی نہیں بلکہ سورہ سبا کی آیت ہے جس کا نمبر ۵۰ ہے۔

۳۔ یہ الفاظ بھی غلط نقل کیے گئے ہیں۔ صحیح لم اذنت لهم ہے۔

۴۔ صحیح لفظ یاایھا النبی ہے نہ کہ یاایھا النبی

میں جنون کی کوئی بات نہیں۔ اس کے بعد ان کے پہلے الزام (یعنی "یہ شخص اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے") کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ اے نبیؐ ان سے کہو، ان ربی یقذف بالحق درحقیقت یہ سچا کلام میرا رب القا فرما رہا ہے۔ ان ضللت فانما اضل علیٰ نفسی اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں (جیسا کہ تم الزام لگا رہے ہو) تو میری اس گمراہی کا وبال مجھ پر ہے۔ وان اھتدیت فبما یوحی الی ربی۔ اور اگر میں راہ راست پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں جو میرا رب مجھ پر نازل کرتا ہے۔ انہ سمیع قریب وہ سب کچھ سننے والا اور قریب ہے۔ یعنی اس سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں گمراہ ہوں یا اس کی طرف سے ہدایت یافتہ۔ اس سیاق و سباق میں جو بات کہی گئی ہے اس کا آپ یہ مطلب لے رہے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے سامنے اپنے رسول سے یہ اعتراف کروا دیا کہ واقعی میں کبھی گمراہ بھی ہو جاتا ہوں، مگر کبھی سیدھے راستے پر بھی چل لیتا ہوں۔ سبحان اللہ، کیا خوب قرآن فہمی ہے۔

دوسری آیات جو آپ نے پیش فرمائی ہیں ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطور نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ حالانکہ دراصل ان سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی، اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے، کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔

پھر آپ نے کچھ تو سوچا ہوتا کہ وہ لغزشیں ہیں کیا جن پر اللہ نے ان آیات میں اپنے نبی کو ٹوکا ہے۔ جنگ میں فوجی خدمت سے استثناء کی درخواست پر کسی کو

مستثنیٰ کر دینا' کسی حلال چیز کو نہ کھانے کا عہد کر لینا' ایک صحبت میں چند اہم شخصیتوں کو دین کی دعوت دیتے ہوئے بظاہر ایک غیر اہم شخصیت کی طرف توجہ نہ کرنا' کیا یہ ایسے ہی بڑے معاملات ہیں' جن کا دین کے اہم گوشوں پر اثر پڑتا ہے؟ کون سا ایسا لیڈر' یا فرمانروا' یا آپ کی اصطلاح خاص میں "مرکز ملت" ہے جس کی زندگی میں بارہا اس طرح کے' بلکہ اس سے بہت زیادہ بڑے معاملات نہ پیش آتے ہوں؟ پھر کیا ان لغزشوں کی تصحیح کے لیے ہمیشہ آسمان ہی سے وحی اترا کرتی ہے؟ آخر وہ کیا خاص وجہ ہے کہ اتنی معمولی لغزشیں جب رسول پاکؐ سے صادر ہوئیں تو فوراً ان کی اصلاح کے لیے وحی آ گئی اور اسے کتاب میں ثبت کر دیا گیا؟ آپ اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ رسالت کے منصب کو سمجھنے میں آپ نے کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ کوئی رئیس' یا لیڈر یا مرکز ملت اللہ تعالیٰ کا نمائندہ نہیں ہوتا' اس کا مقرر کیا ہوا شارح (Law Giver) اور اس کا مامور کیا ہوا نمونہ تقلید نہیں ہوتا' اس لیے اس کی کوئی بڑی سے بڑی غلطی بھی قانون اسلامی پر اثرانداز نہیں ہو سکتی' کیونکہ اس سے خدا کی شریعت کے اصول نہیں بدل سکتے۔ لیکن رسول پاکؐ چونکہ خدا کے اپنے اعلان کی رو سے دنیا کے سامنے مرضیات الٰہی کی نمائندگی کرتے تھے اور خدا نے خود اہل ایمان کو حکم دیا تھا کہ تم ان کی اطاعت اور ان کا اتباع کرو' جو کچھ یہ حلال کہیں اسے حلال مانو اور جو کچھ یہ حرام قرار دے دیں' اسے حرام مان لو' اس لیے ان کے قول و عمل میں یہ چھوٹی لغزشیں بھی بہت بڑی تھیں' کیونکہ وہ ایک معمولی بشر کی لغزشیں نہ تھیں' بلکہ اس شارع مجاز کی لغزشیں تھیں جس کی ایک ایک حرکت اور سکون سے قانون بن رہا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمے لی تھی کہ اپنے رسول کو ٹھیک راستے پر قائم رکھے گا' ان کو غلطیوں سے محفوظ کر دے گا' اور ان سے ذرا سی چوک بھی ہو جائے تو وحی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرما دے گا۔

۸۔ موہوم خطرات

آٹھویں نکتے میں آپ فرماتے ہیں کہ اگر حضورؐ نے یہ سارا کام بشر (یعنی ایک عام غیر معصوم بشر) کی حیثیت سے نہیں بلکہ نبی کی حیثیت سے کیا ہوتا تو اس سے لازماً دو نتائج پیدا ہوتے۔ ایک یہ کہ حضورؐ کے بعد اس کام کو جاری رکھنا غیر ممکن تصور کیا جاتا اور لوگ سمجھتے کہ جو نظام زندگی حضورؐ نے قائم کر کے چلا دیا اسے قائم کرنا اور چلانا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ دوسرا نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اس کام کو چلانے کے لیے لوگ حضورؐ کے بعد بھی نبیوں کے آنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ ان دونوں خطرات سے بچنے کی واحد صورت آپ کے نزدیک یہ ہے کہ تبلیغ قرآن کے ماسوا حضورؐ کے باقی پورے کارنامہ زندگی کو رسول اللہؐ کا نہیں بلکہ ایک غیر نبی انسان کا کارنامہ مانا جائے۔ اسی سلسلے میں آپ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اسے رسول کا کارنامہ سمجھنا ختم نبوت کے عقیدے کی بھی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ اگر حضورؐ نے یہ سارا کام وحی کی رہنمائی میں کیا ہے تو پھر ویسا ہی کام کرنے کے لیے ہمیشہ وحی آنے کی ضرورت رہے گی، ورنہ دین قائم نہ ہو گا۔

یہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، قرآن اور اس کے نزول کی تاریخ سے آنکھیں بند کر کے اپنے ہی مفروضات کی دنیا میں گھوم پھر کر سوچا اور فرما دیا ہے۔ آپ کی ان باتوں سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ سے قرآن کی بس وہی آیتیں گزری ہیں جو مخالفین سنت نے اپنے لٹریچر میں ایک مخصوص نظریہ ثابت کرنے کے لیے نقل کی ہیں اور انہی کو ایک خاص ترتیب سے جوڑ جاڑ کر ان لوگوں نے جو نتائج نکال لیے ہیں، ان پر آپ ایمان لے آئے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور آپ نے ایک مرتبہ بھی پورا قرآن سمجھ کر پڑھا ہوتا تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ جو خطرات آپ کے نزدیک سیرت پاک کو سنت رسولؐ ماننے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، وہی سب خطرات قرآن کو وحی الٰہی ماننے سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن خود اس بات پر شاہد ہے کہ یہ پوری کتاب ایک ہی وقت میں بطور ایک کتاب آئین کے نازل نہیں

ہو گئی تھی بلکہ یہ ان وحیوں کا مجموعہ ہے جو ایک تحریک کی رہنمائی کے لیے ۲۳ سال تک تحریک کے ہر مرحلے میں ہر اہم موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ایک برگزیدہ انسان اسلامی تحریک کی قیادت کے لیے مبعوث ہوا ہے اور قدم قدم پر خدا کی وحی اس کی رہنمائی کر رہی ہے۔ مخالفین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور جواب ان کا آسمان سے آتا ہے۔ طرح طرح کی مزاحمتیں راستے میں حائل ہوتی ہیں اور تدبیر اوپر سے بتائی جاتی ہے کہ یہ مزاحمت اس طرح سے دور کرو اور اس مخالفت کا یوں مقابلہ کرو۔ پیروؤں کو طرح طرح کی مشکلات سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کا حل اوپر سے بتایا جاتا ہے کہ تمہاری فلاں مشکل یوں دور ہو سکتی ہے اور فلاں مشکل یوں رفع ہو سکتی ہے۔ پھر یہ تحریک جب ترقی کرتے ہوئے ایک ریاست کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو جدید معاشرے کی تشکیل اور ریاست کی تعمیر کے مسائل سے لے کر منافقین اور یہود اور کفار عرب سے کشمکش تک جتنے معاملات بھی دس سال کی مدت میں پیش آتے ہیں' ان سب میں وحی اس معاشرے کے معمار اور اس ریاست کے فرمانروا اور اس فوج کے سپہ سالار کی رہنمائی کرتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس تعمیر اور کشمکش کے ہر مرحلے میں جو مسائل پیش آتے ہیں ان کو حل کرنے کے لیے آسمان سے ہدایات آتی ہیں بلکہ کوئی جنگ پیش آتی ہے تو اس پر لوگوں کو ابھارنے کے لیے سپہ سالار کو خطبہ آسمان سے ملتا ہے۔ تحریک کے کارکن کہیں کمزوری دکھاتے ہیں تو ان کی فہمائش کے لیے تقریر آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ نبی کی بیوی پر دشمن تہمت رکھتے ہیں تو اس کی صفائی آسمان سے آتی ہے۔ منافقین مسجد ضرار بناتے ہیں تو اس کے توڑنے کا حکم وحی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ جنگ پر جانے سے جی چراتے ہیں تو ان کے معاملہ کا فیصلہ براہ راست اللہ تعالیٰ کر کے بھیجتا ہے۔ کوئی شخص دشمن کو جاسوسی کا خط لکھ کر بھیجتا ہے تو اس سے نمٹنے کے لیے بھی اللہ میاں خود توجہ فرماتا ہے۔

اگر واقعی آپ کے نزدیک یہ بات مایوس کن ہے کہ دین کو قائم کرنے کے لیے جو اولین تحریک اٹھے اس کی رہنمائی وحی کے ذریعہ سے ہو تو یہ مایوسی کا سبب تو خود قرآن میں موجود ہے۔ ایک شخص آپ کا نقطہ نظر اختیار کرنے کے بعد تو کہہ سکتا ہے کہ جس دین کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد کے پہلے قدم سے لے کر کامیابی کی آخری منزل تک ہر ضرورت اور ہر نازک موقع پر قائد تحریک کی رہنمائی کے لیے خدا کی آیات اترتی رہی ہوں اسے اب کیسے قائم کیا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ اسی طرح نظام دین کے قیام کے لیے سعی و جہد کرنے والے "مرکز ملت" کی مدد کے لیے بھی آیات الٰہی نازل ہونے کا سلسلہ نہ شروع ہو۔ اس نقطہ نظر سے تو اللہ میاں کے لیے صحیح طریق کار یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقرر کی پہلی تاریخ کو ایک مکمل کتاب آئین آپ کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہیں جس میں اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کے مسائل کے متعلق اپنی تمام ہدایات بیک وقت آپ کو دے دیتا۔ پھر ختم نبوت کا اعلان کر کے فوراً ہی حضورؐ کی اپنی نبوت بھی ختم کر دی جاتی۔ اس کے بعد یہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نہیں بلکہ محمد بن عبداللہ کا کام تھا کہ غیر نبی ہونے کی حیثیت سے اس کتاب آئین کو لے کر جدوجہد کرتے اور ما انزل اللّٰہ کے مطابق ایک معاشرہ اور ریاست قائم کر دکھاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں کو بروقت صحیح مشورہ نہ مل سکا اور وہ اپنا نامناسب طریقہ اختیار کر گئے جو مستقبل میں قیام دین کے امکان سے ہمیشہ کے لیے مایوس کر دینے والا تھا! غضب تو یہ ہے کہ وہ اس مصلحت کو اس وقت بھی نہ سمجھے جب انہوں نے ختم نبوت کا اعلان فرمایا۔ یہ اعلان سورۂ احزاب میں کیا گیا ہے جو اس زمانہ سے متصل نازل ہوئی ہے جبکہ حضرت زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی اور پھر ان کی مطلقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی نکاح کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد کئی سال تک حضورؐ "مرکز ملت" رہے اور ختم نبوت کا اعلان ہو جانے کے باوجود نہ حضورؐ کی نبوت ختم کی گئی اور نہ وحی کے ذریعہ سے آپ کی رہنمائی کرنے کا سلسلہ بند کیا گیا!

آپ کو اللہ میاں کی اسکیم سے اتفاق ہو یا اختلاف، بہرحال قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ان کی اسکیم ابتداء ہی سے یہ نہیں تھی کہ نوع انسانی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھما دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اس کو دیکھ دیکھ کر اسلامی نظام زندگی خود بنا لے۔ اگر یہی ان کی اسکیم ہوتی تو ایک بشر کا انتخاب کر کے چپکے سے کتاب اس کے حوالہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لیے تو اچھا طریقہ یہ ہوتا کہ ایک کتاب چھاپ کر اللہ میاں تمام انسانوں تک براہ راست بھیج دیتے اور دیباچہ میں یہ ہدایت لکھ دیتے کہ میری اس کتاب کو پڑھو اور نظام حق برپا کر لو لیکن انہوں نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا۔ اس کے بجائے جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ایک بشر کو رسول بنا کر اٹھایا اور اس کے ذریعہ سے اصلاح و انقلاب کی ایک تحریک اٹھوائی۔

اس تحریک میں اصل عامل کتاب نہ تھی بلکہ وہ زندہ انسان تھا جسے تحریک کی قیادت پر مامور کیا گیا تھا۔ اس انسان کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نگرانی و ہدایت میں ایک مکمل نظام فکر و اخلاق، نظام تہذیب و تمدن، نظام عدل و قانون اور نظام معیشت و سیاست بنوا کر اور چلوا کر ہمیشہ کے لیے ایک روشن نمونہ (اسوۂ حسنہ) دنیا کے سامنے قائم کر دیا تاکہ جو انسان بھی اپنی فلاح چاہتے ہوں وہ اس نمونے کو دیکھ کر اس کے مطابق اپنا نظام زندگی بنانے کی کوشش کریں۔ نمونے کا ناقص رہ جانا لازماً ہدایت کے نقص کو مستلزم ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نمونے کی چیز براہ راست اپنی ہدایات کے تحت بنوائی۔ اس کے معمار کو نقشہ تعمیر بھی دیا اور اس کا مطلب بھی خود سمجھایا۔ اس کی تعمیر کی حکمت بھی سکھائی اور عمارت کا ایک ایک گوشہ بناتے وقت اس کی نگرانی بھی کی۔ تعمیر کے دوران میں وحی جلی کے ذریعہ سے بھی اس کو رہنمائی دی اور وحی خفی کے ذریعہ سے بھی۔ کہیں کوئی اینٹ رکھنے میں اس سے ذرا سی چوک بھی ہو گئی تو فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی تا کہ جس عمارت کو ہمیشہ کے لیے نمونہ بننا ہے اس میں کوئی ادنیٰ سی خامی بھی نہ رہ

جائے۔ پھر جب اس معمار نے اپنے آقا کی ٹھیک ٹھیک مرضی کے مطابق یہ کار تعمیر پورا کر دیا تب دنیا میں اعلان کیا گیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اس طریق کار نے حقیقتاً امت میں کوئی مایوسی پیدا نہیں کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب وحی الٰہی کا دروازہ بند ہو گیا تو کیا خلفائے راشدین نے پے درپے اٹھ کر وحی کے بغیر اس نمونے کی عمارت کو قائم رکھنے اور آگے اسی نمونے پر وسعت دینے کی کوشش نہیں کی؟ کیا عمر بن عبدالعزیز نے اسے انہی بنیادوں پر از سر نو تازہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟ کیا وقتاً فوقتاً صالح فرماں روا اور مصلحین امت بھی اس نمونے کی پیروی کرنے کے لیے دنیا کے مختلف گوشوں میں نہیں اٹھتے رہے؟ ان میں سے آخر کس نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو وحی کی رہنمائی میں یہ کام کر گئے' اب یہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے؟ حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے تاریخ انسانی میں اپنے رسول کے عملی کارنامے سے روشنی کا ایک مینار کھڑا کر دیا ہے' جو صدیوں سے انسان کو صحیح نظام زندگی کا نقشہ دکھا رہا ہے اور قیامت تک دکھاتا رہے گا۔ آپ کا جی چاہے تو اس کے شکرگزار ہوں' اور جی چاہے تو اس کی روشنی سے آنکھیں بند کر لیں۔

۹۔ خلفائے راشدین پر بہتان

آپ کا نکتہ نمبر ۹ یہ ہے:

> "حضرات خلفائے کرام اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وحی الکتاب کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد حضورؐ جو کچھ کرتے تھے' باہمی مشاورت سے کرتے تھے۔ اس لیے حضورؐ کی وفات کے بعد نظام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سلطنت کی وسعت کے ساتھ تقاضے بڑھتے گئے اس لیے آئے دن نئے نئے امور سامنے آتے تھے جن کے تصفیہ کے لیے اگر کوئی پہلا

فیصلہ مل جاتا جس میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی تو اسے علی حالہ قائم رکھتے تھے۔ اگر اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے تبدیلی کرلیتے اور اگر نئے فیصلہ کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے نیا فیصلہ کرلیتے۔ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا اور اسی کو حضورؐ کے جانشینوں نے قائم رکھا۔ اسی کا نام اتباع رسول تھا"۔

اس عبارت میں آپ نے پے درپے متعدد غلط باتیں فرمائی ہیں۔ آپ کی پہلی غلط بیانی یہ ہے کہ رسولؐ اللہ جو کچھ کرتے تھے' باہمی مشاورت سے کرتے تھے' حالانکہ مشاورت حضورؐ نے صرف تدابیر کے معاملے میں کی ہے اور وہ بھی ان تدابیر کے معاملے میں جن کے اختیار کرنے کا حکم آپ کو وحی سے نہیں ملا ہے۔ قرآن کی تعبیر و تفسیر' اور اس کے کسی لفظ یا فقرے کا منشا مشخص کرنے میں حضورؐ نے کبھی کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ اس معاملہ میں آپ کی اپنی ہی شرح قطعی ناطق تھی۔ اس طرح آپ کے پورے عہد رسالت میں کبھی یہ طے کرنے کے لیے کوئی مشاورت نہیں ہوئی کہ لوگوں کے لیے کس چیز کو فرض و واجب کس چیز کو حلال و جائز اور کس چیز کو ممنوع و حرام ٹھہرایا جائے' اور معاشرے میں کیا قاعدے اور ضابطے مقرر کیے جائیں۔ حضورؐ کی حیات طیبہ میں تنہا آپ کی زبان اور آپ کی عملی زندگی ہی لیجسلیچر تھی۔ کوئی مومن یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ان معاملات میں وہ حضورؐ کے سامنے زبان کھولنے کا مجاز ہے۔ کیا آپ کوئی مثال ایسی پیش کرسکتے ہیں کہ عہد رسالت میں قرآن کے کسی حکم کی تعبیر مشورے سے کی گئی ہو' یا کوئی قانون مشورے سے بنایا گیا ہو؟ بہت سی نہیں' صرف ایک مثال ہی آپ پیش فرما دیں۔

دوسری خلاف واقعہ بات آپ یہ فرما رہے ہیں کہ خلفائے راشدین صرف قرآن کو منبع ہدایت سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو

واجب الاتباع ماخذ قانون نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ان بزرگوں پر آپ کا سخت بہتان ہے جس کے ثبوت میں نہ آپ ان کا کوئی قول پیش کر سکتے ہیں نہ عمل' اگر اس کا کوئی ثبوت آپ کے پاس ہے تو وہ سامنے لایئے۔ ان کے طرز عمل کی جو شہادتیں ان کے زمانے سے متصل لوگوں نے دی ہیں وہ تو یہ ہیں:

ابن سیرین (۳۳ھ-۱۱۰ھ) کہتے ہیں کہ "ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش ہوتا اور وہ نہ کتاب اللہ میں سے اس کے لیے کوئی حکم پاتے' نہ سنت میں اس کی کوئی نظیر ملتی تب وہ اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرتے اور فرماتے یہ میری رائے ہے' اگر صحیح ہے تو اللہ کا فضل ہے"۔ (ابن القیم' اعلام الموقعین' جلد ۱' ص ۵۴)

میمون بن مہران (۳۷ھ-۱۱۷ھ) کہتے ہیں: "ابوبکر صدیقؓ کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کسی معاملہ کا فیصلہ انہیں کرنا ہوتا تو پہلے کتاب اللہ میں دیکھتے' اگر وہاں اس کا حکم نہ ملتا تو سنت رسول اللہؐ میں تلاش کرتے۔ اگر وہاں حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اور اگر انہیں اس مسئلے میں سنت کا علم نہ ہوتا تو لوگوں سے پوچھتے تھے کہ کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ اس طرح کے کسی معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ فرمایا ہے"۔ (کتاب مذکور' صفحہ ۶۲)

علامہ ابن قیم نے پوری تحقیق کے بعد اپنا نتیجہ تحقیق یہ بیان کیا ہے کہ لا یحفظ للصدیق خلاف نص واحد ابدًا "ابوبکر صدیقؓ کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی ایک مثال بھی نہیں ملتی"۔ (کتاب مذکور' ج ۴' ص ۱۲۰)

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دادی اپنے پوتے کی میراث کا مطالبہ لے کر آئی جس کی ماں مر چکی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا میں کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں پاتا جس کی رو سے تجھ کو ماں کا حصہ پہنچتا ہو۔ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس معاملہ میں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ اس پر مغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مسلمہ نے اٹھ کر شہادت دی کہ حضورؐ نے دادی کو چھٹا حصہ (یعنی حصہ مادری) دلوایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ کر

دیا (بخاری و مسلم)۔

موطا میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کو اپنی زندگی میں کچھ مال دینے کے لیے کہا تھا' مگر انہیں یہ یاد نہیں تھا کہ یہ مال ان کے حوالہ کر دیا گیا تھا یا نہیں۔ وفات کے وقت آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر وہ مال تم لے چکی ہو' تب تو وہ تمہارے پاس رہے گا (کیونکہ وہ ہبہ ہو گیا)' لیکن اگر ابھی تک تم نے اسے قبضہ میں نہیں لیا ہے تو اب وہ میرے سب وارثوں میں تقسیم ہو گا (کیونکہ اس کی حیثیت ہبہ کی نہیں بلکہ وصیت کی ہے اور حدیث لا وصیة لوارث کی رو سے وارث کے حق میں کوئی وصیت میت کے ترکے میں نافذ نہیں ہو سکتی تھی) اس طرح کی بکثرت مثالیں خلیفہ اول کی زندگی میں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے بال برابر ہٹنا بھی جائز نہ رکھتے تھے۔

کون نہیں جانتا کہ خلیفہ ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا اولین اعلان یہ تھا کہ اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فان عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعة لی علیکم "میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔[ا] لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے"۔ کس کو معلوم نہیں کہ انہوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد جیش اسامہؓ کو صرف اس لیے بھیجنے پر اصرار کیا کہ جس کام کا فیصلہ حضورؐ اپنی زندگی

ا۔ منکرین حدیث کہتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی اللہ اور رسولؐ کے الفاظ آئے ہیں ان سے مراد "مرکز ملت" ہے۔ لیکن یہ نکتہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ بیچارے یہی سمجھتے رہے کہ میں "مرکز ملت" ہونے کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسولؐ کا تابع فرمان ہوں۔ اگر کہیں خلیفہ اول کی بیعت کے وقت "طلوع اسلام" رونما ہو چکا ہوتا تو وہ ان سے کہتا کہ اے مرکز ملت' اللہ اور رسول تو تم خود ہو' تم کس اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے چلے ہو۔

کر چکے تھے' اسے بدل دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام نے جب ان خطرات کی طرف توجہ دلائی جن کا طوفان عرب میں اٹھتا نظر آ رہا تھا اور اس حالت میں شام کی طرف فوج بھیج دینے کو نامناسب قرار دیا' تو حضرت ابوبکرؓ کا جواب یہ تھا کہ لو خطفتنی الکلاب والذئاب لم لرد قضاء به رسول اللّٰہ۔ "اگر کتے اور بھیڑیے بھی مجھے اچک لے جائیں تو میں اس فیصلہ کو نہ بدلوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا تھا"۔ حضرت عمرؓ نے خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اسامہؓ ہی کو اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں کیونکہ بڑے بڑے صحابہ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی داڑھی پکڑ کر فرمایا: تکلتک امک وعدمتک یا ابن الخطاب' استعملہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وتامرنی ان انزعہ۔ "خطاب کے بیٹے' تیری ماں تجھے روئے اور تجھے کھو دے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقرر کیا اور تو مجھ سے کہتا ہے کہ میں اسے ہٹا دوں"۔ اس موقع پر لشکر کو روانہ کرتے ہوئے جو تقریر انہوں نے کی اس میں فرمایا: انما انا متبع لست بمبتدع۔ "میں تو پیروی کرنے والا ہوں۔ نیا راستہ نکالنے والا نہیں ہوں"۔ پھر کس سے یہ واقعہ پوشیدہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباس کے مطالبہ میراث کو ابوبکر صدیقؓ نے حدیث رسولؐ اللہ ہی کی بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ اور اس "قصور" پر وہ آج تک گالیاں کھا رہے ہیں۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جب وہ جہاد کا فیصلہ کر رہے تھے تو حضرت عمرؓ جیسے شخص کو اس کی صحت میں اس لیے تامل تھا کہ جو لوگ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہیں ان کے خلاف تلوار کیسے اٹھائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کا جو جواب انہوں نے دیا' وہ یہ تھا کہ واللّٰہ لو منعونی عقالا کانوا یودونه الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لقاتلتهم علی منعہ۔ "خدا کی قسم' اگر وہ اونٹ باندھنے کی ایک رسی بھی اس زکوٰۃ میں سے روکیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیتے تھے تو میں اس پر ان سے لڑوں گا"۔ یہ قول اور

یہ عمل تھا اس شخص کا جس نے حضورؐ کے بعد سب سے پہلے زمام کار سنبھالی تھی' اور آپ کہتے ہیں کہ خلفائے کرام اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بدلنے کا مجاز سمجھتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کا مسلک اس معاملے میں جو کچھ تھا' اسے وہ خود قاضی شریح کے نام اپنے خط میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"اگر تم کوئی حکم کتاب اللہ میں پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کردو اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کرو اور اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں جو حکم ملے اس پر فیصلہ کرو۔ اور اگر معاملہ ایسا ہو جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول اللہ میں تو اس کا فیصلہ اس قانون کے مطابق کرو جس پر اجماع ہو چکا ہو لیکن اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں خاموش ہوں اور تم سے پہلے اس کے متعلق کوئی اجماعی فیصلہ بھی نہ ہوا تو تمہیں اختیار ہے کہ یا تو پیش قدمی کرکے اپنی اجتہادی رائے سے فیصلہ کردو' یا پھر ٹھہر کر انتظار کرو۱ اور میرے نزدیک تمہارا انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے"۔ (اعلام الموقعین' جلد ۱' ص ۶۱-۶۲)

یہ حضرت عمرؓ کا اپنا لکھا ہوا سرکاری ہدایت نامہ ہے' جو انہوں نے خلیفہ وقت کی حیثیت سے ضابطہ عدالت کے متعلق کوفہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو بھیجا تھا۔ اس کے بعد کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کے مسلک کی کوئی دوسری ترجمانی کرے۔

حضرت۲۔ عمرؓ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ ہیں۔ بیعت کے بعد اولین خطبہ جو انہوں نے دیا' اس میں علی الاعلان تمام مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱۔ یعنی اس بات کا انتظار کرو کہ اس معاملہ میں کوئی اجماعی فیصلہ ہو جائے۔

۲۔ بعد کا اضافہ

"خبردار رہو' میں پیروی کرنے والا ہوں' نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ میرے اوپر کتاب اللہ اور سنت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی کے بعد تمہارے تین حق ہیں جن کی میں ذمہ داری لیتا ہوں۔ ایک یہ کہ میرے پیش رو خلفا کے زمانے میں تمہارے اتفاق و اجماع سے جو فیصلے اور طریقے طے ہو چکے ہیں' ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جو امور اب اہل خیر کے اجماع و اتفاق سے طے ہوں گے ان پر عمل در آمد کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تمہارے اوپر دست درازی کرنے سے باز رہوں گا۔ جب تک کہ تم ازروئے قانون مواخذہ کے مستوجب نہ ہو جاؤ"۔ (تاریخ طبری' جلد ۳' ص ۴۴۶)

چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ ہیں۔ انہوں نے خلیفہ ہونے کے بعد اہل مصر سے بیعت لینے کے لیے اپنے گورنر حضرت قیس بن سعد بن عبادہ کے ہاتھ جو سرکاری فرمان بھیجا تھا اس میں وہ فرماتے ہیں:

"خبردار رہو' ہمارے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق عمل کریں اور تم پر وہ حق قائم کریں جو کتاب و سنت کی رو سے حق ہو' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو جاری کریں اور تمہاری بے خبری کی حالت میں بھی تمہارے ساتھ خیر خواہی کرتے رہیں"۔ (تاریخ طبری' جلد ۳' ص ۵۵۰)

یہ چاروں خلفاء راشدین کے اپنے بیانات ہیں۔ آپ کن "حضرات خلفاء کرام" کا ذکر فرما رہے ہیں جو اپنے آپ کو سنت رسول' اللہ کی پابندی سے آزاد سمجھتے تھے؟ اور ان کا یہ مسلک آپ کو کن ذرائع سے معلوم ہوا ہے؟

آپ کا یہ خیال بھی محض ایک دعویٰ بلاثبوت ہے کہ خلفائے راشدین قرآن مجید کے احکام کو تو قطعی واجب الاطاعت فرماتے تھے' مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں جن کو وہ باقی رکھنا مناسب سمجھتے تھے' انہیں باقی رکھتے تھے اور

جنہیں بدلنے کی ضرورت سمجھتے تھے انہیں بدل کر باہمی مشاورت سے نئے فیصلے کر لیتے تھے۔ آپ اس کی کوئی نظیر پیش فرمائیں کہ خلافت راشدہ کے پورے دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ بدلا گیا ہو' یا کسی خلیفہ یا صحابی نے یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ ہم حضورؐ کے فیصلے حسب ضرورت بدل لینے کے مجاز ہیں۔

۱۰۔ کیا حضورؐ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی؟

اب صرف آپ کا آخری نکتہ باقی ہے جسے آپ ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:

> "اگر فرض کر لیا جائے' جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ حضورؐ جو کچھ کرتے تھے' وحی کی رو سے کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ خدا کو اپنی طرف سے بھیجی ہوئی ایک قسم کی وحی پر (نعوذ باللہ) تسلی نہ ہوئی' چنانچہ دوسری قسم کی وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ یہ دو رنگی وحی آخر کیوں؟ پہلے آنے والے نبیوں پر جب وحی نازل ہوئی تو اس میں نزول قرآن کی طرف اشارہ تھا۔ تو کیا اس اللہ کے لیے جو ہر چیز پر قادر ہے' یہ بڑا مشکل تھا کہ دوسری قسم کی وحی' جس کا آپ ذکر کرتے ہیں' اس کا قرآن میں اشارہ کر دیتا۔ مجھے تو قرآن میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ اگر آپ کسی آیت کی طرف اشارہ فرما سکیں تو مشکور ہوں گا"۔

یہ تسلی کی بات بھی خوب ہے۔ گویا آپ کی رائے میں اللہ میاں بندوں کی ہدایت کے لیے نہیں بلکہ اپنی تسلی کے لیے وحی نازل فرماتے تھے' اور ان کی تسلی کے لیے بس ایک قسم کی وحی کافی ہونی چاہیے تھی۔

آپ تو "دو رنگی وحی" پر ہی حیران ہیں' مگر آنکھیں کھول کر آپ نے قرآن پڑھا ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ کتاب "سہ رنگی وحی" کا ذکر کرتی ہے جن میں سے صرف ایک "رنگ" کی وحی قرآن میں جمع کی گئی ہے۔

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراٰی حجاب او یرسل

رسولاً فیوحی باذنہ مایشاء انہ علی حکیم (الشوریٰ:۵۱)

کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے' مگر وحی کے طریقہ پر' یا پردے کے پیچھے سے' یا اس طرح کہ ایک پیغام بر بھیجے' اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہو وہ برتر اور حکیم ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بشر پر احکام و ہدایات نازل ہونے کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک براہ راست وحی (یعنی القاء و الہام) دوسرے پردے کے پیچھے سے کلام' تیسرے اللہ کے پیغام بر (فرشتے) کے ذریعہ سے وحی۔ قرآن مجید میں جو وحیاں جمع کی گئی ہیں وہ ان میں سے صرف تیسری قسم کی ہیں۔ اس کی تصریح اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادی ہے۔

قل من کان عدواً لجبریل فانہ نزلہ علیٰ قلبک باذن اللہ مصدقاً لما بین یدیہ وھدی وبشریٰ للمومنین..... فان اللہ عدو للکفرین (البقرہ:۹۷۔۹۸)

(اے نبیؐ) کہو جو کوئی دشمن ہو جبریل کا اس بنا پر کہ اس نے یہ قرآن نازل کیا ہے تیرے قلب پر اللہ کے اذن سے تصدیق کرتا ہوا ان کتابوں کی جو اس کے آگے آئی ہوئی ہیں اور ہدایت و بشارت دیتا ہوا اہل ایمان کو..... تو اللہ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

وانہ لتنزیل رب العلمین نزل بہ الروح الامین علیٰ قلبک لتکون من المنذرین (الشعراء:۱۹۲۔۱۹۴)

اور یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے۔ اسے لے کر روح الامین اترا ہے۔ تیرے قلب پر تاکہ تو متنبہ کرنے والوں میں سے ہو۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ رسول کو ہدایات ملنے کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورۂ شوریٰ والی آیت میں کیا گیا ہے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ اب خود قرآن ہی ہمیں بتاتا ہے کہ ان صورتوں سے

بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات ملتی تھیں۔

(۱) جیسا کہ میں آپ کے چوتھے نکتے پر بحث کرتے ہوئے بتا چکا ہوں، سورۂ بقرہ کی آیات ۱۴۳-۱۴۴ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسجد حرام کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان کسی اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالٰی نے تحویل قبلہ کا حکم دیتے ہوئے اس بات کی توثیق فرمائی کہ وہ پہلا قبلہ جس کی طرف رخ کیا جاتا تھا، وہ بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا تھا۔ لیکن قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں اس قبلے کی طرف رخ کرنے کا ابتدائی حکم ارشاد فرمایا گیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضورؐ پر قرآن کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں آتی تھی تو وہ حکم حضورؐ کو کس ذریعہ سے ملا؟ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ حضورؐ کو ایسے احکام بھی ملتے تھے جو قرآن میں درج نہیں ہیں؟

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپؐ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپ اس کی خبر صحابہ کرام کو دیتے ہیں اور ۱۴ سو صحابیوں کو لے کر عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفار مکہ آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ واقع ہوتی ہے۔ بعض صحابی اس پر خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ کیا آپ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہو گا؟" اس پر اللہ تعالٰی قرآن میں فرماتا ہے:

لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ امنین محلقین روسکم ومقصرین لا تخافون فعلم مالم تعلموا فجعل من دون ذالک فتحا قریبا (الفتح:۲۷)

اللہ نے اپنے رسول کو یقیناً سچا خواب دکھایا تھا۔ تم ضرور مسجد حرام میں

انشاء اللہ داخل ہو گے۔ امن کے ساتھ سر موڑتے ہوئے اور بال تراشتے ہوئے بغیر اس کے کہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہو اللہ کو علم تھا اس بات کا جسے تم نہ جانتے تھے۔ اس لیے اس سے پہلے اس نے یہ قریب کی فتح (یعنی صلح حدیبیہ) عطا کر دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کو خواب کے ذریعہ سے مکہ میں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کی طرف جائیں "کفار روکیں گے" آخر کار صلح ہو گی جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا اور آئندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائے گا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے ہدایات ملنے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو راز میں ایک بات بتاتے ہیں۔ وہ اس کا ذکر دوسروں سے کر دیتی ہیں۔ حضورؐ اس پر بازپرس کرتے ہیں تو وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہہ دی ہے۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔

واذا سرا النبی الی بعض ازواجہ حدیثا فلما نبات بہ واظھرہ اللہ علیہ عرف بعضہ واعرض عن بعض فلما نباھابہ قالت من انباک ھذا قال نبانی العلیم الخبیر (التحریم:۳)

اور جب کہ نبیؐ نے اپنی ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور اس نے بیوی نے اس کی (دوسروں کو) خبر دے دی' اور اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا تو نبی نے اس بیوی کو اس کے قصور کا ایک حصہ تو جتا دیا اور دوسرے حصہ سے درگزر کیا۔ پس جب نبی نے اس بیوی کو اس کا قصور جتایا تو اس نے پوچھا آپ کو کس نے اس کی خبر دی؟ نبیؐ نے کہا مجھے علیم و خبیر خدا نے بتایا۔

فرمائیے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا؟

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضورؐ ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں اس پر منافقین اور مخالفین حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک شدید طوفان اٹھا کھڑا کرتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب کے ایک پورے رکوع میں دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ ہمارے نبی نے یہ نکاح خود نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے حکم سے کیا ہے۔

> فلما قضی زید منها وطراً زوجنکها لکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیائهم اذا قضوا منهن وطراً
> (آیت:۳۷)
>
> پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے اس (خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہل ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں (یعنی انہیں طلاق دے چکے ہوں)

یہ آیت تو گزرے ہوئے واقعہ کا بیان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا گیا تھا کہ تم زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لو وہ قرآن میں کس جگہ ہے؟

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی نضیر کی مسلسل بد عہدیوں سے تنگ آ کر مدینہ سے متصل ان کی بستیوں پر چڑھائی کر دیتے ہیں اور دوران محاصرہ میں اسلامی فوج گردوپیش کے باغات کے بہت سے درخت کاٹ ڈالتی ہے تاکہ حملہ کرنے کے لیے

راستہ صاف ہو۔ اس پر مخالفین شور مچاتے ہیں کہ باغوں کو اجاڑ کر اور ہرے بھرے ثمردار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض برپا کیا ہے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ما قطعتم من لینة او ترکتموها قآئمة من لئینة علٰی اصولها فباذن اللہ (الحشر:۵)

کھجوروں کے درخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیئے' یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی؟

(۶) جنگ بدر کے خاتمے پر جب مال غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت سورۂ انفال نازل ہوتی ہے اور پوری جنگ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اس تبصرے کا آغاز اللہ تعالیٰ اس وقت سے کرتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے' اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انها لکم وتودون ان غیر ذات الشوکة تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمته ویقطع دابر الکفرین (آیت:۷)

اور جبکہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں (یعنی تجارتی قافلے اور قریش کے لشکر) میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا' اور تم چاہتے تھے کہ بے زور گروہ (یعنی تجارتی قافلہ) تمہیں ملے حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی کمر توڑ دے۔

اب کیا آپ پورے قرآن میں کسی آیت کی نشان دہی فرما سکتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نازل ہوا کہ اے لوگو' جو مدینہ سے بدر کی طرف جا رہے ہو' ہم

دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں قابو عطا فرمادیں گے؟

(۷) اسی جنگ بدر پر تبصرے کے سلسلے میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکة مردفین (الانفال:۹)

جبکہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے' تو اس نے تمہاری فریاد کے جواب میں فرمایا میں تمہاری مدد کے لیے لگاتار ایک ہزار فرشتے بھیجنے والا ہوں۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی فریاد کا یہ جواب قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہوا تھا؟

آپ صرف ایک مثال چاہتے تھے۔ میں نے آپ کے سامنے قرآن مجید سے سات مثالیں پیش کر دی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ اس کے بعد آگے کسی بحث کا سلسلہ چلنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ حق کے آگے جھکنے کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں۔

خاکسار ——— ابوالاعلیٰ

(ترجمان القرآن' اکتوبر و نومبر ۱۹۶۰ء)

سنت کے متعلق چند مزید سوالات

(صفحات گزشتہ میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب اور مصنف کی جو مراسلت ناظرین کے سامنے آچکی ہے' اس کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کا ایک اور خط وصول ہوا جسے مصنف کے جواب سمیت ذیل میں درج کیا جا رہا ہے)۔

ڈاکٹر صاحب کا خط

محترم مولانا السلام علیکم!

میرے خط مورخہ ۱۷/اگست کا جواب آپ کی طرف سے ترجمان القرآن ماہ اکتوبر و نومبر کی اشاعتوں میں آچکا ہے۔ اکتوبر کے ترجمان میں

شائع شدہ جواب کا بقیہ حصہ بھی بذریعہ ڈاک موصول ہو گیا تھا۔ اس جواب کے آخر میں آپ نے فرمایا ہے کہ آگے کسی بحث کا سلسلہ چلنے سے پہلے آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا میں حق کے آگے جھکنے کے لیے تیار بھی ہوں یا نہیں۔

محترم! ایک سچے مسلمان کی طرح میں ہر وقت حق کے آگے جھکنے پر تیار ہوں۔ لیکن جہاں حق موجود ہی نہ ہو بلکہ کسی بت کے آگے جھکنا مقصود ہو تو کم از کم میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شخصیت پرستی میرا مسلک نہیں۔ میں بار بار آپ کو تکلیف اس لیے دیتا ہوں کہ مسئلہ زیر بحث صاف ہو جائے اور ایک ہی ملک میں بسنے والے اور ایک ہی منزل مقصود کی طرف بڑھنے والے الگ الگ راستے اختیار نہ کریں۔ اور آپ ہیں کہ لفاظی اور جذبات کا مرکب پیش کرنے میں سارا زور قلم اس لیے صرف کر رہے ہیں کہ میں جھک جاؤں۔ آپ نے اتنا طویل جواب لکھنے میں یقیناً بڑی زحمت اٹھائی۔ لیکن میری بدنصیبی ملاحظہ فرمایئے کہ اس سے اور الجھنیں پیدا ہو گئیں۔

آپ نے یہ درست فرمایا کہ میرے لیے قرآن کا مطالعہ میرے بہت سے مشاغل میں سے ایک ہے اور آپ نے اپنی عمر اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے مضمرات کو سمجھنے میں صرف کی ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ آپ کی یہ عمر بھر کی محنت اپنی ذات کے لیے ہو تو ہو لیکن عام مسلمانوں کے لیے کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکی۔ آپ کے خط میں بہت سے ابہامات ہیں۔ کئی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ کئی باتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قرآن کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے بڑا تفصیلی جواب درکار ہے جسے میں انشاء اللہ العزیز اولین فراغت میں مکمل کر سکوں گا۔ لیکن اس سلسلے میں دو ایک

باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ اس وقت میں صرف انہیں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ساری بحث سمٹ سمٹا کر یہاں آ جاتی ہے کہ رسول اللہ پر جو وحی خدا کی طرف سے نازل ہوئی وہ سب کچھ قرآن کے اندر ہے یا باہر کہیں اور بھی۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ وحی کا ایک حصہ قرآن کے علاوہ اور بھی ہے۔ اس ضمن میں حسب ذیل امور وضاحت طلب ہیں:

(۱) جہاں تک ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا تعلق ہے کیا وحی کے دونوں حصے یکساں حیثیت رکھتے ہیں؟

(۲) قرآن نے جہاں ما انزل الیک کہا ہے کیا اس سے مراد صرف قرآن ہے یا وحی کا مذکورہ صدر حصہ بھی؟

(۳) وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟ کیا قرآن کی طرح اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا نے لی ہوئی ہے؟

(۴) قرآن کے ایک لفظ کی جگہ عربی کا دوسرا لفظ جو اس کے مرادف المعنی ہو، رکھ دیا جائے تو کیا اس لفظ کو "وحی منزل من اللہ" سمجھ لیا جائے گا؟ کیا وحی کے مذکورہ بالا دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟

(۵) بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا۔ کیا آپ ان کے ہمنوا ہیں؟ اگر نہیں تو اس باب میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟

(۶) اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کے بعض ارشادات وحی الٰہی تھے اور بعض وحی نہیں تھے تو کیا آپ فرمائیں گے کہ حضورؐ کے جو

ارشادات وحی تھے' ان کا مجموعہ کہاں ہے؟ نیز آپ کے جو ارشادات وحی نہیں تھے' مسلمانوں کے لیے ایمان و اطاعت کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے؟

(۷) اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق یہ کہہ دے کہ وہ "منزل من اللہ" نہیں ہے تو آپ اس سے متفق ہوں گے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی حدیث کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟

(۸) رسول اللہ (صلعم) نے دین کے احکام کی بجا آوری کے لیے جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں کیا کسی زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس قسم کا رد و بدل قرآن کے احکام کی جزئیات میں بھی کیا جا سکتا ہے؟

والسلام ---- مخلص: عبدالودود

جواب

محترمی و مکرمی' السلام علیکم و رحمتہ اللہ'

عنایت نامہ مورخہ ۵ر نومبر ۱۹۶۰ء ملا۔ کچھ خرابیِ صحت اور کچھ مصروفیت کے باعث جواب ذرا تاخیر سے دے رہا ہوں اور اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے حسب سابق پھر وہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک بحث کو صاف کرنے سے پہلو بچا کر آگے کچھ نئے سوالات چھیڑ دیئے۔ حالانکہ آپ کو نئے مسائل سامنے لانے سے پہلے یہ بتانا چاہیے تھا کہ پچھلے خط میں آپ کے دس نکات پر جو بحث میں نے کی تھی اس میں سے کیا چیز آپ مانتے ہیں اور کیا نہیں مانتے' اور جس چیز کو نہیں مانتے اسے رد کرنے کے لیے آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ اسی طرح آپ کو میرے ان واضح اور متعین سوالات کا بھی کوئی جواب دینا چاہئے تھا جو میں نے اس

خط میں آپ سے کیے تھے۔ لیکن ان سوالات کا سامنا کرنے سے گریز کر کے اب آپ کچھ اور سوالات لے آئے ہیں اور مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں ان کا جواب دوں' یہ آخر کیا طرز بحث ہے؟

میرے پچھلے خط پر آپ کا تبصرہ کچھ عجیب ہی سا ہے۔ تمام اہم نکات جو اس میں زیر بحث آئے تھے' اور بنیادی سوالات جن پر اس میں روشنی ڈالی گئی تھی' ان سب کو چھوڑ کر سب سے پہلے آپ کی نظر میرے آخری فقرے پر پڑتی ہے اور اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "میں حق کے آگے تو جھکنے پر تیار ہوں لیکن بت کے آگے میں نہیں جھک سکتا۔ اور شخصیت پرستی میرا مسلک نہیں ہے"۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سا "بت" ہے جس کے آگے جھکنے کے لیے آپ سے کہا گیا تھا؟ اور کس "شخصیت پرستی" کی آپ کو دعوت دی گئی تھی؟ میں نے تو صریح آیات قرآنی سے یہ ثابت کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حاکم' شارع' قاضی اور معلم و رہنما ہیں اور اللہ ہی کے حکم کی بنا پر آپ کی اطاعت اور آپ کا اتباع ایک مومن پر واجب ہے۔ اسی حق کے مقابلہ میں جھکنے کے لیے میں نے آپ سے عرض کیا تھا۔ اس پر آپ کا مذکورۂ بالا ارشاد یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور پیروی ہی وہ "بت" ہے جس کے آگے جھکنے سے آپ کو انکار ہے' اور یہی وہ "شخصیت پرستی" ہے جس سے آپ گریزاں ہیں۔ اگر میرا یہ شبہ صحیح ہے تو میں عرض کروں گا کہ دراصل آپ شخصیت پرستی سے نہیں خدا پرستی سے انکار کر رہے ہیں' اور ایک بہت بڑا بت آپ کے اپنے نفس میں چھپا ہوا ہے جس کے آگے آپ سجدہ ریز ہیں' جہاں سر اطاعت خم کرنے کا خدا نے حکم دیا ہو' وہاں جھک جانا بت کے آگے جھکنا نہیں' خدا کے آگے جھکنا ہے' اور یہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہے۔ البتہ اس سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ دراصل حکم خدا کے آگے جھکنے کے بجائے اپنے بت نفس کے آگے جھکتا ہے۔

پھر آپ میرے سارے دلائل کو اس طرح چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش فرماتے ہیں کہ تم نے "لفاظی اور جذبات کا مرکب پیش کرنے میں سارا زور قلم صرف کیا ہے"۔ یہ رائے آپ چاہیں تو بخوشی رکھ سکتے ہیں، لیکن اس کا فیصلہ اب وہ ہزاروں ناظرین کریں گے جن کی نظر سے یہ مراسلت گزر رہی ہے۔ میں نے دلائل پیش کیے ہیں یا محض لفاظی کی ہے اور آپ ہٹ دھرمی کا اظہار فرما رہے ہیں یا حق پرستی کا۔

پھر آپ اپنی اس بدنصیبی پر افسوس کرتے ہیں کہ میرے جوابات سے آپ کی الجھنیں اور بڑھ گئی ہیں۔ مجھے بھی اس کا افسوس ہے مگر ان الجھنوں کا منبع کہیں باہر نہیں، آپ کے اندر ہی موجود ہے۔ آپ نے یہ مراسلت واقعی "بات سمجھنے کے لیے" کی ہوتی تو سیدھی بات سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آ جاتی، لیکن آپ کی تو اسکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی اس امید پر بھیجے تھے کہ ان سے مختلف جوابات حاصل ہوں گے اور پھر ان کا ایک مجموعہ شائع کر کے یہ پروپیگنڈا کیا جا سکے گا کہ علماء سنت سنت تو کرتے ہیں مگر دو عالم بھی سنت کے بارے میں ایک متفق رائے نہیں رکھتے۔ وہ ٹیکنیک جس کا ایک شاہکار ہمیں منیر رپورٹ میں ملتا ہے۔ اب میرے جوابات سے آپ کی یہ اسکیم آپ ہی کے اوپر الٹ پڑی ہے اس لیے آپ کو سمجھانے کی جتنی کوشش بھی میں کرتا جاتا ہوں آپ کی الجھن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس نوعیت کی الجھن کا آخر میں کیا علاج کر سکتا ہوں۔ اس کا علاج تو آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ حق بات سمجھنے اور ماننے کی مخلصانہ خواہش اپنے اندر پیدا کیجیے اور ایک مسلک خاص کے حق میں پروپیگنڈا کرنے کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کی

ل یہ بات مجھے بعد میں مولانا داؤد غزنوی اور مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل اور بعض دوسرے حضرات سے معلوم ہوئی کہ بعینہ یہی سوالات آپ کی طرف سے ان کو بھی بھیجے گئے تھے۔

فکر چھوڑ دیجئے۔ اس کے بعد انشاء اللہ ہر معقول بات باآسانی آپ کی سمجھ میں آنے لگے گی۔

پھر آپ میری طرف یہ غلط دعویٰ منسوب کرتے ہیں کہ "میں نے اپنی عمر قرآن کے ایک ایک لفظ پر غور کرنے اور اس کے مضمرات کو سمجھنے میں صرف کی ہے"۔ حالانکہ میں نے اپنے متعلق یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ میں نے تو اپنے پچھلے خط میں جو کچھ کہا تھا وہ یہ تھا کہ اسلامی تاریخ میں بے شمار ایسے لوگ گزرے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کر دی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ آپ نے کیسے نکال لیا کہ میں اپنے حق میں یہ دعویٰ کر رہا ہوں۔

اتنی غیر متعلق باتیں کر چکنے کے بعد آپ میرے خط کے اصل بحث کے متعلق صرف اتنی مختصر سی بات ارشاد فرمانے پر اکتفا کرتے ہیں کہ: "آپ کے خط میں بہت سے ابہامات ہیں۔ کئی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ کئی باتیں ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قرآن کا مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے"۔ سوال یہ ہے کہ اس سے زیادہ مبہم بات بھی کوئی ہو سکتی ہے؟ آخر آپ نے کچھ تو بتایا ہوتا کہ میرے اس خط میں کیا ابہامات تھے، کیا چیزیں قرآن کے خلاف تھیں اور قرآن کی کن آیات کا مطلب میں ٹھیک نہیں سمجھا۔ ان ساری باتوں کو تو آئندہ کسی فرصت کے لیے آپ نے اٹھا کر رکھ دیا اور اپنا آج کا وقت کچھ نئے سوالات تصنیف کرنے میں صرف فرما دیا حالانکہ یہ وقت پچھلے سوالات پر گفتگو کرنے میں استعمال ہونا چاہئے تھا۔

اگر اس مراسلت سے میرے پیش نظر صرف آپ کو "بات سمجھانا" ہوتا تو آپ کی طرف سے "بات سمجھنے" کی کوشش کا یہ نمونہ دیکھ کر میں آئندہ کے لیے معذرت ہی کر دیتا۔ لیکن دراصل میں آپ کے ذریعہ سے دوسرے بہت سے مریضوں کے علاج کی فکر کر رہا ہوں جن کے ذہن اسی طرح کے سوالات چھیڑ چھیڑ کر پراگندہ کیے جا رہے ہیں، اس لیے میں انشاء اللہ آپ کے ان تازہ سوالات کا جواب بھی دوں گا، اور ایسے ہی سوالات آپ اور چھیڑیں گے تو ان کا جواب بھی دوں گا،

تاکہ جن لوگوں کے اندر اس گمراہی کے لیے ابھی تک ضد پیدا نہیں ہوئی ہے' وہ سنت کے مسئلے کا ہر پہلو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کو گمراہ کرنا آسان نہ رہے۔

وحی پر ایمان کی وجہ

آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ: "جہاں تک ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا تعلق ہے کیا وحی کے دونوں حصے یکساں حیثیت رکھتے ہیں"۔

اس سوال کا صحیح جواب آدمی کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آسکتا جب تک کہ وہ پہلے یہ نہ سمجھ لے کہ وحی پر ایمان لانے اور اس کی اطاعت کرنے کی اصل بنیاد کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ وحی خواہ وہ کسی نوعیت کی بھی ہو' براہ راست ہمارے پاس نہیں آئی ہے کہ ہم بجائے خود اس کے منزل من اللہ ہونے کو جانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ وہ تو ہمیں رسولؐ کے ذریعہ سے ملی ہے اور رسولؐ ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ ہدایت میرے پاس خدا کی طرف سے آئی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم وحی پر (یعنی اس کے من جانب اللہ ہونے پر) ایمان لائیں' ہم رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کا سچا نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہی یہ نوبت آسکتی ہے کہ ہم رسولؐ کے بیان پر اعتماد کر کے اس وحی کو خدا کی بھیجی ہوئی وحی مانیں اور اس کی اطاعت کریں۔ پس اصل چیز وحی پر ایمان نہیں بلکہ رسولؐ پر ایمان اور اس کی تصدیق ہے۔ اور اسی کی تصدیق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے حی کو وحی خداوندی مانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھئے کہ رسولؐ کی رسالت پر ہمارے ایمان کی وجہ قرآن نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس قرآن پر ہمارے ایمان کی وجہ رسولؐ کی رسالت پر ایمان ہے۔ واقعات کی ترتیب یہ نہیں ہے کہ پہلے قرآن ہمارے پاس آیا اور اس نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہمارا تعارف کرایا ہو' اور اس کے بیان کو صحیح جان کر ہم نے حضورؐ کو خدا کا رسول تسلیم کیا ہو۔ بلکہ صحیح ترتیب واقعات یہ ہے کہ پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر رسالت کا دعویٰ پیش کیا' پھر جس نے بھی ان کو رسول برحق مانا اس نے ان کی اس بات کو بھی

برحق مان لیا کہ یہ قرآن جو وہ پیش فرما رہے ہیں' یہ کلام محمدؐ نہیں بلکہ کلام اللہ ہے۔

یہ ایک ایسی بدیہی پوزیشن ہے جس سے کوئی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ اس پوزیشن کو اگر آپ مانتے ہیں تو اپنی جگہ خود غور کیجئے کہ جس رسولؐ کے اعتماد پر ہم نے قرآن کو وحی مانا ہے وہی رسولؐ اگر ہم سے یہ کہے کہ مجھے قرآن کے علاوہ بھی خدا کی طرف سے ہدایات اور احکام بذریعہ وحی ملتے ہیں' تو اس کی تصدیق نہ کرنے کی آخر کیا وجہ ہے؟ اور آخر رسولؐ کے ذریعہ سے آنے والی ایک وحی اور دوسری وحی میں فرق کیوں ہو؟ جب ایمان بالرسالت ہی وحی پر ایمان کی اصل بنیاد ہے تو اطاعت کرنے والے کے لیے اس سے کیا فرق واقع ہوتا ہے کہ رسولؐ نے خدا کا ایک حکم قرآن کی کسی آیت کی شکل میں ہمیں پہنچایا ہے' یا اپنے کسی فرمان یا عمل کی شکل میں؟ مثال کے طور پر پانچ وقت کی نماز بہرحال ہم پر فرض ہے اور امت اس کو فرض مانتی ہے باوجودیکہ قرآن کی کسی آیت میں یہ حکم نہیں آیا کہ "اے مسلمانو! تم پر پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی ہے"۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن میں بھی یہ حکم آجاتا تو اس کی فرضیت اور اس کی تاکید میں کیا اضافہ ہو جاتا؟ اس وقت بھی یہ ویسی ہی فرض ہوتی جیسی اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے فرض ہے۔

ما انزل اللہ سے کیا چیز مراد ہے؟

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ:

"قرآن نے جہاں ما انزل الیک کہا ہے کیا اس سے مراد صرف قرآن ہے یا وحی کا مذکورۂ صدر حصہ بھی؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں "نازل کرنے" کے ساتھ "کتاب" یا "ذکر" یا "فرقان" وغیرہ کی تصریح کی گئی ہے۔ صرف اسی جگہ ما انزل اللہ سے مراد قرآن ہے۔ رہے وہ مقامات جہاں کوئی قرینہ ان الفاظ کو قرآن کے

لیے مخصوص نہ کر رہا ہو' وہاں یہ الفاظ ان تمام ہدایات و تعلیمات پر حاوی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو ملی ہیں' خواہ وہ آیات قرآنی کی صورت میں ہوں' یا کسی اور صورت میں۔ اس کی دلیل خود قرآن مجید ہی میں موجود ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن ہی نازل نہیں ہوا ہے بلکہ کچھ اور چیزیں بھی نازل ہوئی ہیں۔ سورۂ نسا میں ارشاد ہوا ہے:

وانزل اللہ علیک الکتب والحکمۃ وعلمک مالم تکن تعلم
(آیت:۱۱۳)

اور اللہ نے تیرے اوپر نازل کی کتاب اور حکمت اور تجھے سکھایا وہ کچھ جو تو نہ جانتا تھا۔

یہی مضمون سورۂ بقرہ میں بھی ہے:

واذکرو نعمۃ اللہ علیکم وما انزل علیک من الکتب والحکمۃ یعظکم بہ (آیت:۲۳۱)

اور یاد رکھو اپنے اوپر اللہ کے احسان کو' اور اس کتاب اور حکمت کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا پاس رکھنے کی نصیحت فرماتا ہے"۔

اسی بات کو سورۂ احزاب میں دہرایا گیا ہے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کو نصیحت فرمائی گئی ہے کہ:

واذکرن مایتلی فی بیوتکن من ایت اللہ والحکمۃ (آیت:۳۴)

اور یاد رکھو کہ تمہارے گھروں میں (لوگوں کو) اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو سنائی جاتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب کے علاوہ ایک چیز "حکمت" بھی نازل کی گئی تھی جس کی تعلیم آپ لوگوں کو دیتے تھے۔ اس کا مطلب آخر اس کے سوا کیا ہے کہ جس دانائی کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن

مجید کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کام کرتے اور قیادت و رہنمائی کے فرائض انجام دیتے تھے' وہ محض آپ کی آزادانہ ذاتی قوت فیصلہ (Private Judgement) نہ تھی بلکہ یہ چیز بھی اللہ نے آپ پر نازل کی تھی۔ نیز یہ کوئی ایسی چیز تھی جسے آپ خود ہی استعمال نہ کرتے تھے بلکہ لوگوں کو سکھاتے بھی تھے (یعلمکم الکتب والحکمۃ) ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سکھانے کا عمل یا تو قول کی صورت میں ہو سکتا تھا یا فعل کی صورت میں۔ اس لیے امت کو آنحضرتؐ کے ذریعہ سے اللہ تعالٰی کی نازل کردہ وہ دو چیزیں ملی تھیں۔ ایک کتاب۔ دوسری حکمت' حضورؐ کے اقوال میں بھی اور افعال کی صورت میں بھی۔

پھر قرآن مجید ایک اور چیز کا ذکر بھی کرتا ہے جو اللہ نے کتاب کے ساتھ نازل کی ہے:

اللہ الذی انزل الکتب بالحق والمیزان (الشوریٰ:۱۷)

اللہ ہی ہے جس نے نازل کی کتاب حق کے ساتھ اور میزان۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (الحدید:۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

یہ "میزان" جو کتاب کے ساتھ نازل کی گئی ہے' ظاہر ہے کہ وہ ترازو تو نہیں ہے جو ہر بنیے کی دوکان پر رکھی ہوئی مل جاتی ہے بلکہ اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہی ہے جو اللہ تعالٰی کی ہدایات کے مطابق انسانی زندگی میں توازن قائم کرتی ہے' اس کے بگاڑ کو درست کرتی ہے اور افراط و تفریط کو دور کر کے انسانی اخلاق و معاملات کو عدل پر لاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ اس چیز کو انبیاء پر "نازل" کرنے کے صاف معنی یہ ہیں کہ انبیاء کو اللہ تعالٰی نے بطور خاص اپنے پاس سے وہ رہنمائی کی صلاحیت عطا فرمائی تھی جس سے انہوں نے کتاب اللہ کے منشا کے مطابق افراد اور

معاشرے اور ریاست میں نظام عدل قائم کیا۔ یہ کام ان کی ذاتی قوت اجتہاد اور رائے پر منحصر نہ تھا' بلکہ اللہ کی نازل کردہ میزان سے تول تول کر وہ فیصلہ کرتے تھے کہ حیات انسانی کے مرکب میں کس جز کا کیا وزن ہونا چاہیے۔

پھر قرآن ایک تیسری چیز کی بھی خبر دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ نازل کی گئی تھی:

فامنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا (التغابن:۸)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔

فالذین امنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون (الاعراف:۱۵۷)

پس جو لوگ ایمان لائیں اس رسول پر اور اس کی تعظیم و تکریم کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ وہی فلاح پانے والے ہیں۔

قد جآءکم من اللہ نور وکتب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام (المائدہ:۱۵۔۱۶)

تمہارے پاس آ گیا ہے اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے' سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے۔

ان آیات میں جس "نور" کا ذکر کیا گیا ہے وہ کتاب سے الگ ایک چیز تھا' جیسا کہ تیسری آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں۔ اور یہ نور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول پر نازل کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ علم و دانش اور وہ بصیرت و فراست ہی ہو سکتی ہے جو اللہ نے حضور کو عطا فرمائی تھی۔ جس سے آپ نے زندگی کی راہوں میں صحیح اور غلط کا فرق واضح فرمایا' جس کی مدد سے زندگی کے مسائل حل کیے' اور جس کی روشنی میں کام کر کے آپ نے اخلاق و

روحانیت، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور قانون و سیاست کی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ یہ کسی پرائیویٹ آدمی کا کام نہ تھا، جس نے بس خدا کی کتاب پڑھ پڑھ کر اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جدوجہد کر ڈالی ہو۔ بلکہ یہ خدا کے اس نمائندے کا کام تھا جس نے کتاب کے ساتھ براہ راست خدا ہی سے علم اور بصیرت کی روشنی بھی پائی تھی۔

ان تصریحات کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جب ہمیں دوسری سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف ما انزل اللّٰہ کی پیروی کرنے کا حکم دیتا ہے تو اس سے مراد محض قرآن ہی کی پیروی نہیں ہوتی، بلکہ اس حکمت اور اس نور اور اس میزان کی پیروی بھی ہوتی ہے جو قرآن کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی تھی اور جس کا ظہور لامحالہ حضورؐ کی سیرت و کردار اور حضورؐ کے اقوال و افعال ہی میں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن کہیں یہ کہتا ہے کہ ما انزل اللّٰہ کی پیروی کرو (مثلاً آیت ۷:۳ میں)، اور کہیں یہ ہدایت کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو (مثلاً آیات ۳:۳۱۔۳۲، ۲۱ اور ۷:۱۵۶ میں)۔ اگر یہ دو مختلف چیزیں ہوتیں تو ظاہر ہے کہ قرآن کی ہدایات متضاد ہو جاتیں۔

سنت کہاں ہے

آپ کا تیسرا سوال یہ ہے:

"وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟ کیا قرآن کی طرح اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا نے لی ہوئی ہے؟"

اس سوال کے دو حصے الگ الگ ہیں۔ پہلا حصہ یہ ہے کہ "وحی کا یہ دوسرا حصہ کہاں ہے؟" بعینہٖ یہ سوال آپ پہلے مجھ سے کر چکے ہیں اور میں اس کا مفصل جواب دے چکا ہوں۔ مگر آپ اسے پھر اس طرح دوہرا رہے ہیں کہ گویا آپ کو سرے سے کوئی جواب ملا ہی نہیں۔ براہ کرم اپنا اولین خط اٹھا کر دیکھیے جس میں سوال نمبر ۲ کا مضمون وہی تھا جو آپ کے اس تازہ سوال کا ہے۔ اس کے بعد میرا

دوسرا خط ملاحظہ فرمایئے جس میں' میں نے آپ کو اس سوال کا تفصیلی جواب دیا ہےا۔ اب آپ کا اسی سوال کو پھر پیش کرنا اور میرے لیے پہلے جواب کو بالکل نظرانداز کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو آپ اپنے ہی خیالات میں گم رہتے ہیں اور دوسرے کی کوئی بات آپ کے ذہن تک پہنچنے کا راستہ ہی نہیں پاتی' یا پھر آپ یہ بحث محض برائے بحث فرما رہے ہیں۔

کیا سنت کی حفاظت بھی خدا نے کی ہے؟

رہا آپ کے سوال کا دوسرا حصہ تو اس کا جواب سننے سے پہلے ذرا اس بات پر غور کر لیجیے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داریاں جو اللہ میاں نے لی تھی' اس کو انہوں نے براہ راست عملی جامہ پہنایا' یا انسانوں کے ذریعہ سے اس کو عملی جامہ پہنوایا؟ ظاہر ہے آپ اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہیں دے سکتے کہ اس حفاظت کے لیے انسان ہی ذریعہ بنائے گئے۔ اور عملاً یہ حفاظت اس طرح ہوئی کہ حضورؐ سے جو قرآن لوگوں کو ملا تھا اس کو اسی زمانہ میں ہزاروں آدمیوں نے لفظ بلفظ یاد کر لیا' پھر ہزاروں سے لاکھوں' اور لاکھوں سے کروڑوں اس کو نسلاً بعد نسل لیتے اور یاد کرتے چلے گئے' حتیٰ کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں رہا کہ قرآن کا کوئی لفظ دنیا سے محو ہو جائے' یا اس میں کسی وقت کوئی رد و بدل ہو اور وہ فوراً نوٹس میں نہ آ جائے' یا اس میں کسی وقت کوئی رد و بدل ہو اور وہ فوراً نوٹس میں نہ آ جائے۔ یہ حفاظت کا غیر معمولی انتظام آج تک دنیا کی کسی دوسری کتاب کے لیے نہیں ہو سکا ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کیا ہوا انتظام ہے۔

اچھا' اب ملاحظہ فرمایئے کہ جس رسولؐ کو ہمیشہ کے لیے اور تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا تھا اور جس کے بعد نبوت کا دروازہ بند کر دینے کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا' اس کے کارنامہ حیات کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسا محفوظ فرمایا کہ آج تک تاریخ

ا۔ ملاحظہ ہو کتاب ہذا' صفحہ ۳۵۔۳۷

انسانی میں گزرے ہوئے کسی نبی، کسی پیشوا، کسی لیڈر اور رہنما اور کسی بادشاہ یا فاتح کا کارنامہ اس طرح محفوظ نہیں رہا ہے اور یہ حفاظت بھی انہی ذرائع سے ہوئی ہے جن ذرائع سے قرآن کی حفاظت ہوئی ہے، ختم نبوت کا اعلان بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کیے ہوئے آخری رسولؐ کی رہنمائی اور اس کے نقوش قدم کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ذمہ داری لے لی ہے تاکہ اس کی زندگی ہمیشہ انسان کی رہنمائی کرتی رہے اور اس کے بعد کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع جریدۂ عالم پر ان نقوش کو کیسا ثبت کیا ہے کہ آج کوئی طاقت انہیں مٹا نہیں سکتی۔ کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ یہ وضو، یہ پنج وقتہ نماز، یہ اذان، یہ مساجد کی نماز باجماعت، یہ عیدین کی نمازیں، یہ حج کے مناسک، یہ بقرعید کی قربانی، یہ زکوٰۃ کی شرحیں، یہ ختنہ، یہ نکاح و طلاق و وراثت کے قاعدے، یہ حرام وحلال کے ضابطے اور اسلامی تہذیب و تمدن کے دوسرے بہت سے اصول اور طور طریقے جس روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کیے اسی روز سے وہ مسلم معاشرے میں ٹھیک اسی طرح رائج ہو گئے جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھ گئیں، اور پھر ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں مسلمان دنیا کے ہر گوشے میں نسلاً بعد نسل ان کی اسی طرح پیروی کرتے چلے آرہے ہیں جس طرح ان کی ایک نسل سے دوسری نسل قرآن لیتی چلی آرہی ہے۔ ہماری تہذیب کا بنیادی ڈھانچہ رسول پاک کی جن سنتوں پر قائم ہے، ان کے صحیح ہونے کا ثبوت بعینہٖ وہی ہے جو قرآن پاک کے محفوظ ہونے کا ثبوت ہے۔ اس کو جو شخص چیلنج کرتا ہے وہ دراصل قرآن کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو دکھاتا ہے۔

پھر دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کے عہد کی سوسائٹی کا کیسا مفصل نقشہ، کیسی جزئی تفصیلات کے ساتھ، کیسے مستند ریکارڈ کی صورت میں آج ہم کو مل رہا ہے۔ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک قول و فعل کی

سند موجود ہے، جس کو جانچ کر ہر وقت معلوم کیا جا سکتا ہے کہ روایت کہاں تک قابل اعتماد ہے۔ صرف ایک انسان کے حالات معلوم کرنے کی خاطر اس دور کے کم و بیش ۶ لاکھ انسانوں کے حالات مرتب کر دیئے گئے تاکہ ہر وہ شخص جس نے کوئی روایت اس انسان عظیمؐ کا نام لے کر بیان کی ہے اس کی شخصیت کو پرکھ کر رائے قائم کی جا سکے کہ ہم اس کے بیان پر کہاں تک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ تاریخی تنقید کا ایک وسیع علم انتہائی باریک بینی کے ساتھ صرف اس مقصد کے لیے مدون ہو گیا کہ اس ایک فرد فرید کی طرف جو بات بھی منسوب ہو اسے ہر پہلو سے جانچ پڑتال کر کے صحت کا اطمینان کر لیا جائے۔ کیا دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی اور مثال بھی ایسی ملتی ہے کہ کسی ایک شخص کے حالات محفوظ کرنے کے لیے انسانی ہاتھوں سے یہ اہتمام عمل میں آیا ہو؟ اگر نہیں ملتی اور نہیں مل سکتی، تو کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ اس اہتمام کے پیچھے بھی وہی خدائی تدبیر کارفرما ہے جو قرآن کی حفاظت میں کارفرما رہی ہے؟

وحی سے مراد کیا چیز ہے؟

آپ کا چوتھا سوال یہ ہے:

"قرآن کے ایک لفظ کی جگہ عربی کا دوسرا لفظ جو اس کے مرادف المعنی ہو، رکھ دیا جائے تو کیا اس لفظ کو "وحی منزل من اللہ" سمجھ لیا جائے گا؟ کیا وحی کے مذکورۂ بالا دوسرے حصے کی بھی یہی کیفیت ہے؟"

یہ ایسا مہمل سوال آپ نے کیا ہے کہ میں کسی پڑھے لکھے آدمی سے اس کی توقع نہ رکھتا تھا۔ آخر یہ کس نے آپ سے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اس معنی میں ہیں کہ آپ نے تفسیر بیضاوی یا جلالین کی طرح کی کوئی تفسیر لکھی تھی جس میں قرآن کے عربی الفاظ کی تشریح میں کچھ دوسرے مترادف عربی الفاظ درج کر دیئے تھے اور ان تفسیری فقروں کو اب کوئی شخص "وحی منزل من اللہ" کہہ رہا ہے۔ جو بات آپ سے بار بار کہی جا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغمبری حیثیت سے جو کچھ بھی کیا اور کہا ہے وہ بمنائے وحی ہے۔ آپ کا پورا پیغمبرانہ کارنامہ اپنی پرائیوٹ حیثیت میں نہ تھا بلکہ خدا کے نمائندہ مجاز ہونے کی حیثیت میں تھا۔ اس حیثیت میں آپ کوئی کام بھی خدا کی مرضی کے خلاف یا اس کے بغیر نہ کر سکتے تھے۔ ایک معلم' ایک مربی' ایک مصلح اخلاق' ایک معمار تہذیب و تمدن' ایک قاضی' ایک مقنن' ایک مدبر' ایک سپہ سالار' ایک حکمران کی حیثیت میں آپ نے جتنا کام بھی کیا وہ سب دراصل خدا کے رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام تھا۔ اس میں خدا کی وحی آپ کی رہنمائی اور نگرانی کرتی تھی' اور کہیں ذرا سی چوک بھی ہو جاتی تو خدا کی وحی بروقت اس کی اصلاح کر دیتی تھی۔ اس وحی کو اگر آپ اس معنی میں لیتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کی تشریح میں کچھ عربی زبان کے مترادف الفاظ نازل ہو جاتے تھے تو میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ "بریں عقل و دانش بباید گریست"۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ وحی لازماً الفاظ کی صورت ہی میں نہیں ہوتی۔ وہ ایک خیال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جو دل میں ڈالا جائے۔ وہ ذہن و فکر کے لیے ایک رہنمائی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک معاملہ کا صحیح فہم بخشنے اور ایک مسئلے کا ٹھیک حل یا ایک موقع کے لیے مناسب تدبیر بجھانے کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ محض ایک روشنی بھی ہو سکتی ہے جس میں آدمی اپنا راستہ صاف دیکھ لے۔ وہ ایک سچا خواب بھی ہو سکتی ہے اور وہ پردے کے پیچھے سے ایک آواز یا فرشتے کے ذریعہ سے آیا ہوا ایک پیغام بھی ہو سکتی ہے۔ عربی زبان میں لفظی وحی کے معنی "اشارۂ لطیف" کے ہیں۔ انگریزی میں اس سے قریب تر لفظ (Inspiration) ہے۔ اگر آپ عربی نہیں جانتے تو انگریزی زبان ہی کی کسی لغت میں اس لفظ کی تشریح دیکھ لیں۔ اس کے بعد آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ لفظ کے مقابلہ میں مترادف لفظ رکھنے کا یہ عجیب و غریب تصور' جسے آپ وحی کے معنی میں لے رہے ہیں' کیسا طفلانہ تصور ہے۔

آپ کا پانچواں سوال یہ ہے:

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت پانے کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک جو کچھ کیا وہ خدا کی طرف سے وحی تھا۔ کیا آپ ان کے ہمنوا ہیں؟ اگر نہیں تو اس باب میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟"

اس سوال کا جواب سوال نمبر ۲ میں آگیا ہے اور وہ عقیدہ جو میں نے اوپر بیان کیا ہے وہ "بعض لوگوں" کا نہیں بلکہ آغاز اسلام سے آج تک تمام مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔

محض تکرار سوال

آپ کا چھٹا سوال یہ ہے:

"اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کے بعض ارشادات وحی الٰہی تھے اور بعض وحی نہ تھے تو آپ فرمائیں گے کہ حضورؐ کے جو ارشادت وحی تھے' ان کا مجموعہ کہاں ہے؟ نیز آپ کے جو ارشادات وحی نہیں تھے' مسلمانوں کے لیے ایمان و طاعت کے اعتبار سے ان کی حیثیت کیا ہے؟"

اس سوال کے پہلے حصے میں آپ نے اپنے سوال نمبر ۳ کو پھر دہرا دیا ہے اور اس کا جواب وہی ہے جو اوپر اسی سوال کا دیا جا چکا ہے۔ دوسرے حصے میں آپ نے اس بات کا اعادہ کیا ہے جو اس سے پہلے اپنے خط نمبر ۲ میں آپ بیان فرما چکے ہیں اور میں اس کا جواب عرض کر چکا ہوں۔ شبہ ہوتا ہے کہ آپ میرے جوابات کو غور سے پڑھتے بھی نہیں ہیں اور ایک ہی طرح کے سوالات کو دہراتے چلے جاتے ہیں۔

ایمان و کفر کا مدار

آپ کا ساتواں سوال یہ ہے:

"اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق یہ کہہ دے کہ وہ

ا۔ ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ

"منزل من اللہ" نہیں ہے تو آپ اس سے متفق ہوں گے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے کسی حدیث کے متعلق یہ کہے کہ وہ خدا کی وحی نہیں تو کیا وہ بھی اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں سے جن سنتوں کی شہادت ملتی ہے ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے سنت ہونے پر امت شروع سے آج تک متفق رہی ہے' یعنی بالفاظ دیگر وہ متواتر سنتیں ہیں اور امت کا ان پر اجماع ہے۔ ان میں سے کسی کو ماننے سے جو شخص بھی انکار کرے گا وہ اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا جس طرح قرآن کی کسی آیت کا انکار کرنے والا خارج از اسلام ہو گا۔ دوسری قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے ثبوت میں اختلاف ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی سنتوں میں سے کسی کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری تحقیق میں فلاں سنت ثابت نہیں ہے اس لیے میں اسے قبول نہیں کرتا تو اس قول سے اس کے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہ آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم علمی حیثیت سے اس کی رائے کو صحیح سمجھیں یا غلط۔ لیکن اگر وہ یہ کہے کہ یہ واقعی سنت رسولؐ ہو بھی تو میں اس کی اطاعت کا پابند نہیں ہوں تو اس کے خارج از اسلام ہونے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں' کیونکہ وہ رسولؐ کی حیثیت حکمرانی (Authority) کو چیلنج کرتا ہے جس کی کوئی گنجائش دائرۂ اسلام میں نہیں ہے۔

کیا احکام سنت میں ردوبدل ہو سکتا ہے؟

آپ کا آٹھواں سوال یہ ہے:

"رسول اللہ (صلعم) نے دین کے احکام کی بجاآوری کے لیے جو صورتیں تجویز فرمائی ہیں کیا کسی زمانے کی مصلحتوں کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا اس قسم کا ردوبدل قرآن کی جزئیات میں بھی کیا جا سکتا ہے؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنی احکام کے جزئیات ہوں یا ثابت شدہ سنت رسولؐ کے کسی حکم کی جزئیات، دونوں کے اندر صرف اسی صورت میں اور اسی حد تک رد و بدل ہو سکتا ہے جب اور جس حد تک حکم کے الفاظ کسی رد و بدل کی گنجائش دیتے ہوں، یا کوئی دوسری نص ایسی ملتی ہو جو کسی مخصوص حالت کے لیے کسی خاص قسم کے احکام میں رد و بدل کی اجازت دیتی ہو۔ اس کے ماسوا کوئی مومن اپنے آپ کو کسی حال میں بھی خدا اور رسولؐ کے احکام میں رد و بدل کر لینے کا مختار و مجاز تصور نہیں کر سکتا۔ البتہ ان لوگوں کا معاملہ دوسرا ہے جو اسلام سے نکل کر مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ ان کا طریق کار یہی ہے کہ پہلے رسول کو آئین و قانون سے بے دخل کر کے "قرآن بلا محمدؐ" کی پیروی کا نرالا مسلک ایجاد کریں، پھر قرآن سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس کی ایسی من مانی تاویلات شروع کر دیں جنہیں دیکھ کر شیطان بھی اعتراف کمال پر مجبور ہو جائے۔

خاکسار ---- ابوالاعلیٰ

اعتراضات اور جوابات

(پچھلی مراسلت کے بعد ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا جو طویل خط وصول ہوا تھا، اسے رسالہ ترجمان القرآن کے منصب رسالت نمبر میں شائع کیا جا چکا ہے۔ اب یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ اس لمبی چوڑی بحث کو، جو بکثرت فضولیات سے بھری ہوئی ہے، یہاں نقل کیا جائے۔ اس لیے فائدہ عام کی خاطر صاحب موصوف کی غیر متعلق باتوں کو چھوڑ کر صرف ان کے اصل اعتراضات کو یہاں خلاصتہً درج کیا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ ہر اعتراض کا جواب بھی دیا جا رہا ہے تاکہ ناظرین پوری طرح منکرین حدیث کے حربوں سے آگاہ ہو جائیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ حربے کس قدر کمزور ہیں)۔

۱۔ بزم طلوع اسلام سے تعلق؟

اعتراض: "آپ نے خط و کتابت کی ابتدا میں مجھے "بزم طلوع اسلام" کا

نمایاں فرد قرار دیا تھا۔ اس پر میں نے آپ کو لکھا تھا کہ میں بزم طلوع اسلام کا اہم فرد تو درکنار اس کا ابتدائی یا معمولی رکن تک نہیں اور تاکیداً لکھا تھا کہ آپ اس وضاحت کو شائع کریں۔ آپ نے اسے شائع نہ کیا' بلکہ شائع شدہ خط و کتابت میں اس کا اشارہ تک نہ کیا' حالانکہ دیانت کا تقاضا تھا کہ آپ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور معذرت چاہتے"۔

جواب: ڈاکٹر صاحب کی اس شکایت کا جواب خود طلوع اسلام کے صفحات میں کسی اور کی زبانی نہیں بلکہ جناب پرویز صاحب کی زبان سے سننا زیادہ بہتر ہو گا۔ ۸' ۹' ۱۰ اپریل ۱۹۶۰ء کو لاہور میں طلوع اسلام کنونشن کی چوتھی سالانہ کانفرنس ہوئی تھی۔ اس میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی تقریر سے پہلے پرویز صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

> "ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ہمارے لیے باعث فخر ہے..... اور ان کا سب سے بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ یہ میرے درس قرآنی اور تاریخی کلاس کے ہر لیکچر کا ایک ایک حرف ضبط تحریر میں لے آئے ہیں۔ یہ کام بڑی صبر آزما مشقت کا طالب علم تھا جسے یہ اس حسن مسرت سے سرانجام دے رہے ہیں"۔ (طلوع اسلام' مئی' جون ۱۹۶۰ء' صفحہ ۲۵)

اب اگر ڈاکٹر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ بزم طلوع اسلام کا ابتدائی رکن بھی نہیں ہوں تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گاندھی جی فرماتے تھے کہ میں کانگرس کا چار آنے والا ممبر بھی نہیں ہوں۔ ہر شخص جو طلوع اسلام کی تبلیغ سے واقف ہے' اس مراسلت کو پڑھ کر خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زبان سے طلوع اسلام ہی بول رہا ہے یا کوئی اور۔

۲۔ کیا گشتی سوال نامے کا مقصد علمی تحقیق تھا؟

اعتراض: آپ لکھتے ہیں کہ "آپ نے یہ مراسلت واقعی بات سمجھنے کے لیے کی ہوتی تو سیدھی بات سیدھی طرح آپ کی سمجھ میں آ جاتی۔ لیکن

آپ کی تو سکیم ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے اپنے ابتدائی سوالات میرے پاس بھیجنے کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے علماء کے پاس بھی اس امید پر بھیجے تھے کہ ان سے مختلف جوابات حاصل ہوں گے اور پھر ان کا مجموعہ شائع کرکے یہ پروپیگنڈہ کیا جا سکے گا کہ علماء سنت سنت تو کرتے ہیں مگر دو عالم بھی سنت کے بارے میں ایک متفق رائے نہیں رکھتے"۔ (ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۶۰ء)

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو میری اس "سکیم" کا علم کیسے ہوا؟ کیا آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ میری نیت وہی تھی جسے آپ میری طرف منسوب کر رہے ہیں؟"

جواب: آدمی کی نیت کا براہ راست علم تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ انسان جس چیز سے کسی شخص کی نیت کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ اس شخص کا عمل، اور ان لوگوں کا مجموعی طرز عمل ہے جن کے ساتھ مل کر وہ کام کر رہا ہو۔ ڈاکٹر صاحب مخالفین سنت کے جس گروہ سے تعاون کر رہے ہیں وہ ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے کے لیے لگا رہا ہے کہ سنت ایک مشتبہ اور مختلف فیہ چیز ہے۔ اس غرض کے لیے جس طرز کا پروپیگنڈہ ان لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے اس پر طلوع اسلام کے صفحات اور اس ادارے کی مطبوعات شاہد ہیں۔ ان کاموں کو دیکھ کر یہ رائے بمشکل ہی قائم کی جا سکتی ہے کہ اسی گروہ کے ایک ممتاز فرد جناب ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی طرف سے علماء کرام کے نام جو گشتی سوال نامہ بھیجا گیا تھا، وہ خالص علمی تحقیق کی خاطر تھا۔

۳۔ رسول کی حیثیت و حیثیت نبویؐ

اعتراض: "اپنی کتاب "تفہیمات" میں آپ نے یہ فرمایا تھا کہ قرآن میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر حضورؐ کی رسالت کی حیثیت اور شخصی حیثیت میں کوئی فرق کیا گیا ہو اور اب آپ

فرماتے ہیں کہ جو کچھ حضورؐ نے رسول کی حیثیت سے کیا تھا وہ سنت واجب الاتباع ہے' اور جو کچھ آپ نے شخصی حیثیت سے کیا تھا وہ واجب الاتباع سنت نہیں۔ اس طرح آپ دو متضاد باتیں کہتے ہیں"۔

جواب: اسی مراسلت کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب اس بحث کو پہلے چھیڑ چکے ہیں اور ان کو اس کا جواب دیا جا چکا ہے (ملاحظہ ہو' کتاب ہذا' صفحہ ۵۳۔۵۴)۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ اگر وہ اس مسئلے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو میرا مضمون "رسول کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی" مندرجہ ترجمان القرآن' دسمبر ۱۹۵۹ء ملاحظہ فرما لیں' جس میں پوری وضاحت کے ساتھ اس مسئلے کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ چونکہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں منکرین حدیث لوگوں کے ذہن میں طرح طرح کی غلط فہمیاں ڈالتے رہتے ہیں اس لیے یہاں اس مضمون کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا جو حکم دیا ہے وہ آپ کے کسی ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ آپؐ کو اس نے اپنا رسول بنایا ہے۔ اس لحاظ سے باعتبار نظریہ تو آپ کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں یقیناً فرق ہے۔ لیکن عملاً چونکہ ایک ہی ذات میں شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت دونوں جمع ہیں' اور ہم کو آپ کی اطاعت کا مطلق حکم دیا گیا ہے' اس لیے ہم بطور خود یہ فیصلہ کر لینے کے مجاز نہیں ہیں کہ ہم حضورؐ کی فلاں بات مانیں گے کیونکہ وہ بحیثیت رسولؐ آپ نے کی یا کہی ہے' اور فلاں بات نہ مانیں گے کیونکہ وہ آپؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کام خود حضورؐ ہی کا تھا کہ شخصی نوعیت کے معاملات میں آپ نہ صرف لوگوں کو آزادی عطا فرماتے تھے بلکہ آزادی برتنے کی تربیت بھی دیتے تھے اور جو معاملات رسالت سے تعلق رکھتے تھے ان میں آپؐ بے چون و چرا اطاعت کراتے تھے۔ اس معاملہ

میں ہم کو جو کچھ بھی آزادی حاصل ہے۔ وہ رسول پاکؐ کی دی ہوئی آزادی ہے جس کے اصول اور حدود حضورؐ نے خود بتا دیے ہیں۔ یہ ہماری خود مختارانہ آزادی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بات کو مزید واضح کرنے کے لیے میں نے عرض کیا تھا:

"جو معاملات بظاہر بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا، پینا، کپڑے پہننا، نکاح کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل اور طہارت اور رفع حاجت وغیرہ۔ وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں خالص نجی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں بلکہ انہی میں شرعی حدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے.... مثلاً حضورؐ کے لباس اور آپ کے کھانے پینے کے معاملہ کو لیجیے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپؐ ایک خاص وضع قطع کا لباس پہنتے تھے جو عرب میں اس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپؐ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا۔ اسی طرح آپؐ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپ کے عہد میں اہل عرب کے گھروں میں پکتے تھے اور ان کے انتخاب میں بھی آپؐ کے اپنے ذوق کا دخل تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ اسی کھانے اور پہننے میں آپؐ اپنے عمل اور قول سے شریعت کے حدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضورؐ ہی کے سکھائے ہوئے اصول شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہلی چیز آپؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری چیز حیثیت نبویہ ہے۔ اس لیے کہ شریعت نے، جس کی تعلیم دینے کے لیے آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اس معاملہ کو اپنے دائرۂ عمل میں نہیں لیا ہے کہ لوگ اپنے لباس کس تراش خراش اور وضع قطع پر سلوائیں اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں۔ البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرۂ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملہ میں حرام اور حلال، اور جائز اور ناجائز کے حدود معین کرے اور لوگوں کو ان آداب کی تعلیم دے جو اہل ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں"۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے آخری بات جو میں نے لکھی تھی، وہ یہ ہے:

"حضورؐ کی شخصی اور نبوی حیثیتوں میں حقیقت کے اعتبار سے جو بھی فرق ہے وہ عبداللہ اور عبدالرسول ہے' اور ہمیں اس سے اس لیے آگاہ کیا گیا ہے کہ ہم کہیں عقیدے کی گمراہی میں مبتلا ہو کر محمد بن عبداللہ کو اللہ کے بجائے مطاع حقیقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ لیکن امت کے لیے تو عملاً آپ کی ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت۔ حتیٰ کہ محمدؐ بن عبداللہ کے مقابلے میں اگر ہم کو آزادی حاصل بھی ہوتی ہے تو وہ محمدؐ رسول اللہ کے عطا کرنے سے ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ ہی اس کے حدود متعین کرتے ہیں اور اس آزادی کے استعمال کی تربیت بھی ہم کو محمدؐ رسول اللہ ہی نے دی ہے"۔

ان عبارات کو جو شخص بھی ہٹ دھرمی سے پاک ہو کر پڑھے گا وہ خود رائے قائم کر لے گا کہ منکرین حدیث جس الجھن میں پڑے ہوئے ہیں' اس کا اصل سرچشمہ میری عبارت میں ہے یا ان کے اپنے ذہن میں۔

۴۔ تعلیمات سنت میں فرق مراتب

اعتراض: جن باتوں کے متعلق آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حضورؐ نے انہیں بحیثیت رسول' ارشاد فرمایا گیا تھا' ان کے اتباع میں بھی پہلے آپ نے فرق کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے تفہیمات حصہ اول' صفحہ ۲۷۹ پر لکھا ہے:

"جو امور براہ راست دین اور شریعت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تو حضورؐ کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق النعل بالنعل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل۔ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا ہے اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو براہ راست دین سے تعلق نہیں رکھتے' مثلاً تمدنی' معاشی اور سیاسی معاملات اور معاشرے کے جزئیات تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی حضورؐ نے تاکید فرمائی

ہے۔ بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ نے حکمت اور نصیحت کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے طرزِ عمل سے ہمیں مکارمِ اخلاق اور تقویٰ و پاکیزگی کا سبق ملتا ہے اور ہم آپ کے طریقہ کو دیکھ کر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے"۔

لیکن اب آپ کا موقف یہ ہے کہ اس طرح کی تفریق صحیح نہیں ہے۔

جواب: اس عبارت میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ سنت سے جو تعلیمات ہم کو ملتی ہیں۔ وہ سب ایک ہی درجے اور مرتبے کی نہیں ہیں' بلکہ ان کے درمیان فراق مراتب ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح خود قرآن مجید کی تعلیمات میں بھی فرق مراتب ہے۔ ہدایت کے ان دونوں سرچشموں سے جو کچھ ہمیں ملا ہے وہ سب ایک ہی درجے میں فرض و واجب نہیں ہے۔ نہ ہر حکم کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ کو جوں کا توں ہر حال میں نافذ کیا جائے۔ مثال کے طور پر خود قرآن میں دیکھیے کہ ایک طرف اقیموا الصلٰوۃ واتوا الزکوۃ فرمایا گیا ہے جو یقیناً فرض و واجب ہے۔ لیکن اسی طرح کے صیغہ امر میں فرمایا فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنٰی وثلٰث وربٰع اور واذا حللتم فاصطادوا۔ یہ دونوں ارشادات صیغہ امر میں ہونے کے باوجود صرف اباحت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر بحث کی خاطر یہ گفتگو نہ کر رہے ہوتے تو ان کے لیے بات کو سمجھنا اس قدر مشکل نہ تھا۔ "تفہیمات" کے جس مضمون (رسالت اور اس کے احکام) سے یہ عبارت انہوں نے نقل کی ہے اس کو نکال کر پڑھے۔ اس میں اس عبارت سے متصل ہی یہ فقرے موجود ہیں:

"پس اگر کوئی شخص نیک نیتی کے ساتھ حضورؐ کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپؐ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا اتباع طابق النعل بالنعل ہونا

چاہیے' اور کن امور میں آپ کے ارشادات اور اعمال سے اصول اخذ کر کے قوانین وضع کرنے چاہئیں اور کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام اصول مستنبط کرنے چاہئیں"۔

میں ناظرین سے گزارش کروں گا کہ اگر وہ میری یہ کتاب فراہم کر سکیں تو اس پورے مضمون کو ملاحظہ فرمائیں تاکہ منکرین حدیث کے ذہن کی وہ اصل کیفیت ان کے سامنے بے نقاب ہو جائے جس کے زیر اثر انہوں نے ٹھیک اسی مضمون میں اپنی الجھن کا سامان تلاش کیا ہے جو ان کی بیشتر الجھنوں کو رفع کر سکتا تھا۔ البتہ اس مضمون کو پڑھتے وقت یہ بات ملحوظ رکھیں کہ اس میں جن پرویز صاحب کا ذکر ہے وہ ۱۹۳۵ء کے پرویز صاحب ہیں نہ کہ آج کے۔ اس وقت وہ گمراہی کے بالکل ابتدائی سرے پر تھے اور آج معاملہ فی ضلال بعید سے گزر کر ضلالت کی پیشوائی تک پہنچ چکا ہے۔

۵۔ علمی تحقیق یا جھگڑالو پن؟

اعتراض : "ایک طرف آپ تفہیمات میں فرماتے ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق براہ راست دین اور شریعت سے ہے لیکن تمدنی' معاشی اور سیاسی معاملات کا تعلق براہ راست دین سے نہیں ہے۔ اور دوسری طرف آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ "اقامت دین سے مراد ہی اسلام کے مطابق تمدنی' معاشی' سیاسی نظام قائم کرنا ہے"۔ حیرت ہے کہ اگر ان امور کا تعلق براہ راست دین سے نہیں تو پھر اقامت دین سے مراد ان امور سے متعلق نظام قائم کرنا کیسے ہو گا۔ اس کے بعد اس حقیقت پر غور کیجئے کہ آئین مملکت میں جن امور سے بحث ہو گی ان کا تعلق ملک کے تمدنی' معاشی' معاشرتی مسائل سے ہو گا۔ اگر ان امور کا تعلق براہ راست دین سے نہیں تو پھر آئین مملکت کے دینی یا غیر دینی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز اگر ان امور میں سنت رسول اللہ کا اتباع اس نوعیت کا نہیں جس نوعیت کا اتباع ان امور میں ضروری ہے جو

(بقول آپ کے، براہ راست دین سے متعلق ہیں، مثلاً نماز روزہ وغیرہ) تو پھر ان کے متعلق یہ سوال بھی کیا اہمیت رکھے گا کہ یہ سنت کے مطابق ہیں یا نہیں"۔

جواب: میری کتاب "تفہیمات" میں بعض امور کے دین سے براہ راست متعلق ہونے اور بعض کے براہ راست متعلق نہ ہونے کا جو ذکر آیا ہے اسے پورے مضمون سے الگ نکال کر ڈاکٹر صاحب یہ غلط معنی پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں سیاسی و تمدنی اور معاشی مسائل کو دین سے قطعاً غیر متعلق قرار دے رہا ہوں۔ حالانکہ وہاں جن امور کو میں نے دین سے "براہ راست" متعلق قرار دیا ہے ان سے میری مراد وہ عبادات ہیں جنہیں شارع نے "ارکان اسلام" کی حیثیت دی ہے، یعنی نماز، روزہ اور حج وزکوٰۃ۔ دوسری طرف جن امور کو میں نے کہا ہے کہ وہ دین سے "براہ راست" متعلق نہیں ہیں ان سے مقصود ارکان اسلام کے ماسوا دوسرے امور ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ دین سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ اگر وہ واقعی غیر متعلق ہوتے تو ان کے متعلق قرآن و سنت میں شرعی احکام پائے ہی کیوں جاتے۔

ڈاکٹر صاحب میری جس عبارت سے یہ نتائج نکال رہے ہیں، اس کے صرف دو فقروں (دین سے "براہ راست تعلق ہے" اور "براہ راست تعلق نہیں ہے") کو انہوں نے پکڑ لیا ہے اور اُنہی پر اپنے تخیلات کی ساری عمارت تعمیر کرنی شروع کر دی ہے۔ حالانکہ خود اس عبارت میں ان کے ان نتائج کی تردید موجود ہے۔ اس میں صاف صاف یہ بتایا گیا ہے کہ دوسری قسم کے معاملات میں مختلف مدارج کی تعلیمات ہم کو حضورؐ سے ملی ہیں۔ "ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، بعض ایسی ہیں......" کیا ان فقروں سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ جن کاموں کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جن سے منع فرمایا ہے، ان کے بارے میں حضورؐ کے فرمان کی خلاف ورزی کرنا جائز ہے؟ یا حضورؐ کی دوسری ہدایات نظرانداز کی جا سکتی ہیں۔

رہے وہ الفاظ جن سے آج ڈاکٹر صاحب ناروا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ بات قابل ذکر ہے کہ اب سے بہت پہلے میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ کوئی فتنہ پرداز انہیں غلط معنی پہنا سکتا ہے۔ چنانچہ تفہیمات حصہ اول کے پانچویں ایڈیشن (ستمبر ۱۹۴۹ء) کو ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں ان کے بجائے یہ الفاظ لکھے گئے ہیں: "جو امور فرائض و واجبات اور تقالید شرعیہ کی نوعیت رکھتے ہیں...... رہے وہ امور جو اسلامی زندگی کی عام ہدایات سے تعلق رکھتے ہیں"۔ یہ اصلاح میں نے اسی لیے کی تھی کہ تمدنی و معاشی اور سیاسی معاملات کو دین سے غیر متعلق سمجھنے کا خیال، جو میرے سابق الفاظ سے نکالا جا سکتا تھا، رفع ہو جائے۔ مزید برآں ایک مضمون کا پورا مدعا صرف اس کے دو فقروں سے تو اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پورے مضمون کو کوئی شخص پڑھے تو اس پر واضح ہو جائے کہ اس کا مدعا اس مطلب کے بالکل خلاف ہے جو ڈاکٹر صاحب اس کے دو فقروں سے نکال رہے ہیں۔ تحقیق کی خاطر جو شخص بحث کرتا ہے وہ آدمی کی پوری بات سن کر اس کے مجموعی مفہوم پر کلام کیا کرتا ہے۔ کہیں سے ایک دو لفظ پکڑ کر ان کو متعنا محض جھگڑالو پن ہے۔

۶۔ رسول کی دونوں حیثیتوں میں امتیاز کا اصول اور طریقہ

اعتراض: اگر حضورؐ کی پیغمبرانہ حیثیت اور شخصی حیثیت میں فرق کیا جائے گا تو لازماً اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں فرق کون کرے گا؟ اگر آئندہ اس کے لیے امت کو اہل علم کی طرف رجوع کرنا ہو گا تو اہل علم میں باہمی سخت اختلافات ہیں۔ ان میں سے کس کی تحقیق کو صحیح مانا جائے اور کسے غلط؟ یہ پوزیشن کس قدر کمزور ہے۔ اس کا خود آپ کو بھی اعتراف ہے۔ چنانچہ آپ نے لکھا ہے:

"احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرے میں ڈالنا

ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور اس کے دین میں اس قدر اہم ہوں کہ ان سے کفر اور ایمان کا فرق واقع ہوتا ہو' انہیں صرف چند انسانوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کی تو نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے۔ اللہ کا رسول انہیں اپنے پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر مسلمان تک پہنچا دیئے گئے ہوں"۔ (رسائل و مسائل' صفحہ ٦٧)

جواب: دراصل یہ سوال ناقہمی پر مبنی ہے کہ آنحضورؐ کی حیثیت نبوی اور حیثیت شخصی میں فرق کون کرے گا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول شریعت ہم کو دیئے ہیں ان کی بنا پر یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ حضورؐ کی حیات طیبہ میں سے کیا چیز حضورؐ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی ہے اور کیا چیز آپ کی نبوی حیثیت سے متعلق ہے' بشرطیکہ جو شخص اس بارے میں رائے قائم کرنے بیٹھے اس نے قرآن اور سنت اور فقہ اسلامی کے اصول و فروع کا مطالعہ کرنے میں اپنی زندگی کا کوئی حصہ صرف کیا ہو۔ یہ کام بہرحال عامیوں کے کرنے کا نہیں ہے۔ رہے اہل علم کے اختلافات' تو معلوم ہونا چاہئے کہ اہل علم جب کبھی کسی چیز کو سنت قرار دینے یا نہ قرار دینے میں اختلاف کریں گے' لامحالہ ان میں سے ہر ایک اپنی دلیل دے گا۔ یونہی اٹھ کر ایک دعویٰ نہیں کر دے گا۔ اسے یہ بتانا ہو گا کہ اصول شریعت میں سے کس قاعدے یا ضابطے کی بنا پر وہ کسی چیز کو سنت قرار دے رہا ہے یا اس کے سنت ہونے سے انکار کر رہا ہے۔ اس صورت میں جو وزنی بات ہو گی وہی ٹھیر سکے گی اور جو بات بھی ٹھیرے گی اس کے متعلق سب اہل علم کو معلوم ہو گا کہ وہ کن دلائل کی بنا پر ٹھیری ہے۔ اس نوعیت کے اختلافات اگر باقی بھی رہ جائیں تو وہ کوئی گھبرانے کے قابل چیزیں نہیں ہیں۔ انہیں خواہ مخواہ ایک ہوا بنانے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے۔

رہی میری وہ عبارت جو "رسائل و مسائل" سے نقل کی گئی ہے' تو اس کا

مفہوم اس کے الفاظ ہی سے ظاہر ہے۔ تعجب ہے کہ اسے سمجھنے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی گئی اور غلط بحث کے لیے اسے یہاں نقل کر دیا گیا۔ اس عبارت میں تو بحث اس بات پر کی گئی ہے کہ جن عقائد پر کسی شخص کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے' ان کے ثبوت کے لیے محض اخبار آحاد کافی نہیں ہیں۔ ان کے لیے یا تو قرآن سے ثبوت ملنا چاہئے' یا متواتر روایات سے' یا کم از کم ایسی روایات سے جو متواتر المعنی ہوں' یعنی بکثرت مختلف راویوں کے بیانات متفقہ طور پر یہ بتاتے ہیں کہ حضورؐ فلاں عقیدے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جزئی و فروعی احکام کے ثبوت کے لیے تو اخبار آحاد بھی کافی ہو سکتے ہیں جبکہ وہ صحیح سند سے مروی ہوں' لیکن کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے والے امور کے لیے بہت زیادہ قوی شہادت کی ضرورت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قتل کے مقدمے میں ایک شخص کو پھانسی پر چڑھا دینے کے لیے بہت زیادہ مضبوط قرائن و شواہد درکار ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے ایک کم درجے کے معاملے کا فیصلہ کم تر درجے کی شہادتوں پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ احادیث قرآن کی طرح لکھوائی کیوں نہ گئیں؟

> اعتراض: "اگر وحی منزل من اللہ کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو یا وحی جلی اور دوسری وحی غیر متلو یا وحی خفی' تو کیا یہ چیز رسول اللہؐ کے فریضہ رسالت میں داخل نہ تھی کہ حضورؐ وحی کے اس دوسرے حصے کو بھی خود مرتب فرما کر محفوظ شکل میں امت کو دے کر جاتے جس طرح حضورؐ نے وحی کے پہلے حصے (قرآن) کو امت کو دیا تھا۔

جواب: منکرین حدیث یہ سوال عموماً بڑے زور شور سے اٹھاتے ہیں اور اپنے خیال میں اسے بڑا لاجواب سوال سمجھتے ہیں۔ ان کا تصور یہ ہے کہ قرآن چونکہ لکھوایا گیا تھا اس لیے وہ محفوظ ہے' اور حدیث چونکہ حضورؐ نے خود لکھوا کر مرتب نہیں کر دی اس لیے وہ غیر محفوظ ہے۔ لیکن میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر حضورؐ نے قرآن مجید کو محض لکھوا کر چھوڑ دیا ہوتا اور ہزاروں آدمیوں نے اسے یاد کر کے بعد کی نسلوں کو زبانی نہ پہنچایا ہوتا تو کیا محض وہ لکھی ہوئی دستاویز بعد کے لوگوں

کے لیے اس بات کا قطعی ثبوت ہو سکتی تھی کہ یہ وہی قرآن ہے جو حضورؐ نے لکھوایا تھا؟ وہ تو خود محتاج ثبوت ہوتی' کیونکہ جب تک کچھ لوگ اس بات کی شہادت دینے والے نہ ہوتے کہ یہ کتاب ہمارے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوائی تھی' اس وقت تک اس لکھی ہوئی کتاب کا معتبر ہونا مشتبہ رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تحریر پر کسی چیز کے معتبر ہونے کا دارومدار نہیں ہے بلکہ وہ اسی وقت معتبر ہوتی ہے جبکہ زندہ انسان اس کے شاہد ہوں۔ اب اگر فرض کیجیے کہ کسی معاملے کے متعلق تحریر موجود نہیں ہے مگر زندہ انسان اس کے شاہد موجود ہیں' تو کسی قانون دان سے پوچھ لیجیے' کیا ان زندہ انسانوں کی شہادت ساقط الاعتبار ہو گی جب تک کہ تائید میں ایک دستاویز نہ پیش کی جائے؟ شاید آپ کو قانون کا علم رکھنے والا ایک شخص بھی ایسا نہ ملے گا جو اس سوال کا جواب اثبات میں دے۔ آج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھوایا ہوا قرآن مجید دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے' مگر اس سے قرآن کے مستند و معتبر ہونے پر ذرہ برابر کوئی اثر نہیں پڑتا' کیونکہ متواتر اور مسلسل زبانی روایت سے اس کا معتبر ہونا ثابت ہے۔ خود یہ بات کہ حضورؐ نے قرآن لکھوایا تھا' روایات ہی کی بنا پر تسلیم کی جا رہی ہے' ورنہ اصل دستاویز اس دعوے کے ثبوت میں پیش نہیں کی جا سکتی' اور وہ کہیں مل بھی جائے تو یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضورؐ نے لکھوائے تھے۔ لہٰذا تحریر پر جتنا زور یہ حضرات دیتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنتوں پر قائم کیا ہوا ایک پورا معاشرہ چھوڑا تھا جس کی زندگی کے ہر پہلو پر آپ کی تعلیم و ہدایات کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ اس معاشرے میں آپؐ کی باتیں سنے ہوئے' آپؐ کے کام دیکھے ہوئے اور آپؐ کے زیر ہدایت تربیت پائے ہوئے ہزاروں لوگ موجود تھے۔ اس معاشرے نے بعد کی نسلوں تک وہ سارے نقوش منتقل کیے اور ان سے وہ نسلاً بعد نسل ہم کو پہنچے۔ دنیا کے کسی مسلم اصول شہادت کی رو سے بھی یہ شہادت رد نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ نقوش کاغذ پر ثبت نہیں کیے گئے۔ انہیں ثبت کرنے کا سلسلہ حضورؐ کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔

پہلی صدی ہجری میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا اور دوسری صدی کے محدثین زندہ شہادتوں اور تحریری شہادتوں' دونوں کی مدد سے اس پورے نقشے کو ضبط تحریر میں لے آئے۔

۸۔ دجل و فریب کا ایک نمونہ

اعتراض: وحی کا دوسرا حصہ' جس کی حفاظت کے متعلق آپ اب فرماتے ہیں کہ اس اہتمام کے پیچھے بھی وہی خدائی تدبیر کارفرما ہے' جو قرآن کی حفاظت میں کارفرما رہی ہے اور اس کو جو شخص چیلنج کرتا ہے۔ وہ دراصل قرآن کی صحت کو چیلنج کرنے کا راستہ اسلام کے دشمنوں کو دکھاتا ہے"۔ اس کی کیفیت کیا ہے؟ اس کے متعلق مجھ سے نہیں' خود اپنے ہی الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔ آپ نے رسائل و مسائل ۲۷۰ پر لکھا ہے:

"قول رسول اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں' لازماً ایک ہی چیز نہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیات قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں"۔

جواب: ذرا اس دیانت کو ملاحظہ فرمایا جائے کہ اس کے بعد کے فقرے دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں جن اصحاب کے پاس رسائل و مسائل حصہ اول موجود ہو وہ نکال کر دیکھ لیں' اس فقرے کے بعد متصلاً یہ عبارت موجود ہے۔

"جو سنتیں تواتر کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں' یا جو روایات محدثین کی مسلمہ شرائط تواتر پر پوری اترتی ہیں' وہ یقیناً ناقابل انکار حجت ہیں۔ لیکن غیر متواتر روایات سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے

اصول میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ غیر متواتر روایات احکام کی ماخذ تو ہو سکتی ہیں لیکن ایمانیات (یعنی جن سے کفر و ایمان کا فرق واقع ہوتا ہے) کی ماخذ نہیں ہو سکتیں"۔

یہ اخلاقی جسارت واقعی قابل داد ہے کہ مجھے خود میری ہی عبارتوں سے دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے۔

۹۔ حدیث میں کیا چیز مشکوک ہے اور کیا مشکوک نہیں ہے

اعتراض: "قرآن کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے شروع میں ہی یہ کہہ دیا کہ ذالک الکتب لاریب فیہ کہ اس کتاب میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور وحی کے دوسرے حصے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں اس شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں؟ کیا خدا کی حفاظت اسی کا نام ہے؟

جواب: واقعہ یہ ہے کہ منکرین حدیث نے علوم حدیث کا سرسری مطالعہ تک نہیں کیا ہے اس لیے وہ بار بار ان مسائل پر الجھتے ہیں جنہیں ایک اوسط درجے کا مطالعہ رکھنے والا آدمی بھی ہر الجھن کے بغیر صاف صاف سمجھتا ہے۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے، انہیں سمجھانا تو میرے بس میں نہیں ہے، کیونکہ ان میں سمجھنے کی خواہش کا فقدان نظر آتا ہے۔ لیکن عام ناظرین کی تفہیم کے لیے میں عرض کرتا ہوں کہ دو باتوں کو اگر آدمی اچھی طرح جان لے تو اس کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہو سکتی:

ایک یہ کہ وحی کی دو بڑی قسمیں ہیں: ایک، وہ جو اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی گئی تھی تاکہ آپؐ انہی الفاظ میں اسے خلق تک پہنچا دیں۔ اس کا نام وحی متلو ہے، اور اس نوعیت کی تمام وحیوں کو اس کتاب پاک میں جمع کر دیا گیا ہے جسے قرآن کے نام سے ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسری قسم کی وحی وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے نازل کی جاتی تھی تاکہ اس کی روشنی میں آپؐ خلق کی رہنمائی فرمائیں۔ اسلامی نظام حیات کی

تعمیر فرمائیں' اور اسلامی تحریک کی قیادت کے فرائض انجام دیں۔ یہ وحی لوگوں کو لفظاً لفظاً پہنچانے کے لیے نہ تھی' بلکہ اس کے اثرات حضورؐ کے اقوال و افعال میں بے شمار مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتے تھے اور حضورؐ کی پوری سیرت پاک اس کے نور کا مظہر تھی۔ یہی چیز ہے جسے سنت بھی کہا جاتا ہے اور وحی غیر متلو بھی' یعنی "وہ وحی جو تلاوت کے لیے نہیں ہے"۔

دوسری بات یہ کہ دین کا علم جن ذرائع سے ہمیں ملا ہے ان کی ترتیب اس طرح ہے سب سے پہلے قرآن! پھر وہ سنتیں جو تواتر عملی کے ساتھ حضورؐ سے منقل ہوئی ہیں' یعنی جن پر شروع سے آج تک امت میں مسلسل عمل ہوتا رہا ہے۔ پھر آپؐ کے وہ احکام اور آپؐ کی وہ تعلیمات و ہدایات جو متواتر یا مشہور روایات کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں۔

پھر وہ اخبار آحاد جن کی سند بھی قابل اعتماد ہے' جو قرآن اور متواترات سے بھی مطابقت رکھتی ہیں اور باہم ایک دوسرے کی تائید و تشریح بھی کرتی ہیں۔ پھر وہ اخبار آحاد جو سند کے اعتبار سے بھی صحیح ہیں اور کسی قابل اعتماد چیز سے متصادم بھی نہیں ہیں۔

ان ذرائع سے جو کچھ بھی ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے وہ شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی قول یا فعل جو حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا قول و فعل ہے یا نہیں۔ یہ سوال دراصل ان روایات کے بارے میں پیدا ہوتا ہے:

(۱) جن کی سند تو قوی ہے مگر ان کا مضمون کسی زیادہ معتبر چیز سے متصادم نظر آتا ہے۔

(۲) جن کی سند قوی ہے مگر وہ باہم متصادم ہیں اور ان کا تصادم رفع کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

(۳) جن کی سند قوی ہے مگر وہ منفرد روایتیں ہیں اور معنی کے لحاظ سے ان کے اندر کچھ غرابت محسوس ہوتی ہے۔

(۴) جن کی سند میں کسی نوعیت کی کمزوری ہے مگر متن میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

(۵) جن کی سند میں بھی کلام کی گنجائش ہے اور متن میں بھی۔

اب اگر کوئی بحث ان دوسری قسم کی روایات میں پیدا ہو تو اسے یہ دعویٰ کرنے کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ پہلی قسم کے ذرائع سے جو کچھ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے وہ بھی مشکوک ہے۔

مزید برآں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ دین میں جو چیزیں اہمیت رکھتی ہیں وہ سب ہمیں پہلی قسم کے ذرائع سے ملی ہیں اور دوسرے ذرائع سے آنے والی روایات اکثر و بیشتر محض جزوی و فروعی معاملات سے متعلق ہیں جن میں ایک مسلک یا دوسرا مسلک اختیار کر لینے سے درحقیقت کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوتا۔ ایک شخص اگر تحقیق کر کے ان میں سے کسی روایت کو سنت کی حیثیت سے تسلیم کرے، اور دوسرا تحقیق کر کے اسے سنت نہ مانے تو دونوں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو مانے جائیں گے۔ البتہ ان لوگوں کو حضورؐ کا پیرو نہیں مانا جا سکتا جو کہتے ہیں کہ حضورؐ کا قول و فعل اگر ثابت بھی ہو کہ حضورؐ ہی کا قول و فعل ہے تب بھی وہ ہمارے لیے آئین و قانون نہیں ہے۔

۱۰۔ ایک اور فریب

اعتراض: "احادیث کے "طریق حفاظت" کی کمزوری کے تو آپ خود بھی قائل ہیں جب آپ لکھتے ہیں:

"بادی النظر میں یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہیے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں۔ ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہیے۔ لیکن ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق نہیں ہو سکتے کہ ان کے درمیان یک سرمو

فرق نہ پایا جائے --- مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں بعد نہیں بلکہ چند ہی گھنٹے بعد) لوگوں سے پوچھ لیجیے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہو گا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا' کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا' کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہو گا اور تقریر کو ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہو گی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہو گا اور تقریر کے اکثر حصے لفظ بلفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہو گی اور وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا"۔ (تفہیمات' جلد اول' ص ۳۳۰)

جواب: اول تو اس اقتباس کے عین وسط میں لکیر لگا کر ایک فقرہ چھوڑ دیا گیا ہے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر خود دیکھ سکتا ہے کہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ اسے چھوڑا گیا ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے:

"اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزاء میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہو گا مگر فروعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائے گا اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہو گا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا"۔

پھر اس اقتباس کے بعد کی پوری بحث چونکہ ڈاکٹر صاحب کے شبہات کا جواب تھی اور ان سے الجھن رفع ہو سکتی تھی اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اسے چھوڑ دیا' کیونکہ انہیں تو الجھن ہی کی تلاش ہے۔ ایک مضمون میں سے جتنے فقرے الجھنے اور الجھانے کے لیے مل سکتے ہیں انہیں لے لیتے ہیں' اور جہاں سے بات سلجھنے کا خطرہ ہوتا ہے' صاف کترا کر نکل جاتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ دھوکا ایک مصنف کی

کتاب سے خود مصنف کو دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں ناظرین سے گزارش کروں گا کہ اگر تفہیمات حصہ اول انہیں بہم پہنچ جائے تو اس میں سے "حدیث کے متعلق چند سوالات" کے زیر عنوان وہ پورا مضمون نکال کر ملاحظہ فرمائیں جس سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت کے فوراً بعد جو فقرے میں نے لکھے تھے وہ یہاں بھی نقل کر دیئے جائیں تاکہ جنہیں اصل کتاب نہ مل سکے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے کرتب کی داد دے سکیں۔ وہ فقرے یہ ہیں:

"اب اگر کوئی شخص اس اختلاف کو دیکھ کر یہ کہہ دے کہ میں نے سرے سے کوئی تقریر ہی نہیں کی' یا جو تقریر کی وہ از سرتاپا غلط نقل کی گئی تو یہ صحیح نہ ہو گا بخلاف اس کے اگر تقریر کے متعلق تمام اخبار آحاد کو جمع کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس امر میں سب کے درمیان اتفاق ہے کہ میں نے تقریر کی' فلاں جگہ کی' فلاں وقت کی۔ بہت سے آدمی موجود تھے اور تقریر کا موضوع یہ تھا۔ پھر تقریر کے جن جن حصوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ اتفاق لفظاً یا معنیً پایا جائے گا' وہ زیادہ مستند سمجھے جائیں گے اور ان سب کو ملا کر تقریر کا ایک مستند مجموعہ تیار کر لیا جائے گا اور جن حصوں کے بیان میں ہر راوی منفرد ہو گا وہ نسبتاً کم معتبر ہوں گے مگر ان کو موضوع اور غلط کہہ دینا صحیح نہ ہو گا۔ تاوقتیکہ وہ تقریر کی پوری اسپرٹ کے خلاف نہ ہوں' یا کوئی اور بات ان میں ایسی نہ ہو جس کی وجہ سے ان کی صحت مشتبہ ہو جائے' مثلاً تقریر کے معتبر حصوں سے مختلف ہونا' یا مقرر کے خیالات اور انداز بیان اور افتادِ مزاج کے متعلق جو صحیح معلومات لوگوں کے پاس پہلے سے موجود ہیں ان کے خلاف ہونا"۔

۱۱۔ کیا امت میں کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے؟

اعتراض: آپ فرماتے ہیں کہ سنت کے محفوظ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وضو' پنج وقتہ نماز' اذان' عیدین کی نمازیں' نکاح و طلاق و وراثت کے قاعدے وغیرہ مسلم معاشرے میں ٹھیک اسی طرح رائج ہیں جس طرح قرآن کی آیتیں زبانوں پر چڑھی ہوں۔ کیا آپ فرمائیں گے کہ نماز اور اذان' نکاح اور طلاق اور وراثت وغیرہ میں تمام امت ایک ہی طریقے پر

عمل کر رہی ہے؟"

جواب: نماز اور اذان اور نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ امور کے متعلق جتنی چیزوں پر امت میں اتفاق ہے ان کو ایک طرف جمع کر لیجئے' اور دوسری طرف وہ چیزیں نوٹ کر لیجئے جن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ اتفاق کس قدر زیادہ ہے اور اختلاف کس قدر کم۔ بنیادی امور قریب قریب سب متفق علیہ ہیں اور اختلاف زیادہ تر جزئیات میں ہے لیکن چونکہ بحث اتفاقی امور میں نہیں بلکہ ہمیشہ اختلافی امور میں ہوتی ہے' اس لیے بحثوں نے اختلافات کو نمایاں کر دیا ہے جس کی وجہ سے کم علم لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے کہ امت میں کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لے لیجئے۔ تمام دنیا کے مسلمان ان امور پر پوری طرح متفق ہیں کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ اس کے اوقات یہ ہیں۔ اس کے لیے جسم اور لباس پاک ہونا چاہیے۔ اس کے لیے باوضو ہونا چاہیے۔ اس کو قبلہ رخ پڑھنا چاہیے۔ اس میں قیام اور رکوع اور سجدہ اور قعود اس ترتیب سے ہونا چاہیے۔ ہر وقت کی اتنی اتنی رکعتیں فرض ہیں۔ نماز کی ابتداء تکبیر تحریمہ سے ہونی چاہیے۔ نماز میں بحالت قیام فلاں چیزیں بحالت رکوع فلاں' بحالت سجود فلاں اور بحالت قعود فلاں چیزیں پڑھنی چاہئیں۔ غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی نماز کا پورا بنیادی ڈھانچہ متفق علیہ ہے۔ اختلاف صرف اس طرح کے معاملات میں ہے کہ ہاتھ باندھا جائے یا چھوڑا جائے' باندھا جائے تو سینے پر یا ناف پر' امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں' سورۂ فاتحہ کے بعد آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بنیاد بنا کر یہ دعویٰ کرنا صحیح ہو گا کہ نماز کے معاملہ میں امت سرے سے کسی متفق علیہ طریقہ پر ہے ہی نہیں؟ اذان میں اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں کہ شیعہ حی علیٰ خیر العمل کہتے ہیں اور سنی نہیں کہتے۔ باقی اذان کے تمام کلمات اور متعلقہ مسائل بالکل متفق علیہ ہیں۔ کیا اس ذرا سے اختلاف کو اس بات کی دلیل بنایا جا سکتا ہے کہ اذان بجائے خود مختلف فیہ ہے؟

۱۲۔ سنت نے اختلافات کم کیے ہیں یا بڑھائے ہیں؟

اعتراض: "اگر آپ یہ کہیں کہ حدیث پر مبنی اختلافات جزئیات کے

معمولی اختلافات ہیں' ان سے دین پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ جن جزئیات کو (بقول آپ کے) خدا کی وحی نے متعین کیا ہو کیا ان میں ذرا سا اختلاف بھی معصیت کا موجب نہیں ہو جاتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مندرج وحی کے ذریعہ حکم دیا کہ وضو میں اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھویا کرو۔ اگر کوئی شخص یا فرقہ اپنے ہاتھ صرف پہنچوں تک دھوئے تو کیا آپ کے نزدیک یہ بھی اسی طرح حکم خداوندی کی تعمیل ہو گی جس طرح اس شخص یا فرقہ کا عمل جو کہنیوں تک ہاتھ دھوئے' ارشاد باری تعالیٰ کی تعمیل کہلائے گا؟"

جواب: یہ محض ایک سطحی مغالطہ ہے۔ نص کی کھلی کھلی خلاف ورزی کا نام اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ اختلاف اس چیز کا نام ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان یہ بات مختلف فیہ ہو کہ حکم شرعی کیا ہے۔ اس کی صحیح مثال خود قرآن ہی سے حاضر ہے۔ قرآن کی آیت تیمم میں یہ فرمایا گیا ہے کہ فامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ (المائدہ:۷) "اس مٹی سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو"۔

اب دیکھئے۔ ایک شخص "ہاتھ" سے مراد پہنچے تک لیتا ہے اور اسی پر مسح کرتا ہے۔ دوسرا کہنی تک لیتا ہے اور وہاں تک ہاتھ پھیرتا ہے اور تیسرا خیال کرتا ہے کہ لفظ ہاتھ کا اطلاق تو شانے تک پورے ہاتھ پر ہوتا ہے اس لیے وہ مسح میں اسے بھی شامل کر لیتا ہے۔ بتایئے اس اختلاف کی گنجائش قرآن کے الفاظ میں ہے یا نہیں؟ پھر کیا یہ اختلاف معصیت کا موجب ہو جاتا ہے؟

منکرین حدیث کچھ عقل سے کام لیتے تو وہ خود دیکھ سکتے تھے کہ سنت نے اختلافات کے دائرے کو بہت محدود کر دیا ہے۔ ورنہ اگر سنت نہ ہوتی تو قرآن مجید سے احکام اخذ کرنے میں اتنے اختلافات ہوتے کہ دو مسلمان بھی مل کر کوئی اجتماعی عمل نہ کر سکتے۔ مثلاً قرآن بار بار صلوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ اگر سنت اس کی شکل اور طریقہ مقرر نہ کر دیتی تو لوگ ہرگز یہ طے نہ کر سکتے کہ اس حکم کی تعمیل کیسے کریں۔ قرآن زکوٰۃ کا حکم دیتا ہے۔ اگر سنت نے اس کی تشریح نہ کر دی ہوتی تو کبھی اس امر میں اتفاق نہ ہو سکتا کہ یہ فریضہ کس طرح بجا لایا جائے۔ ایسا ہی معاملہ قرآن کی اکثر و بیشتر ہدایات و احکام کا ہے کہ خدا کی طرف سے ایک بااختیار معلم (صلی اللہ

علیہ وسلم) نے ان پر عمل در آمد کی شکل بتا کر اور عملاً دکھا کر اختلافات کا سدباب کر دیا ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی اور امت صرف قرآن کو لے کر لغت کی مدد سے کوئی نظام زندگی بنانا چاہتی تو بنیادی امور میں بھی اس حد تک اتفاق رائے حاصل نہ ہو سکتا کہ کوئی مشترک تمدن بن جاتا۔ یہ سنت ہی کا طفیل ہے کہ تمام امکانی اختلافات سمٹ کر دنیائے اسلام میں آج صرف آٹھ فرقے پائے جاتے ہیں۔ اور ان میں بھی بڑے فرقے صرف پانچ ہیں جن کے اندر کروڑوں مسلمان ایک ایک فقہ پر مجتمع ہو گئے ہیں۔ اسی اجتماع کی بدولت ان کا ایک نظام زندگی بن اور چل رہا ہے لیکن منکرین حدیث سنت کے خلاف جو کھیل کھیل رہے ہیں اس میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہو گا کہ قرآن کی تفسیر و تعبیر پر سب متفق ہو جائیں گے بلکہ یہ ہو گا کہ جن امور میں آج اتفاق ہے وہ سب بھی اختلافی بن کر رہ جائیں گے۔

۱۳۔ منکرین سنت اور منکرین ختم نبوت میں مماثلت کے وجوہ

اعتراض: "آپ فرماتے ہیں کہ "اگر سنت کے متن میں اس قدر اختلافات ہیں تو قرآن کی تعبیر میں بھی تو بے شمار اختلافات ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اگر قرآن کی تعبیر میں اختلافات اسے آئین کی بنیاد قرار دینے میں مانع نہیں تو سنت کے متن کا اختلاف اس امر میں کیسے مانع ہو سکتا ہے"۔ آپ کی یہ دلیل بعینہ اس طرح کی ہے جس طرح جب مرزائی حضرات سے کہا جائے کہ مرزا صاحب کے کردار میں فلاں نقص پایا جاتا

ا اس وقت دنیائے اسلام میں صرف حسب ذیل فرقے پائے جاتے ہیں: حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، اہلحدیث، اثنا عشری، زیدی اور خارجیوں کا فرقہ اباضیہ۔ ان میں سے زیدی، اہل حدیث اور اباضیہ بہت کم تعداد میں ہیں۔ لوگوں نے خواہ مخواہ ۷۳ فرقوں کا افسانہ مشہور کر رکھا ہے حالانکہ یہ تعداد صرف کتابوں میں پائی جاتی ہے، زمین پر اس کا وجود نہیں ہے۔

ہے تو وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) رسول اللہ کی فلاں بات بھی ایسی نہیں تھی؟"

جواب: یہ تشبیہ بنیادی طور پر غلط ہے اس لیے کہ جھوٹے نبی اور سچے نبی میں درحقیقت کوئی مشابہت نہیں ہے۔ سچے نبی اور اس کی لائی ہوئی کتاب کے درمیان جو ربط و تعلق ہوتا ہے وہ نہ جھوٹے نبی اور سچے نبی کے درمیان ہو سکتا ہے اور نہ اس کے اور کتاب اللہ کے درمیان۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ تشبیہ دراصل خود ان پر اور ان کے گروہ پر صادق آتی ہے جس طرح مرزائی حضرات ایک جعلی نبی کی نبوت ثابت کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درمیان میں لاتے ہیں' اسی طرح منکرین حدیث رسول کی سنت اور کتاب اللہ کا تعلق کاٹ پھینکنے کے لیے کتاب اللہ کو استعمال کرتے ہیں جس طرح مرزائیوں نے تمام امت کے متفقہ عقیدہ ختم نبوت کے خلاف ایک نئی نبوت کا فتنہ کھڑا کیا' اسی طرح منکرین حدیث نے سنت کی آئینی حیثیت کو چیلنج کر کے ایک دوسرا خطرناک فتنہ کھڑا کر دیا۔ حالانکہ خلفائے راشدین کے عہد سے آج تک تمام دنیا کے مسلمان ہر زمانے میں اس بات پر متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد سنت دوسرا ماخذ قانون ہے' حتیٰ کہ غیر مسلم ماہرین قانون بھی بالاتفاق اس کو تسلیم کرتے ہیں' جس طرح مرزائی ختم نبوت کی غلط تاویل کر کے ایک نیا نبی سامنے لے آتے ہیں' اسی طرح منکرین حدیث اتباع سنت کی غلط تعبیر کر کے یہ راستہ نکالتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری ہدایات و تعلیمات کا دفتر لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور کسی "مرکز ملت" کو ہر زمانے میں امت کے درمیان وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔ مرزائی اپنے نبی کی نبوت کا راستہ صاف کرنے کے لیے ذات رسول اللہ میں نقص نکالتے ہیں اور منکرین حدیث اپنے مرکز ملت کے لیے راستہ بنانے کی خاطر سنت رسول کی عیب چینی کرتے ہیں۔

رہا وہ اعتراض جو میرے استدلال پر ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے' تو وہ درحقیقت بالکل بے بنیاد ہے۔ میرا استدلال یہ نہیں ہے کہ آپ سنت میں جو عیب نکال رہے ہیں وہ قرآن میں بھی موجود ہے بلکہ اس کے برعکس میرا استدلال یہ ہے کہ تعبیرو تحقیق کے اختلافات کی گنجائش ہونا سرے سے کسی آئین و قانون کے لیے عیب و نقص ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اس گنجائش کی بنا پر نہ قرآن کو اساس قانون بنانے سے انکار کیا جا سکتا ہے نہ سنت کو۔

۱۲۔ کیا آئین کی بنیاد وہی چیز ہو سکتی ہے جس میں اختلاف ممکن نہ ہو؟

اعتراض : "متن اور اس کی تعبیرات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ قرآن کریم کے متن میں کسی ایک حرف کے متعلق بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ باقی رہیں اس کی تعبیرات' سو وہ انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لیے دین کی سند اور حجت نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس احادیث کی تعبیرات میں نہیں۔ ان کے متن میں ہی اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی موجودگی میں سنت کو آئین اسلامی کا ماخذ کیسے بنایا جا سکتا ہے؟"

جواب : اصل قابل غور سوال تو یہی ہے کہ اگر کتاب کے الفاظ متفق علیہ ہوں لیکن تعبیرات میں اختلاف ہو تو وہ آئین کی بنیاد کیسے بنے گی؟ ڈاکٹر صاحب خود فرما رہے ہیں کہ "تعبیر ایک انسانی فعل ہے جو کسی دوسرے کے لیے حجت اور سند نہیں ہو سکتا"۔ اس صورت میں تو لامحالہ صرف الفاظ حجت اور سند رہ جاتے ہیں' اور معنی میں اختلاف ہو جانے کے بعد ان کا حجت و سند ہونا لاحاصل ہوتا ہے' کیونکہ عملاً جو چیز نافذ ہوتی ہے وہ کتاب کے الفاظ نہیں بلکہ اس کے وہ معنی ہوتے ہیں جنہیں کسی شخص نے الفاظ سے سمجھا ہو۔ اسی لیے میں نے اپنے دوسرے خط میں ان سے عرض کیا تھا کہ پہلے آپ اپنے اس نقطہ نظر کو بدلیں کہ "آئین کی بنیاد صرف وہی چیز بن سکتی ہے جس میں اختلاف نہ ہو سکے"۔ اس کے بعد جس طرح یہ بات طے ہو سکتی ہے کہ قرآن مجید بجائے خود اساس آئین ہو اور اس کی مختلف

تعبیرات میں سے وہ تعبیر نافذ ہو جو کسی بااختیار ادارے کے نزدیک اقرب الی الصواب قرار پائے' اسی طرح یہ بات بھی طے ہو سکتی ہے کہ سنت کو بجائے خود اساس آئین مان لیا جائے اور معاملات میں عملاً وہ سنت نافذ ہو جو کسی بااختیار ادارے کی تحقیق میں سنت ثابتہ قرار پائے۔ قرآن کے الفاظ کو اساس آئین ماننے کا فائدہ یہ ہو گا کہ تعبیر کے اختلافات کا سارا چکر صرف الفاظ قرآن کے حدود میں گھوم سکے گا' ان کے دائرے سے باہر نہ جا سکے گا۔ اسی طرح "سنت" کو اساس آئین ماننے کا فائدہ یہ ہو گا کہ ہمیں اپنے عمل کے لیے انہی ہدایات و تعلیمات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور ہیں اور ہم کوئی آزادانہ قانون سازی اس وقت تک نہ کر سکیں گے جب تک تحقیق سے ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے گا کہ فلاں مسئلے میں کوئی سنت ثابت نہیں ہے۔ یہ سیدھی سی بات سمجھنے میں آخر کیا دقت ہے۔

۱۵۔ قرآن اور سنت دونوں کے معاملہ میں رفع اختلاف کی صورت ایک ہی ہے

اعتراض: "قرآن کے متن سے احکام اخذ کرنے میں اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب دین ایک اجتماعی نظام کی جگہ انفرادی چیز بن گیا۔ جب تک دین کا اجتماعی نظام قائم رہا' اس وقت تک اس باب میں امت میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ کے زمانے میں امت کے افراد قرآن کے کسی حکم پر مختلف طریقوں سے عمل پیرا تھے؟ پھر اس قسم کا نظام قائم ہو گا تو پھر تعبیرات کے یہ اختلافات باقی نہیں رہیں گے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قرآن کے الفاظ محفوظ رہے' اگر قرآن کے الفاظ محفوظ نہ ہوتے اور مختلف فرقوں کے پاس احادیث کی طرح قرآن کے بھی الگ الگ مجموعے ہوتے تو امت میں وحدت عملی کا امکان ہی باقی نہ رہتا۔ تا وقتیکہ کوئی

دوسرا رسول آکر وحی کے الفاظ کو محفوظ طور پر انسانوں تک پہنچا دیتا"۔

جواب: کسی معاملے کو سمجھے بغیر اس پر تقریر جھاڑنے کی یہ دلچسپ مثال ہے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی لوگ قرآن مجید کی آیات میں غور و خوض کرتے تھے اور ان کے درمیان فہم و تعبیر کا اختلاف ہوتا تھا مگر اس وقت خلیفہ راشد اور مجلس شوریٰ کا بااختیار ادارہ ایسا موجود تھا جسے اقتدار بھی حاصل تھا اور امت کو اس کے علم و تقویٰ پر اعتماد بھی تھا۔ اس ادارے میں بحث و تمحیص کے بعد قرآن کے کسی حکم کی جس تعبیر کے حق میں جمہوری طریقے پر فیصلہ ہو جاتا تھا وہی قانون کی حیثیت سے نافذ ہو جاتی تھی۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے بارے میں بھی اس وقت باقاعدہ تحقیق کی جاتی تھی اور جب یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ کسی مسئلے میں حضورؐ نے یہ فیصلہ دیا تھا یا اس طرح عمل کیا تھا' تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ آج بھی اگر ایسا کوئی ادارہ موجود ہو تو وہ جس طرح قرآن کی تعبیرات میں سے وہ تعبیر اختیار کرنے کی کوشش کرے گا جو زیادہ سے زیادہ اقرب الی الصواب ہو' اسی طرح وہ احادیث کے مجموعوں میں سے ان سنتوں کو تلاش کرلے گا' جن کا زیادہ سے زیادہ اطمینان بخش ثبوت مل سکے۔

۱۶۔ ایک دلچسپ مغالطہ

اعتراض: "آپ فرماتے ہیں کہ برطانیہ کا آئین تحریری شکل میں موجود نہیں۔ پھر بھی ان کا کام کیسے چل رہا ہے۔ کیا آپ کو اس کا بھی کچھ علم ہے کہ برطانیہ کے آئین میں نت نئے دن کتنی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے ہاں کی پارلیمانی اکثریت جو تبدیلی چاہے' کر سکتی ہے۔ کیا دین کی بھی آپ کے نزدیک یہی حیثیت ہے؟ اگر دین کے آئین کے تحریری نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا تو قرآن کریم کو کیوں تحریر میں لایا گیا اور اس تحریر کی حفاظت کا ذمہ خدا نے کیوں لیا؟"

جواب: یہ ایک اور دلچسپ مغالطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ

لیا تھا نہ کہ اس تحریر کی حفاظت کا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں کاتبانِ وحی سے لکھوائی تھی۔ قرآن تو یقیناً خدا کے وعدے کے مطابق محفوظ ہے مگر کیا وہ اصل تحریر بھی محفوظ ہے جو حضورؐ نے لکھوائی تھی؟ اگر وہ منکرین حدیث کے علم میں کہیں ہے تو ضرور اس کی نشاندہی فرمائیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ تمام منکرین حدیث بار بار قرآن کے لکھے جانے اور حدیث کے نہ لکھے جانے پر اپنے دلائل کا دارومدار رکھتے ہیں' لیکن یہ بات کہ حضورؐ اپنے زمانہ میں کاتبانِ وحی سے ہر نازل شدہ وحی کو لکھوا لیتے تھے' اور اس تحریر سے نقل کر کے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کو ایک مصحف کی شکل میں لکھا گیا اور بعد میں اسی کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے شائع کیں۔ یہ سب کچھ محض حدیث کی روایات ہی سے دنیا کو معلوم ہوا ہے۔ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے' نہ حدیث کی روایات کے سوا اس کی کوئی دوسری شہادت دنیا میں کہیں موجود ہے۔ اب اگر حدیث کی روایات سرے سے قابل اعتماد ہی نہیں ہیں تو پھر کس دلیل سے آپ دنیا کو یہ یقین دلائیں گے کہ فی الواقع قرآن حضورؐ ہی کے زمانے میں لکھا گیا تھا؟

۱۷۔ شخصی قانون اور ملکی قانون میں تفریق کیوں؟

اعتراض: "آپ فرماتے ہیں کہ سنن ثابتہ کے اختلاف کو برقرار رکھتے ہوئے (پاکستان میں صحیح اسلامی آئین کے مطابق) قانون سازی کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ:

"شخصی قانون (پرسنل لاء) کی حد تک ہر ایک گروہ کے لیے احکام قرآن کی وہی تعبیر اور سنن ثابتہ کا وہی مجموعہ معتبر ہو' جسے وہ مانتا ہے اور ملکی قانون (پبلک لاء) کی تعبیر قرآن اور ان سنن ثابتہ کے مطابق ہو' جس پر اکثریت اتفاق کرے"۔

کیا میں یہ پوچھنے کی جرات کر سکتا ہوں کہ شخصی قانون اور ملکی قانون کا یہ فرق رسول اللہ یا حضورؐ کے خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی تھا؟

اور کیا قرآن کریم سے اس تفریق کی کوئی سند مل سکتی ہے؟

جواب: یہ سوالات صرف اس بنا پر پیدا ہوئے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نہ تو شخصی قانون اور ملکی قانون کے معنی اور حدود کو سمجھے ہیں اور نہ اس عملی مسئلے پر انہوں نے کچھ غور کیا ہے جو پاکستان میں ہمیں درپیش ہے۔ شخصی قانون سے مراد وہ قوانین ہیں جو لوگوں کی خانگی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے نکاح و طلاق اور وراثت۔ اور ملکی قانون سے مراد وہ قوانین ہیں جو ملک کے عام نظم وضبط کے لیے درکار ہیں، مثلاً فوجداری اور دیوانی قانون۔ پہلی قسم کے بارے میں یہ ممکن ہے کہ ایک مملکت میں اگر مختلف گروہ موجود ہوں تو ان میں سے ہر ایک کے حق میں اس قانون کو نافذ کیا جائے جس کا وہ خود قائل ہو، تاکہ اسے اپنی خانگی زندگی کے محفوظ ہونے کا اطمینان حاصل ہو جائے۔ لیکن دوسری قسم کے قوانین میں الگ الگ گروہوں کا لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لامحالہ سب کے سب یکساں ہی ہونے چاہئیں۔ قرآن مجید کے عہد میں مسلمان تو ایک ہی گروہ تھے لیکن مملکت اسلامیہ میں یہودی، عیسائی اور مجوسی بھی شامل تھے جن کے شخصی قوانین مسلمانوں سے مختلف تھے۔ قرآن نے ان کے لیے جزیہ دے کر مملکت اسلامیہ میں رہنے کی جو گنجائش نکالی تھی اس کے معنی یہی تھے کہ ان کے مذہب اور ان کے شخصی قانون میں مداخلت نہ کی جائے گی، البتہ اسلام کا ملکی قانون ان پر بھی اسی طرح نافذ ہو گا جس طرح مسلمانوں پر ہو گا۔ چنانچہ اسی قاعدے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت نے عمل کیا۔

اب پاکستان میں ہم جس زمانے میں سانس لے رہے ہیں وہ نزول قرآن کا زمانہ نہیں ہے، بلکہ اس سے ۱۴ سو سال بعد کا زمانہ ہے۔ ان پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کے اندر متعدد فرقے بن چکے ہیں اور ان کو بنے اور جمے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں۔ ان کے درمیان قرآن کی تعبیر میں بھی اختلافات ہیں اور سنتوں کی تحقیق میں بھی۔ اگر ہم ان مختلف فرقوں کو یہ اطمینان دلا دیں کہ ان کے مذہبی اور

خانگی معاملات انہی کی مسلمہ فقہ پر قائم رہیں گے اور صرف ملکی معاملات میں ان کو اکثریت کا فیصلہ ماننا ہو گا تو وہ بے کھٹکے ایک مشترک ملکی نظام اسلامی بنانے کے لئے تیار ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی "مرکز ملت" صاحب قرآن کا نام لے کر ان کے مذہبی عقائد و عبادات اور ان کے خانگی معاملات میں زبردستی مداخلت کرنے پر اتر آئیں اور ان سارے فرقوں کو توڑ ڈالنا چاہیں' تو یہ ایک سخت خونریزی کے بغیر ممکن نہ ہو گا۔ بلاشبہ یہ ایک مثالی حالت ہو گی کہ مسلمان پھر ایک ہی جماعت کی حیثیت اختیار کر لیں جس میں امت مسلمہ کے لیے تمام قوانین کھلے اور آزادانہ بحث و مباحثے سے طے ہو سکیں۔ لیکن یہ مثالی حالت نہ پہلے ڈنڈے کے زور سے پیدا ہوئی تھی' نہ آج اسے ڈنڈے کے زور سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۔ حیثیت رسولؐ کے بارے میں فیصلہ کن بات سے گریز

اعتراض : "آپ نے ترجمان القرآن کے متعدد اوراق اس بحث میں ضائع کر دیئے کہ حضورؐ کو اسلامی ریاست کا صدر یا مسلمانوں کا لیڈر یا قاضی اور جج کس نے بنایا تھا۔ خدا نے یا مسلمانوں نے انتخاب کے ذریعے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بحث سے بالآخر آپ کا مقصد کیا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی ہدایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کی۔ ایک بچہ بھی اس بات کو سمجھ لے گا کہ اس مملکت کا اولین سربراہ اور مسلمانوں کا رہنما اور تمام معاملات کے فیصلے کرنے کی آخری اتھارٹی جس کے فیصلوں کی کہیں اپیل نہ ہو سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟"

جواب : جس سوال کو ایک فضول اور لایعنی سوال قرار دے کر اس کا سامنا کرنے سے اس طرح گریز کیا جا رہا ہے وہ دراصل اس بحث کا ایک فیصلہ کن سوال ہے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالٰی کے مقرر کردہ فرمانروا' قاضی اور رہنما تھے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ حضورؐ کے فیصلے اور آپ کی تعلیمات و

ہدایات اور آپ کے احکام من جانب اللہ تھے اور اس بنا پر لازماً وہ اسلام میں سند و حجت ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص حضورؐ کی ان چیزوں کو سند و حجت نہیں مانتا تو اسے دو باتوں میں سے ایک بات لامحالہ کہنی پڑے گی۔ یا تو وہ یہ کہے کہ حضورؐ خود فرمانروا اور قاضی اور رہنما بن بیٹھے تھے یا پھر یہ کہے کہ مسلمانوں نے آپ کو ان مناصب کے لیے اپنی مرضی سے منتخب کیا تھا اور وہ حضورؐ کی موجودگی میں آپ کے بجائے کسی اور کو بھی منتخب کر لینے کے مجاز تھے اور ان کو یہ بھی حق تھا کہ آپ کو معزول کر دیتے۔ منکرین حدیث پہلی بات ماننا نہیں چاہتے' کیونکہ اس کو مان لیں تو ان کے مسلک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ لیکن دوسری دونوں باتوں میں سے کسی بات کو بھی صاف صاف کہہ دینے کی ان میں ہمت نہیں ہے' کیونکہ اس کے بعد اس دام فریب کا تار تار الگ ہو جائے گا جس میں وہ مسلمانوں کو پھانسنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے یہ حضرات اس سوال سے بچ کر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناظرین براہ کرم اس کتاب کے صفحات ۹۵ تا ۹۸ پر "مرکز ملت" کی بحث ملاحظہ فرمالیں اور پھر دیکھیں کہ میرے اٹھائے ہوئے سوالات سے بچ کر کس طرح راہ گریز اختیار کی جا رہی ہے۔

۱۹۔ کیا کسی غیر نبی کو نبی کی تمام حیثیات حاصل ہو سکتی ہیں

اعتراض: نزول قرآن کے وقت دنیا میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے بن گئے تھے۔ مذہبی امور میں مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوتی تھی اور سیاسی یا دنیاوی امور میں حکومت کی۔ قرآن نے اس ثنویت کو مٹایا اور مسلمانوں سے کہا کہ رسول اللہ تمہارے مذہبی رہنما ہی نہیں' سیاسی اور تمدنی امور میں تمہارے سربراہ بھی ہیں اس لیے ان تمام امور میں آپ ہی کی اطاعت کی جائے گی۔ رسول اللہؐ کے بعد یہ تمام مناصب (یعنی خدا سے وحی پانے کے علاوہ دیگر مناصب) حضورؐ کے سچے جانشین (خلیفۃ الرسول) کی طرف منتقل ہو گئے اور اب خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے

معنی اس نظام کی اطاعت ہو گئے جسے عام طور خلافت علیٰ منہاج نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی کو میں نے "مرکز ملت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا تھا جس کا آپ مذاق اڑا رہے ہیں"۔

جواب: اس دعوے کی دلیل کیا ہے کہ حامل وحی ہونے کے سوا باقی جتنی حیثیات بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلامی نظام میں حاصل تھیں وہ سب آپ کے بعد خلیفہ یا "مرکز ملت" کو منتقل ہو گئیں؟ کیا قرآن میں یہ بات کہی گئی ہے؟ یا رسول اللہؐ نے اس کی تصریح کی ہے؟ یا خلفائے راشدین نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ ہم کو یہ حیثیت حاصل ہے؟ یا عہد رسالتؐ سے لے کر آج تک علمائے امت میں سے کسی قابل ذکر آدمی کا مسلک یہ رہا ہے؟ قرآن مجید جو کچھ کہتا ہے وہ اس کتاب کے صفحات ۷۷ تا ۸۳ پر میں پیش کر چکا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کو یہ لوگ مانتے ہیں، ورنہ میں بکثرت مستند و معتبر احادیث پیش کرتا جن سے اس دعوے کی قطعی تردید ہو جاتی ہے۔ خلفائے راشدین کے متعلق منکرین حدیث کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس حیثیت پر فائز سمجھتے تھے۔ مگر میں نے اسی کتاب کے صفحات ۱۱۳ تا ۱۱۸ پر حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے اپنے اقوال لفظ بلفظ پیش کر دیئے ہیں جن سے یہ جھوٹا الزام ان پر ثابت نہیں ہوتا۔ اب یہ اصحاب کم از کم یہی بتا دیں کہ پچھلی چودہ صدیوں میں کب کس عالم دین نے یہ بات کہی ہے۔

۲۰۔ اسلامی نظام کے امیر اور منکرین حدیث کے مرکز ملت میں عظیم فرق

اعتراض: "یہ جو میں نے کہا ہے کہ "خدا اور رسول" سے مراد اسلامی نظام ہے تو یہ میری اختراع نہیں۔ اس کے مجرم آپ بھی ہیں۔ آپ نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں سورۂ مائدہ کی آیت انما جزاؤ الذین یحاربون اللہ (۵:۳۳) کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف

جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جاتا ہے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا دراصل خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے"۔ (جلد اول' صفحہ ۳۶۵)

جواب: یہاں پھر میرے سامنے میری ہی عبارت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی جسارت کی گئی ہی' اصل عبارت یہ ہے:

"ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا' قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیانے پر اس نظام صالح کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کر دینے کے لیے ہو' دراصل خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیرات ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے' بادشاہ کے خلاف لڑائی (Waging War against the King) کا مجرم قرار دیا گیا۔ چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دسترس سے کتنا ہی دور ہو"۔

اب ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی خود دیکھ سکتا ہے کہ بادشاہ کی نمائندگی کرنے والے سپاہی کے خلاف جنگ کو بادشاہ کے خلاف جنگ قرار دینے' اور سپاہی کو خود بادشاہ قرار دے دینے میں کتنا بڑا فرق ہے۔ ایسا ہی عظیم فرق ان دو باتوں میں ہے کہ ایک شخص اللہ اور رسولؐ کے نظام مطلوب کو چلانے والی حکومت کے خلاف کارروائی کو اللہ اور رسول کے خلاف کارروائی قرار دے اور دوسرا شخص دعویٰ کرے کہ یہ حکومت خود اللہ اور رسولؐ ہے۔

اس فرق کی نزاکت پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک آپ ان

دونوں کے نتائج پر تھوڑا سا غور نہ کرلیں۔ فرض کیجئے کہ اسلامی حکومت کسی وقت ایک غلط حکم دے بیٹھتی ہے جو قرآن اور سنت کے خلاف پڑتا ہے۔ اس صورت حال میں میری تعبیر کے مطابق تو عام مسلمانوں کو اٹھ کر یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ "آپ اپنا حکم واپس لیجئے کیونکہ آپ نے اللہ اور رسولؐ کے فرمان کی خلاف ورزی کی ہے' اللہ نے قرآن میں یہ فرمایا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہ ثابت ہے' اور آپ اس سے ہٹ کر یہ حکم دے رہے ہیں' لہٰذا آپ اس معاملہ میں اللہ اور رسولؐ کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے"۔ مگر منکرین حدیث کی تعبیر کے مطابق اسلامی حکومت خود ہی اللہ اور رسولؐ ہے۔ لہٰذا مسلمان اس کے کسی حکم کے خلاف بھی یہ استدلال لانے کا حق نہیں رکھتے۔ جس وقت وہ یہ استدلال کریں گے اسی وقت حکومت یہ کہہ کر ان کا منہ بند کردے گی کہ اللہ اور رسولؐ تو ہم خود ہیں' جو کچھ ہم کہیں اور کریں' وہی قرآن بھی ہے اور سنت بھی۔

منکرین حدیث دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن میں جہاں جہاں "اللہ اور رسول" کا لفظ آیا ہے۔ وہاں اس سے مراد اسلامی حکومت ہے۔ میں ناظرین سے عرض کروں گا کہ ذرا قرآن کھول کر وہ آیتیں نکال لیجئے جن میں اللہ اور رسولؐ کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں اور خود دیکھ لیجئے کہ یہاں ان سے حکومت مراد لینے کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکفرین (آل عمران:۳۲)

اے نبیؐ" ان سے کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسولؐ کی۔ پھر اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

یایھا الذین امنوا امنوا باللہ ورسولہ (النساء:۱۳۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' (سچے دل سے) ایمان لاؤ اللہ اور رسولؐ پر۔

انما المومنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا (الحجرات:۱۵)

مومن تو اصل میں وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' پھر شک میں نہ پڑے۔

ومن لم یومن باللّٰہ ورسولہ فانا اعتدنا للکفرین سعیراً (الفتح:۱۳)

اور جو ایمان نہ لائے اللہ اور اس کے رسولؐ پر' تو ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔

ان اللّٰہ لعن الکفرین واعد لھم سعیراً خالدین فیھا ابداً لا یجدون ولیا ولا نصیراً یوم تقلب وجوھھم فی النار یقولون یالیتنا اطعنا اللّٰہ واطعنا الرسولا (الاحزاب: ۶۴'۶۵'۶۶)

یقیناً اللہ نے لعنت کی کافروں پر اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر دی جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ اس روز کوئی حامی و مددگار نہ پائیں گے۔ جب ان کے چہرے آگ پر پلٹائے جائیں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔

وما منعھم ان تقبل منھم نفقتھم الا انھم کفروا باللّٰہ وبرسولہ (التوبہ:۵۴)

ان کے انفاق کو قبول ہونے سے کسی چیز نے نہیں روکا مگر اس بات نے کہ انہوں نے کفر کیا' اللہ اور اس کے رسولؐ سے۔

ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللّٰہ لھم ذلک بانھم کفروا باللّٰہ ورسولہ (التوبہ:۸۰)

اے نبیؐ! اگر تم ان کے لیے ستر بار مغفرت کی دعا کرو تو اللہ انھیں نہ بخشے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے کفر کیا ہے۔

ولا تصل علی احد منھم مات ابداً ولا تقم علی قبرہ انھم کفروا باللّٰہ ورسولہ وماتوا وھم فاسقون (التوبہ:۸۴)

اور ان میں سے جو کوئی مر جائے' اس کی نماز جنازہ ہرگز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو۔ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے اور وہ فاسق مرے ہیں۔

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ولا تبطلوا اعمالکم (محمد:٣٣)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرلو۔

ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خالدین فیھا ابداً (الجن:٢٣)

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے اس کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

الم یعلموا انہ من یحادد اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خالداً فیھا (التوبہ:٦٣)

کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرے اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنین (التوبہ:٦٢)

اللہ اور اس کا رسول اس کا زیادہ حق دار ہے کہ وہ اس کو راضی کریں اگر وہ مومن ہیں۔

ان آیات کو جو شخص بھی بغور پڑھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ اگر اللہ اور رسول کے معنی کہیں حکومت کے ہو جائیں تو دین اسلام کا حلیہ بگڑ کر رہ جاتا ہے اور ایک ایسی بدترین ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جاتی ہے جس کے سامنے فرعون اور چنگیز اور ہٹلر اور مسولینی اور اسٹالین کی آمریتیں ہیچ ہو کر رہ جائیں۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ حکومت ہی مسلمانوں کا دین و ایمان ہو۔ اس کو ماننے والا مسلمان رہے اور اس

سے روگردانی کرنے والا کافر ہو جائے۔ اس کی نافرمانی کرنے والا دنیا ہی میں جیل نہ جائے بلکہ آخرت میں بھی دائمی جہنم کی سزا بھگتے۔ اس سے اختلاف کر کے آدمی ابدی عذاب میں مبتلا ہو۔ اس کو راضی کرنا شرط ایمان قرار پائے اور جو شخص اس کی اطاعت سے منہ موڑے' اس کی نماز' روزہ' زکوٰۃ اور ساری نیکیاں برباد ہو جائیں' بلکہ مسلمانوں کے لیے اس کی نماز جنازہ بھی جائز نہ ہو اور اس کے لیے دعائے مغفرت تک نہ کی جا سکے۔ ایسی حکومت سے آخر دنیا کی کسی آمریت کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

پھر ذرا اس پہلو پر غور کیجئے کہ بنی امیہ کے بعد سے آج تک ساری دنیائے اسلام کبھی ایک دن کے لیے بھی ایک حکومت میں جمع نہیں ہوئی ہے اور آج بھی مسلم ممالک میں بہت سی حکومتیں قائم ہیں۔ اب کیا انڈونیشیا' ملایا' پاکستان' ایران' ترکی' عرب' مصر' لیبیا' تونس اور مراکش میں سے ہر ایک کے "اللہ اور رسول" الگ الگ ہوں گے؟ یا کسی ایک ملک کے "اللہ اور رسول" زبردستی اپنی آمریت دوسرے ملکوں پر مسلط کریں گے؟ یا اسلام میں اس وقت تک پورا کا پورا معطل رہے گا جب تک پوری دنیائے اسلام متفق ہو کر ایک "اللہ اور رسول" کا انتخاب نہ کر لے؟

۲۱۔ عہد رسالت میں مشاورت کے حدود کیا تھے؟

اعتراض: "اگر بحیثیت صدر ریاست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم وحی پر مبنی ہوتا تھا تو پھر آپ کو مشورے کا حکم کیوں دیا گیا تھا؟ آپ نے زیر نظر خط و کتابت میں اس سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ حضورؐ نے اپنی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں جو کچھ کیا' یا کیا وہ سب وحی کی بنا پر تھا اور اب آپ "تدابیر" کو اس سے خارج کر رہے ہیں"۔

جواب: جن معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ وحی متلو یا غیر متلو کے ذریعہ سے حضورؐ کی رہنمائی نہ کرتا تھا ان میں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق حضور یہ

سمجھتے تھے کہ اسے انسانی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے' اور ایسے معاملات میں آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کر کے فیصلے فرماتے تھے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ حضورؐ کے ذریعہ سے لوگوں کو اسلامی طریق مشاورت کی تربیت دے دی جائے۔ مسلمانوں کو اس طرح کی تربیت دینا خود فرائض رسالت ہی کا ایک حصہ تھا۔

۲۲۔ اذان کا طریقہ مشورے سے طے ہوا تھا یا الہام سے؟

اعتراض: آپ نے لکھا ہے کہ "کیا آپ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں کہ عہد رسالت میں قرآن کے کسی حصے کی تعبیر مشورے سے کی گئی ہو یا کوئی قانون مشورے سے بنایا گیا ہو؟ بہت سی نہیں صرف ایک مثال ہی آپ پیش فرما دیں"۔ اس کی ایک مثال تو ہمیں مشکوٰۃ شریف میں ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نماز کے لیے آواز دینے کا حکم دیا۔ لیکن خود اس دعوت کے طریق کو متعین نہیں کیا۔ اس کا تعین حضورؐ نے صحابہؓ کے مشورے سے کیا اور اپنی رائے کے خلاف کیا۔ کیونکہ آپؐ نے پہلے ناقوس بجانے کا حکم دیا تھا۔ فرمایئے اذان دین کے احکام میں داخل ہے یا نہیں؟"

جواب: کیا قرآن کی کسی آیت کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس میں نماز کے لیے آواز دینے کا حکم دیا گیا ہو؟ قرآن مجید میں تو نماز کی منادی کا ذکر صرف دو آیتوں میں آیا ہے۔ سورۂ مائدہ آیت ۵۸ میں فرمایا گیا ہے کہ "جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو تو یہ اہل کتاب اور کفار اس کا مذاق اڑاتے ہیں"۔ اور سورۂ جمعہ آیت ۹ میں ارشاد ہوا ہے "جب جمعہ کے روز نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو"۔ ان دونوں آیتوں میں نماز کی منادی کا ذکر ایک رائج شدہ نظام کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ ہم کو قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں حکم دیا گیا ہو کہ نماز کی منادی کرو۔

جہاں تک مشکوٰۃ کے حوالے کا تعلق ہے' معلوم ہوتا ہے وہ مشکوٰۃ پڑھ

نہیں دیا گیا بلکہ صرف سنی سنائی بات یہاں نقل کر دی گئی ہے۔ مشکوۃ کی کتاب الصلوۃ میں باب الاذان نکال کر دیکھیے۔ اس میں جو احادیث جمع کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ طیبہ میں جب نماز باجماعت کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا تو اول اول اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت اس بارے میں نہیں آئی تھی کہ نماز کے لیے لوگوں کو کس طرح جمع کیا جائے۔ حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ آگ جلائی جائے تاکہ اس کا دھواں بلند ہوتے دیکھ کر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نماز کھڑی ہو رہی ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے ناقوس بجانے کی رائے دی لیکن کچھ اور لوگوں نے کہا کہ پہلا طریقہ یہود کا اور دوسرا نصاریٰ کا ہے۔ ابھی اس معاملہ میں کوئی آخری فیصلہ نہ ہوا تھا اور اسے سوچا جا رہا تھا کہ حضرت عبداللہ بن زید انصاری نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص ناقوس لیے جا رہا ہے۔ انہوں نے اس سے کہا' اے بندۂ خدا' یہ ناقوس بیچتا ہے؟ اس نے پوچھا اس کا کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا نماز کے لیے لوگوں کو بلائیں گے۔ اس نے کہا میں اس سے اچھا طریقہ تمہیں بتاتا ہوں۔ چنانچہ اس نے اذان کے الفاظ انہیں بتائے۔ صبح ہوئی تو حضرت عبداللہ نے آکر حضورؐ کو اپنا خواب سنایا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے' اٹھو اور بلالؓ کو ایک ایک لفظ بتاتے جاؤ' یہ بلند آواز سے پکارتے جائیں گے۔ جب اذان کی آواز بلند ہوئی تو حضرت عمرؓ دوڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا کہ خدا کی قسم آج میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا فللہ الحمد۔ یہ ہے مشکوۃ کی احادیث در باب اذان کا خلاصہ۔ اس سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ کہ الہام سے ہوا ہے' اور یہ الہام بصورت خواب حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت عمرؓ پر ہوا تھا لیکن مشکوۃ کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں جو روایات آئی ہیں ان سب کو اگر جمع کیا جائے تو ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جس روز ان صحابیوں کو خواب میں اذان کی ہدایت ملی اسی روز خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی بذریعہ وحی یہ حکم آ گیا تھا۔ فتح الباری میں علامہ ابن حجر نے ان

روایات کو جمع کر دیا ہے۔

۲۴۔ حضورؐ کے عدالتی فیصلے سند و حجت ہیں یا نہیں؟

اعتراض: "آپ کے دعوے کے مطابق حضورؐ کا ہر فیصلہ وحی پر مبنی ہونا چاہئے۔ لیکن آپ کو خود اس کا اعتراف ہے کہ آپ کے یہ فیصلے وحی پر مبنی نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ نے تفہیم القرآن' جلد اول' صفحہ ۱۴۸ پر یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"میں بہرحال ایک انسان ہی تو ہوں' ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں سے یک فریق دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے سے حاصل کی تو دراصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے"۔

حضورؐ کے فیصلوں کی یہی امکانی غلطیاں تھیں جن کے متعلق قرآن کریم نے حضورؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا تھا کہ "اگر میں غلطی کرتا ہوں تو وہ میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے' اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو وہ وحی کی بنا پر ہوتا ہے"۔

جواب: یہ سخن فہمی کے فقدان کی ایک اور دلچسپ مثال ہے۔ جو شخص قانونی مسائل سے سرسری واقفیت ہی رکھتا ہو' وہ بھی اس بات کو جانتا ہے کہ ہر مقدمے کے فیصلے میں دو چیزیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ایک واقعات مقدمہ (Facts of the case) جو شہادتوں اور قرائن سے متحقق ہوتے ہیں۔ دوسرے' ان واقعات

لے سورۂ سبا کی اس آیت سے ڈاکٹر صاحب نے پھر غلط استدلال کیا ہے' حالانکہ اس سے پہلے ان کو اس غلطی پر متنبہ کیا جا چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو' اس کتاب کا صفحہ ——)

پر قانون کا انطباق' یعنی یہ طے کرنا کہ جو واقعات روداد مقدمہ سے معلوم ہوئے ہیں ان کے لحاظ سے اس مقدمے میں قانونی حکم کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں جو کچھ فرمایا ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ میں قانون کو واقعات مقدمہ پر منطبق کرنے میں غلطی کر سکتا ہوں' بلکہ آپ کے ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم غلط روداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف واقعات مقدمہ ثابت کر دو گے تو میں انہی پر قانون کو منطبق کر دوں گا اور خدا کے ہاں اس کی ذمہ داری تم پر ہو گی۔ اس لیے کہ جج کا کام اسی روداد پر فیصلہ کرنا ہے جو فریقین کے بیانات اور شہادتوں سے اس کے سامنے آئے۔ کسی دوسرے خارجی ذریعہ سے اس کو حقیقت حال معلوم بھی ہو تو وہ اپنی ذاتی معلومات پر فیصلے کی بنا نہیں رکھ سکتا بلکہ اصول انصاف کی رو سے اس کو روداد مقدمہ ہی پر فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا غلط روداد پر جو فیصلہ ہو گا وہ جج کی غلطی نہیں ہے بلکہ اس فریق کی غلطی ہے جس نے خلاف حقیقت واقعات ثابت کر کے اپنے حق میں فیصلہ کرایا۔ اس سے اللہ تعالیٰ ہر مقدمے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی واقعات مقدمہ بتایا کرتا تھا؟ اصل دعویٰ تو یہ ہے کہ حضورؐ قانون کی تعبیر اور حقائق پر ان کے انطباق میں غلطی نہیں کر سکتے تھے' کیونکہ آپ مامور من اللہ قاضی تھے' اللہ کی دی ہوئی روشنی اس کام میں آپ کی رہنمائی کرتی تھی' اور اس بنا پر آپ کے فیصلے سند اور حجت ہیں۔ اس دعوے کے خلاف کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو وہ سامنے لائے۔

اوپر جس حدیث سے ڈاکٹر صاحب نے استدلال فرمایا ہے اس میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ "میں فیصلے میں غلطی کر سکتا ہوں"۔ علم قانون میں بھی یہ بات پوری طرح مسلم ہے کہ اگر عدالت کے سامنے کوئی شخص شہادتوں سے خلاف واقعہ بات کو واقعی ثابت کر دے اور جج ان کو تسلیم کر کے ٹھیک ٹھیک قانون کے مطابق فیصلہ دے دے تو وہ فیصلہ بجائے خود غلط نہیں ہو گا لیکن ڈاکٹر صاحب اسے فیصلے کی غلطی قرار دے رہے ہیں۔

۲۴۔ کج بحثی کا ایک عجیب نمونہ

اعتراض: آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ حضورؐ سے صرف چند لغزشیں ہوئی تھیں۔ یعنی آپ کا خیال یہ ہے کہ اگر حضورؐ سے زیادہ لغزشیں ہوتیں تو یہ بات قابل اعتراض تھی لیکن چند لغزشیں قابل اعتراض نہیں۔

جواب: کس قدر نفیس خلاصہ ہے جو میری تحریر سے نکال کر خود میرے ہی سامنے پیش کیا جا رہا ہے جس عبارت کا یہ خلاصہ نکالا گیا ہے وہ لفظ بلفظ یہ ہے:

"دوسری آیات جو آپ نے پیش فرمائی ہیں ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطور نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ حالانکہ دراصل ان سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی' اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپؐ سے ثابت ہے' کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح ان لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا"۔

اس کا خلاصہ یہ نکالا گیا ہے کہ "حضورؐ سے زیادہ لغزشیں ہوتیں تو یہ بات قابل اعتراض تھی' لیکن چند لغزشیں قابل اعتراض نہیں ہیں"۔ یہ طرز بحث جن لوگوں کا ہے ان کے بارے میں کس طرح آدمی یہ حسن ظن رکھ سکتا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ بات سمجھنے کے لیے گفتگو کرتے ہیں۔

اعتراض: "اگر حضورؐ کی ہر بات وحی پر مبنی ہوتی تھی تو حضورؐ کی ایک لغزش بھی دین کے سارے نظام کو درہم برہم کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس لیے کہ وہ غلطی کسی انسان کی غلطی نہیں تھی بلکہ (معاذ اللہ) وحی کی

غلطی تھی۔ خود خدا کی غلطی تھی اور اگر (معاذ اللہ) خدا بھی غلطی کر سکتا ہے تو ایسے خدا پر ایمان کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟"

جواب: یہ ایک مغالطے کے سوا اور کیا ہے۔ آخر یہ کس نے کہا کہ وحی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے پہلے غلط رہنمائی کی تھی۔ اس بنا پر حضورؐ سے لغزش ہوئی۔ اصل بات جس کو ہٹ دھرمی کے بغیر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے' یہ ہے کہ حضورؐ کی ایک لغزش بھی چونکہ دین کے سارے نظام کو درہم برہم کر دینے کے لیے کافی تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کام اپنے ذمہ لیا تھا کہ نبوت کے فرائض کی بجاآوری میں وہ خود آپ کی رہنمائی و نگرانی کرے گا' اور اگر کسی وقت بمقتضائے بشریت آپ سے کوئی لغزش ہو جائے تو فوراً اس کی اصلاح فرما دے گا تاکہ دین کے نظام میں کوئی خامی باقی نہ رہ سکے۔

۲۵۔ حضورؐ کے ذاتی خیال اور بربنائے وحی کہی ہوئی بات میں واضح امتیاز تھا

اعتراض: آپ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے اپنی نبوت کی پوری زندگی میں جو کچھ کیا یا فرمایا وہ وحی کی بنا پر تھا لیکن دجال سے متعلق احادیث کے سلسلے میں آپ کا ارشاد یہ ہے:

"ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں' وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارے میں آپ خود شک میں تھے"۔ (رسائل و مسائل' ص ۵۵)

اور اس کے بعد آپ خود ہی اس کا اعتراف کر لیتے ہیں کہ:

"حضور کا یہ تردد تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپؐ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں"۔ (رسائل و مسائل' ص ۵۶)

جواب: میری جن عبارات کا یہاں سہارا لیا جا رہا ہے ان کو نقل کرنے میں پھر

وہی کرتب دکھایا گیا ہے کہ سیاق و سباق سے الگ کر کے ایک فقرہ کہیں سے اور ایک کہیں سے نکال کر اپنا مطلب بر آمد کر لیا گیا۔ دراصل جو بات اس مقام پر میں نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ دجال کے متعلق حضورؐ کو وحی کے ذریعہ سے جو علم دیا گیا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ وہ آئے گا اور ان ان صفات کا حامل ہو گا۔ انہی باتوں کو حضورؐ نے خبر کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ کب اور کہاں آئے گا تو اس کے متعلق جو کچھ آپ نے بیان فرمایا ہے وہ خبر کے انداز میں نہیں بلکہ قیاس و گمان کے انداز میں فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر ابن صیاد کے متعلق آپ نے شبہ ظاہر فرمایا کہ شاید یہ دجال ہو۔ لیکن جب حضرت عمرؓ نے اسے قتل کرنا چاہا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اگر یہ دجال ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو' اور اگر یہ دجال نہیں ہے تو تمہیں ایک ذمی کو قتل کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ "اگر دجال میری زندگی میں آ گیا تو میں حجت سے اس کا مقابلہ کروں گا' ورنہ میرے بعد میرا رب تو ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی"۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ وحی کے ذریعہ سے ملے ہوئے علم کو ایک انداز میں بیان فرماتے تھے اور جن باتوں کا علم آپؐ کو وحی کے ذریعہ سے نہیں دیا جاتا تھا ان کا ذکر بالکل مختلف انداز میں کرتے تھے۔ آپؐ کا طرز بیان ہی اس فرق کو واضح کر دیتا تھا' لیکن جہاں صحابہ کو اس فرق کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آتی تھی وہاں وہ خود آپ سے پوچھ لیتے تھے کہ یہ بات آپ اپنی رائے سے فرما رہے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ اس کی متعدد مثالیں میں نے تفہیمات حصہ اول کے مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں۔

۲۶۔ کیا صحابہؓ اس بات کے قائل تھے کہ حضورؐ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں؟

اعتراض: "میں نے لکھا تھا کہ کئی ایسے فیصلے جو رسولؐ اللہ کے زمانے میں ہوئے لیکن حضورؐ کے بعد جب تغیرات حالات کا تقاضا ہوا تو خلفائے

راشدین نے ان فیصلوں کو بدل دیا۔ آپؒ نے فرمایا کہ یہ ان بزرگوں پر سخت بہتان ہے جس کے ثبوت میں آپ نہ ان کا کوئی قول پیش کر سکتے ہیں' نہ عمل۔ آپ یہ معلوم کر کے متعجب ہوں گے کہ اس باب میں خود آپ نے ایک ہی صفحہ آگے چل کر اس امر کا بین ثبوت پیش کر دیا ہے کہ صحابہؓ کبار حضورؐ کے فیصلے کو تغیر حالات کے مطابق قابل ترمیم سمجھتے تھے۔ سنئے کہ آپ نے کیا لکھا ہے:

"کس کو معلوم نہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ کی وفات کے بعد جیش اسامہؓ کو بھیجنے پر صرف اس لیے اصرار کیا کہ جس کام کا فیصلہ حضورؐ اپنی زندگی میں کر چکے تھے' اسے بدل دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھتے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے جب ان خطرات کی طرف توجہ دلائی جن کا طوفان عرب میں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس حالت میں شام کی طرف فوج بھیج دینے کو نامناسب قرار دیا تو حضرت ابوبکرؓ کا جواب یہ تھا کہ اگر کتے اور بھیڑیے بھی مجھے اچک لے جائیں تو میں اس فیصلے کو نہ بدلوں گا جو رسولؐ اللہ نے کر دیا تھا"۔ (ترجمان' نومبر ۶۰ء' ص ۱۱۳)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے سوا باقی تمام صحابہؓ اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ' رسولؐ اللہ کے فیصلے کو بدلا جا سکتا ہے۔

پھر آپ نے لکھا ہے:

"حضرت عمرؓ نے خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اسامہ کو ہی اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں' کیونکہ بڑے بڑے صحابہؓ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا کہ خطاب کے بیٹے! تیری ماں تجھے روئے اور تجھے کھو دے' رسولؐ اللہ نے اس کو مقرر کیا اور تو کہتا ہے کہ میں اسے ہٹا دوں"۔ (ایضاً)

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس کے قائل تھے کہ تغیر حالات سے حضورؐ کے فیصلے بدلے جا سکتے ہیں بلکہ اس واقعہ میں تغیر حالات کا بھی سوال نہیں تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ (ایک حضرت ابوبکرؓ کے سوا) صحابہؓ میں سے کوئی بھی اس بات کو نہیں سمجھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کسی حالت میں بھی بدلے نہیں جا سکتے؟

جواب: یہ ایک اور مثال ہے اس بات کی کہ منکرین حدیث ہر عبارت میں صرف اپنا مطلب تلاش کرتے ہیں۔ اوپر حضرت ابوبکرؓ کے جو دو واقعات نقل کیے گئے ہیں ان کو پھر پڑھ کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں یہ بات بھی کہیں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو بدلنے سے انکار کیا تو حضرت عمرؓ نے' یا صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے یہ کہا ہو کہ "اے حضور مرکز ملت' آپ ازروئے شرع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کے پابند نہیں ہیں بلکہ انہیں بدل دینے کا پورا اختیار رکھتے ہیں۔ اگر آپ کی اپنی رائے یہی ہے کہ اس وقت جیش اسامہؓ کو جانا چاہئے اور اسامہؓ ہی اس کے قائد ہوں تو بات دوسری ہے۔ آپ اس پر عمل فرمائیں کیونکہ آپ "اللہ اور رسولؐ" ہیں' لیکن یہ استدلال نہ فرمایئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے اس لیے اسے نہیں بدلا جا سکتا۔ حضورؐ اپنے زمانے کے مرکز ملت تھے اور آپ اپنے زمانے کے مرکز ملت ہیں۔ آج آپ کے اختیارات وہی ہیں جو کل حضورؐ کو حاصل تھے"۔ یہ بات اگر حضرت عمرؓ یا دوسرے صحابہؓ نے کہی ہوتی تو بلاشبہ منکرین حدیث کی بات بن جاتی۔ لیکن اس کے برعکس وہاں معاملہ یہ پیش آیا کہ جس وقت حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے فیصلے کا حوالہ دیا اسی وقت حضرت عمرؓ نے بھی اور صحابہؓ نے بھی سر اطاعت جھکا دیا۔ جیش اسامہ روانہ ہوا' اسامہ ہی اس کے قائد رہے اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ ان کی قیادت میں راضی خوشی چلے گئے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد بعض حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق

ہوئی تھی کہ آپ کے انتظامی فیصلوں میں حسب ضرورت رد و بدل کیا جا سکتا ہے' لیکن اس وقت دین کے فہم میں جو شخص سب سے بڑھا ہوا تھا اس کے متنبہ کرنے پر سب نے اپنی غلطی محسوس کرلی اور سر تسلیم خم کر دیا۔ یہ طرز عمل بہت افسوسناک ہے کہ محض اپنی بات بنانے کی خاطر صحابہ کرام کے ان تاثرات کا تو سہارا لے لیا جائے جن کا اظہار فقط بحث کے دوران ہوا۔ لیکن اس اجماعی فیصلے سے آنکھیں بند کرلی جائیں جس پر بحث کے بعد آخر کار سب کا اتفاق ہو گیا ہو۔ دنیا بھر کا مسلم قاعدہ تو یہ ہے کہ ایک بحث کے بعد جو بات متفق علیہ طور پر طے ہو' وہی طے شدہ فیصلہ قابل حجت ہے نہ کہ وہ آراء جو اثنائے بحث میں سامنے آئی ہوں۔

۷۔ مسئلہ طلاق ثلاثہ میں حضرت عمرؓ کے فیصلے کی اصل نوعیت

اعتراض : آپ فرماتے ہیں کہ میں کوئی مثال پیش کروں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کسی فیصلے کو خلفائے راشدین نے بدلا ہو۔ اس سے تو آپ بھی انکار نہیں کریں گے کہ نبی اکرمؐ کے زمانے میں ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک شمار کر کے طلاق رجعی قرار دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے تین شمار کر کے طلاق مغلظہ قرار دے دیا اور فقہ کی رو سے امت آج تک اسی پر عمل کر رہی ہے۔

جواب : اس معاملہ میں پوزیشن یہ ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں بھی تین طلاق تین ہی سمجھی جاتی تھیں اور متعدد مقامات میں حضورؐ نے ان کو تین ہی شمار کر کے فیصلہ دیا ہے لیکن جو شخص تین مرتبہ طلاق کا الگ الگ تلفظ کرتا تھا اس کی طرف سے اگر یہ عذر پیش کیا جاتا کہ اس کی نیت ایک ہی طلاق کی تھی اور باقی دو مرتبہ اس نے یہ لفظ محض تاکیداً استعمال کیا تھا۔ اس کے عذر کو حضورؐ قبول فرما لیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا' وہ صرف یہ ہے کہ جب لوگ کثرت سے تین طلاقیں دے کر ایک طلاق کی نیت کا عذر پیش کرنے لگے تو انہوں نے فرمایا

کہ اب یہ طلاق کا معاملہ کھیل بنتا جا رہا ہے اس لیے ہم اس عذر کو قبول نہیں کریں گے اور تین طلاقوں کو تین ہی کی حیثیت سے نافذ کر دیں گے۔ اس کو تمام صحابہؓ نے بالاتفاق قبول کیا اور بعد میں تابعین و ائمہ مجتہدین بھی اس پر متفق رہے۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ حضرت عمرؓ نے عہد رسالت کے قانون میں یہ کوئی ترمیم کی ہے۔ اس لیے کہ نیت کے عذر کو قبول کرنا قانون نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار قاضی کی اس رائے پر ہے کہ جو شخص اپنی نیت بیان کر رہا ہے' وہ صادق القول ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں اس طرح کا عذر مدینہ طیبہ کے اکا دکا جانے پہچانے آدمیوں نے کیا تھا۔ اس لیے حضورؐ نے ان کو راست باز آدمی سمجھ کر ان کی بات قبول کر لی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران سے مصر تک اور یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سلطنت کے ہر شخص کا یہ عذر عدالتوں میں لازماً قابل تسلیم نہیں ہو سکتا تھا' خصوصاً جبکہ بکثرت لوگوں نے تین طلاق دے کر ایک طلاق کی نیت کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہو۔

۲۸۔ مولفۃ القلوب کے بارے میں حضرت عمرؓ کے استدلال کی نوعیت

اعتراض: "حضورؐ کے زمانے میں مولفۃ القلوب کو صدقات کی مد سے امداد دی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسے ختم کر دیا"

جواب: اسے اگر کوئی شخص فیصلوں میں رد و بدل کی مثال سمجھتا ہے تو اسے دعویٰ یہ کرنا چاہیے کہ حضورؐ کے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں میں بھی مرکز ملت صاحب رد و بدل کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ صدقات میں مولفۃ القلوب کا حصہ حضورؐ نے کسی حدیث میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں مقرر فرمایا ہے (ملاحظہ ہو سورۂ توبہ آیت:٦٠)۔ ڈوبتے وقت تنکے کا سہارا لینے کی کیفیت اگر منکرین حدیث پر طاری نہ ہو اور وہ اس معاملہ کی حقیقت سمجھنا چاہیں تو خود لفظ "مولفۃ القلوب" پر تھوڑا سا غور کر کے اسے خود سمجھ سکتے ہیں۔ یہ لفظ آپ ہی اپنا یہ مفہوم ظاہر کر رہا ہے کہ صدقات میں سے ان لوگوں کو بھی روپیہ دیا جا سکتا ہے جن

کی تالیف قلب مطلوب ہو۔ حضرت عمرؓ کا استدلال یہ تھا کہ حضورؐ کے زمانے میں اسلامی حکومت کو تالیف قلب کے لیے مال دینے کی ضرورت تھی اس لیے حضورؐ اس مد سے لوگوں کو دیا کرتے تھے۔ اب ہماری حکومت اتنی طاقتور ہو گئی ہے کہ ہمیں اس غرض کے لیے کسی کو روپیہ دینے کی حاجت نہیں ہے لہٰذا ہم اس مد میں کوئی روپیہ صرف نہیں کریں گے۔ کیا اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا کوئی فیصلہ بدل ڈالا؟ کیا واقعی حضورؐ کا فیصلہ یہی تھا کہ تالیف قلب کی حاجت ہو یا نہ ہو' بہرحال کچھ لوگوں کو ضرور مولفۃ القلوب قرار دیا جائے اور صدقات میں سے ہمیشہ ہمیشہ ان کا حصہ نکالا جاتا رہے؟ کیا خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بھی یہ لازم قرار دیا ہے کہ صدقات کا ایک حصہ تالیف قلب کی مد پر ہر حال میں ضروری خرچ کیا جائے؟

۲۹۔ کیا مفتوحہ اراضی کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ حکم رسولؐ کے خلاف تھا؟

> اعتراض: "نبی اکرمؐ کے زمانے میں مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں اس سسٹم کو ختم کر دیا"۔

جواب: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ کبھی نہیں فرمایا تھا کہ مفتوحہ زمینیں ہمیشہ مجاہدین میں تقسیم کی جاتی رہیں۔ اگر ایسا کوئی حکم حضورؐ نے دیا ہوتا اور حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف عمل کیا ہوتا تو آپ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے حضورؐ کا فیصلہ بدل دیا یا پھر یہ دعویٰ اس صورت میں کیا جا سکتا تھا جبکہ حضرت عمرؓ نے انہی زمینوں کو مجاہدین سے واپس لے لیا ہوتا جنہیں حضورؐ نے اپنے عہد میں تقسیم کیا تھا لیکن ان دونوں میں سے کوئی بات بھی پیش نہیں آئی۔ اصل صورت معاملہ یہ ہے کہ مفتوحہ زمینوں کو لازماً مجاہدین ہی میں تقسیم کر دینا سرے سے کوئی اسلامی قانون تھا ہی نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مفتوحہ اراضی کے

معاملے میں حسب موقع و ضرورت مختلف مواقع پر مختلف فیصلے فرمائے تھے۔ بنی نضیر' بنی قریظہ' خیبر' فدک' وادی القریٰ' مکہ اور طائف کی مفتوحہ اراضی میں سے ہر ایک کا بندوبست عہد رسالت میں الگ الگ طریقوں سے کیا گیا تھا اور ایسا کوئی ضابطہ نہیں بنایا گیا تھا کہ آئندہ ایسی اراضی کا بندوبست لازماً فلاں طریقے یا طریقوں ہی پر کیا جائے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کے مشورہ سے اراضی مفتوحہ کا جو بندوبست کیا' اسے حضورؐ کے فیصلوں میں رد و بدل کی مثال نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۳۰۔ وظائف کی تقسیم کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ

اعتراض: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے وظائف مساوی مقرر فرمائے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں خدمات کی نسبت سے بدل دیا۔ یہ اور اس قسم کی کئی اور مثالیں ملتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے فیصلے تغیر حالات کے مطابق خلافت راشدہ میں بدلے گئے تھے"۔

جواب: اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ حضورؐ نے مساوی وظائف مقرر فرمائے تھے؟ تاریخ کی رو سے تو یہ حضرت ابوبکرؓ کا فعل تھا۔ اس لیے اسے اگر کسی چیز کی مثال قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک خلیفہ اپنے سے پہلے خلیفہ کے فیصلوں میں رد و بدل کرنے کا مجاز ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ تمام منکرین حدیث مل کر اس طرح کی مثالوں کی ایک مکمل فہرست پیش فرما دیں۔ میں انشاء اللہ ثابت کر دوں گا کہ ان میں سے ایک بھی اس امر کی مثال نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں حضورؐ کے فیصلے بدلے گئے تھے۔

۳۱۔ کیا قرآن کے معاشی احکام عبوری دور کے لیے ہیں؟

اعتراض: "آپ نے میری اس بات کا بھی مذاق اڑایا ہے کہ قرآن کے

جو احکام بعض شرائط سے مشروط ہوں جب وہ شرائط باقی نہ رہیں تو وہ احکام اس وقت تک ملتوی ہو جاتے ہیں جب تک ویسے ہی حالات پیدا نہ ہو جائیں۔ انہیں "عبوری دور" کے احکام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صدقات کی مد سے مولفتہ القلوب کو امداد دینے کا حکم قرآن کریم میں موجود ہے۔ حضرت عمرؓ اس مد کو یہ کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ یہ حکم اس عبوری دور تک تھا' جب تک نظام کو اس قسم کی تالیف قلوب کی ضرورت تھی۔ اب وہ ضرورت باقی نہیں رہتی اس لیے اس حکم پر عمل کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ یہی منشا ہوتا ہے ان لوگوں کا جو قرآن کے اس قسم کے احکام کو "عبوری دور کے احکام" کہتے ہیں"۔

جواب: اس سخن سازی سے درحقیقت بات نہیں بنتی۔ منکرین حدیث شخصی ملکیت کے بارے میں پورا پورا کمیونسٹ نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں اور اس کا نام انہوں نے "قرآنی نظام ربوبیت" رکھا ہے۔ اس کے متعلق جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معاشی نظام کے متعلق جتنے بھی احکام صراحتاً یا اشارۃً وکنایتہً آئے ہیں وہ سب شخصی ملکیت کا اثبات کرتے ہیں اور کوئی ایک حکم بھی ہمیں ایسا نہیں ملتا جو شخصی ملکیت کی نفی پر مبنی ہو یا اسے ختم کرنے کا منشا ظاہر کرتا ہو' تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ سب احکام عبوری دور کے لیے ہیں۔ بالفاظ دیگر جب یہ عبوری دور ختم ہو جائے گا اور ان حضرات کا تصنیف کردہ نظام ربوبیت قائم ہو جائے گا تو یہ سب احکام منسوخ ہو جائیں گے۔ جناب پرویز صاحب صاف الفاظ میں فرماتے ہیں:

"(سوال کیا جاتا ہے) کہ اگر قرآن کا نظام معاشی اسی قسم کا ہے تو پھر اس نے صدقہ' خیرات' وراثت وغیرہ سے متعلق احکام کیوں دیئے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اس نظام کو یک لخت نہیں لے آنا چاہتا۔ بتدریج قائم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا صدقہ' خیرات' وراثت وغیرہ کے احکام اس

عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں ہنوز نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہ ہوا"۔ (ملاحظہ ہو بین الاقوامی مجلس مذاکرہ میں پیش کردہ مقالہ "اسلامی نظام میں معاشیات"۔

لیکن یہ حضرات قرآن میں کہیں یہ نہیں دکھا سکتے کہ ان کے بیان کردہ نظام ربوبیت کا کوئی نقشہ اللہ تعالٰی نے پیش کیا ہو اور اس کے متعلق احکام دیئے ہوں اور یہ ارشاد فرمایا ہو کہ ہمارا اصل مقصد تو یہی نظام ربوبیت قائم کرنا ہے' البتہ صدقہ و خیرات اور وراثت وغیرہ کے احکام ہم اس وقت تک کے لیے دے رہے ہیں' جب تک یہ نظام قائم نہ ہو جائے۔ یہ سب کچھ ان حضرات نے خود گھڑ لیا ہے اور اس کے مقابلے میں قرآن کے واضح اور قطعی احکام کو یہ عبوری دور کے احکام قرار دے کر صاف اڑا دینا چاہتے ہیں۔ اس معاملہ کو آخر کیا نسبت ہے اس بات سے جو حضرت عمرؓ نے مولفۃ القلوب کے بارے میں فرمائی تھی۔ اس کا منشا تو صرف یہ تھا کہ جب تک ہمیں تالیف قلب کے لیے ان لوگوں کو روپیہ دینے کی ضرورت تھی' ہم دیتے تھے' اب اس کی حاجت نہیں ہے' اس لیے اب ہم انہیں نہیں دیں گے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں فقراء و مساکین کو صدقہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس حکم کے مطابق ہم ایک شخص کو اسی وقت تک زکوٰۃ دیں گے جب تک وہ فقیر و مسکین رہے۔ جب اس کی یہ حالت نہ رہے گی تو ہم اسے دینا بند کر دیں گے۔ اس بات میں اور پرویز صاحب کے نظریہ "عبوری دور" میں کوئی دور کی مناسبت بھی نہیں ہے۔

۳۲۔ "عبوری دور" کا غلط مفہوم

اعتراض: "اس کے تو آپ خود بھی قائل ہیں کہ شریعت کا ایک حتمی فیصلہ بھی حالات کے سازگار ہونے تک ملتوی رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً آئین پاکستان کے سلسلے میں آپ نے کہا تھا کہ "ایک اسلامی ریاست کے نظم کو چلانے میں غیر مسلموں کی شرکت شرعاً اور عقلاً دونوں طور پر صحیح نہیں

لیکن سردست ایک عارضی بندوبست کی حیثیت سے ہم اس کو جائز اور مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کو ملک کی پارلیمنٹ میں نمائندگی دی جائے"۔
(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۵۲ء، ص ۲۳۰-۲۳۱)

جواب: یہ معاملہ بھی منکرین حدیث کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ غیر مسلموں کے متعلق تو ہمیں مثبت طور پر معلوم ہے کہ اسلام اپنا نظام حکومت چلانے کی ذمہ داری میں انہیں شریک نہیں کرتا۔ اس لیے ہمارا یہ فرض ہے کہ اس پالیسی کو نافذ کریں، اور جب تک ہم اسے نافذ کرنے پر قادر نہیں ہوتے اس وقت تک مجبوراً جو کچھ بھی کریں ایک عارضی انتظام کی حیثیت سے کریں بخلاف اس کے منکرین حدیث ایک نظام ربوبیت خود تصنیف کرتے ہیں جس کے متعلق قرآن کا کوئی ایک مثبت حکم بھی وہ نہیں دکھا سکتے، اور شخصی ملکیت کے اثبات پر جو واضح اور قطعی احکام قرآن میں ہیں ان کو وہ عبوری دور کے احکام قرار دیتے ہیں۔ ان دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے نزدیک "عبوری دور" کی تعریف یہ ہے کہ قرآن کے ایک حکم یا اس کے دیئے ہوئے کسی قاعدے اور اصول پر عمل کرنے میں اگر کچھ موانع موجود ہیں تو ان کو دور کرنے تک عارضی طور پر جو کچھ بھی ہم مجبوراً کریں گے وہ عبوری دور کا انتظام ہو گا۔ اس کے برعکس منکرین حدیث کے نزدیک ان کے اپنے تصنیف کردہ اصولوں پر عمل درآمد کرنے کے لیے جب تک فضا سازگار نہ ہو، اس وقت تک وہ قرآن کے دیئے ہوئے احکام اور اس کے مقرر کیے ہوئے اصولوں پر محض ایک عارضی انتظام کی حیثیت سے عمل کریں گے۔

۳۳۔ حضورؐ کیا صرف شارح قرآن ہی ہیں یا شارع بھی؟

اعتراض: "ایک سوال یہ بھی سامنے آیا تھا کہ سنت قرآنی احکام و اصول کی تشریح ہے یا وہ قرآنی احکام کی فہرست میں اضافہ بھی کرتی ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن نے جن باتوں کو اصولی طور پر حکم دیا، سنت نے ان

کی جزئیات متعین کر دیں۔ یہ نہیں کہ کچھ احکام قرآن نے دیئے اور اس فہرست میں سنت نے مزید احکام کا اضافہ کر دیا۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ قرآنی احکام نے جو فہرست دی وہ ناتمام تھی' سنت نے مزید اضافہ سے اس فہرست کی تکمیل کر دی۔ لیکن آپ نے جہاں ایک جگہ پہلی صورت بیان کی ہے دوسرے مقام پر دوسری شکل بھی بیان کر دی ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

آپ تھوڑی سی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان سے بھی پوچھئے کہ (بقول آپ کے) رسول اللہ صلعم کا یہ ارشاد کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی حرام ہے' قرآن کے حکم (یعنی دو بہنوں کو جمع کرنا حرام ہے) کی توضیح و تشریح ہے یا محرمات کی قرآنی فہرست میں اضافہ ہے۔ ہر سمجھ دار شخص (بشرطیکہ وہ آپ کی طرح ضدی نہ ہو یا تجاہل عارفانہ نہ کرتا ہو) یہ کہہ دے گا کہ یہ فہرست میں اضافہ ہے۔ اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قرآنی فہرست میں پھوپھیوں' خالاؤں' بھانجیوں' رضاعی ماؤں اور بہنوں' بیویوں کی ماؤں اور بیٹوں کی بیویوں حتیٰ کہ پالی ہوئی لڑکیوں تک کا ذکر کر دیا ہے' اور یہ بھی کہہ دیا کہ دو بہنوں کو اکٹھا نہیں کرنا چاہیے' وہاں کیا اللہ میاں کو (معاذ اللہ) یہ کہنا نہیں آتا تھا کہ پھوپھی' بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی اکٹھا نہیں کیا جا سکتا"۔

جواب: اس ساری تقریر کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شارح قرآن بھی تھے اور خدا کے مقرر کردہ شارع بھی۔ ان کا منصب یہ بھی تھا کہ لتبین للناس ما نزل الیہم (لوگوں کے لیے خدا کے نازل کردہ احکام کی تشریح کریں) اور یہ بھی کہ یحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث (پاک چیزیں

لوگوں کے لیے حلال کریں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کر دیں)۔ اس لیے حضورؐ جس طرح قرآن کے قانون کی تشریح کرنے کے مجاز تھے اور آپ کی تشریح سند و حجت تھی' اسی طرح آپ تشریع کے بھی مجاز تھے اور آپ کی تشریع سند و حجت تھی۔ ان دونوں باتوں میں قطعاً کوئی تضاد نہیں ہے۔

رہا پھوپھی اور خالہ کا معاملہ' تو منکرین حدیث اگر کج بحثی کی بیماری میں مبتلا نہ ہوتے تو ان کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آ سکتی تھی کہ قرآن نے جب ایک عورت کو اس کی بہن کے ساتھ نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا تو اس سے مقصود محبت کے اس تعلق کی حفاظت کرنا تھا جو بہن اور بہن کے درمیان فطرتاً ہوتا ہے اور عملاً ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ یہی علت باپ کی بہن اور ماں کی بہن کے معاملے میں بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا پھوپھی اور بھتیجی کو' اور خالہ اور بھانجی کو بھی نکاح میں جمع کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ خواہ تشریح تعبیر ہو' یا استنباط یا تشریع' بہرحال خدا کے رسولؐ کا حکم ہے اور آغاز اسلام سے آج تک تمام امت نے بالاتفاق اسے قانون تسلیم کیا ہے۔ خوارج کے ایک فرقے کے سوا کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا اور اس فرقے کا استدلال بعینہ وہی تھا جو منکرین حدیث کا ہے کہ یہ حکم چونکہ قرآن میں نہیں ہے' لہٰذا ہم اسے نہیں مانتے۔

دوسری بحثیں جو ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں اٹھائی ہیں' وہ سب قلت علم اور قلت فہم کا نتیجہ ہیں۔ شریعت کے اہم اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک معاملہ میں جو چیز علت حکم ہو رہی ہو وہی اگر کسی دوسرے معاملہ میں پائی جائے تو اس پر بھی وہی حکم جاری ہو گا مثلاً قرآن میں صرف شراب (خمر) کو حرام کیا گیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس میں علت حکم اس کا نشہ آور ہونا ہے' اس لیے ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اب صرف ایک کم علم اور نادان آدمی ہی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا منشا اگر یہی تھا تو کیا قرآن میں بھنگ' چرس' تاڑی وغیرہ تمام مسکرات کی

فہرست نہیں دی جا سکتی تھی؟

۳۴۔ بصیرت رسولؐ کے خداداد ہونے کا مفہوم

اعتراض: "ساری بحث کا مدار بس اس سوال پر ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی وہ ساری کی ساری قرآن کریم میں درج ہو گئی ہے یا قرآن میں صرف وحی کا ایک حصہ داخل ہوا ہے اور دوسرا حصہ درج نہیں ہوا۔ آپ کا جواب یہ ہے کہ وحی کی دو (بلکہ کئی) قسمیں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک قسم کی وحی قرآن میں درج ہوئی ہے۔ باقی اقسام کی وحییں قرآن میں درج نہیں ہوئی ہیں۔ میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ نے تفہیمات جلد اول میں یہ لکھا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ اصولی قانون قرآن ہی ہے مگر یہ قانون ہمارے پاس بلاواسطہ نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ رسول خدا[1] کے واسطے سے بھیجا گیا ہے۔ اور رسول کو درمیانی واسطہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور اپنی امت کی عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونہ پیش کر دیں اور اپنی خداداد بصیرت سے ہمارے لیے وہ طریقے متعین کر دیں جن کے مطابق ہمیں اس اصولی قانون کو اپنی اجتماعی زندگی اور انفرادی برتاؤ میں نافذ کرنا چاہیے"۔ (صفحہ ۲۳۷)

وحی کی خصوصیت یہ ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر وہ منزل من اللہ کہلاتی ہے کہ اس میں اس فرد کی بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہوتا جس

---

[1] اس کے بعد کا فقرہ جسے ڈاکٹر صاحب نے چھوڑ دیا ہے' یہ ہے:

"پس قرآن کی رو سے صحیح ضابطہ یہ ہے کہ پہلے خدا کا بھیجا ہوا اصولی قانون' پھر خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ' پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے اولی الامر کا اجتہاد اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم..... (النساء' رکوع ۸)"

پر وہ وحی بھیجی جاتی ہے۔ جس "وحی" کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اصولی قانون کے عملی طریقے متعین فرمائے تھے۔ اگر وہ واقعی وحی منزل من اللہ تھی تو اس میں حضورؐ کی بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا تھا اور اگر حضورؐ نے اپنی بصیرت سے تجویز فرمایا تھا تو وہ وحی نہیں تھی۔ رسول کی اپنی بصیرت کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو وہ خدا کی وحی نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ میں نے "خداداد بصیرت" کہا ہے اور انسانی بصیرت اور خداداد بصیرت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ کا یہ جواب ہے تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو جو بصیرت ملی ہے' وہ خداداد ہے' یا کسی اور کی عطا کردہ؟ ہر انسانی بصیرت خداداد ہی ہوتی ہے۔

جواب: یہاں ڈاکٹر صاحب نے لفظ وحی کے معنی سمجھنے میں پھر وہی غلطی کی ہے جس پر میں نے اپنے آخری خط میں ان کو متنبہ کر دیا تھا (ملاحظہ ہو کتاب ہذا' ص ۴۲۔۴۳) یہ منکرین حدیث کے بے نظیر اوصاف میں سے ایک نمایاں وصف ہے کہ آپ ان کی ایک غلطی کو دس مرتبہ بھی مدلل طریقے سے غلط ثابت کر دیں' پھر بھی وہ اپنی بات دہراتے چلے جائیں گے اور آپ کی بات کا قطعاً کوئی نوٹس نہ لیں گے۔

"خداداد بصیرت" سے میری مراد کوئی پیدائشی وصف نہیں ہے جس طرح ہر شخص کو کوئی نہ کوئی پیدائشی وصف ملا کرتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ وہبی بصیرت ہے جو نبوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرائض نبوت ادا کرنے کے لیے حضورؐ کو عطا فرمائی تھی' جس کی بنا پر حضورؐ قرآن کے مقاصد کی ان گہرائیوں تک پہنچتے تھے جن تک کوئی غیر نبی نہیں پہنچ سکتا' جس کی روشنی میں آپ اسلام کی راہ راست پر خود چلتے تھے اور دوسروں کے لیے نشانات راہ واضح کر دیتے تھے۔ یہ بصیرت لازمہ نبوت تھی جو کتاب کے ساتھ ساتھ حضورؐ کو عطا کی گئی تھی تاکہ آپ کتاب کا اصل منشا

بھی بتائیں اور معاملات زندگی میں لوگوں کی رہنمائی بھی کریں۔ اس بصیرت سے غیر انبیاء کی بصیرت کو آخر کیا نسبت ہے؟ غیر نبی کو جو بصیرت بھی اللہ سے ملتی ہے' خواہ وہ قانونی بصیرت ہو یا طبی بصیرت یا کاریگری و صناعی اور دوسرے علوم و فنون کی بصیرت' وہ اپنی نوعیت میں اس نور علم و حکمت اور اس کمال فہم و ادراک سے بالکل مختلف ہے جو نبی کو کار نبوت انجام دینے کے لیے عطا کیا جاتا ہے۔ پہلی چیز خواہ کتنی ہی اونچے درجے کی ہو' بہرحال کوئی یقینی ذریعہ علم نہیں ہے کیونکہ اس بصیرت کے ذریعہ سے ایک غیر نبی جن نتائج پر بھی پہنچتا ہے ان کے متعلق علم نہیں ہے کیونکہ اس بصیرت کے ذریعہ سے ایک غیر نبی جن نتائج پر بھی پہنچتا ہے ان کے متعلق وہ قطعاً نہیں جانتا کہ یہ نتائج وہ خدا کی رہنمائی سے اخذ کر رہا ہے یا اپنی ذاتی فکر سے۔ اس کے برعکس دوسری چیز اسی طرح یقینی ذریعہ علم ہے جس طرح نبی پر نازل ہونے والی کتاب یقینی ذریعہ علم ہے۔ اس لیے کہ نبی کو پورے شعور کے ساتھ یہ علم ہوتا ہے کہ یہ رہنمائی خدا کی طرف سے ہو رہی ہے لیکن منکرین حدیث کو نبی کی ذات سے جو سخت عناد ہے' اس کی وجہ سے نبی کے ہر فضل و شرف کا ذکر انہیں تیغ پا کر دیتا ہے اور وہ یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ نبی میں اور عام دانشمند انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسے اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو وہ صرف یہ کہ اللہ میاں نے اپنی ڈاک بندوں تک پہنچانے کے لیے اس کو نامہ بر مقرر کر دیا تھا!

۳۵۔ وحی کی اقسام از روئے قرآن

اعتراض: "آپ نے وحی خداوندی کی مختلف اقسام کے ثبوت میں سورہ الشوریٰ کی آیت ۵۱ پیش فرمائی ہے اس کا ترجمہ آپ نے یہ کیا ہے:

"کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے مگر وحی کے طریقے پر یا پردے کے پیچھے سے یا اس طرح کہ ایک پیغام بر بھیجے اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہو' وہ برتر اور حکیم ہے"۔

اول تو آپ نے (میری قرآنی بصیرت کے مطابق) اس آیت کے آخری حصے کے معنی ہی نہیں سمجھے۔ میں اس آیت سے یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ صرف انبیائے کرام سے ہمکلام ہونے کے طریقوں کے متعلق بیان نہیں کر رہا بلکہ اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ اس کا ہر بشر کے ساتھ بات کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حضرات انبیائے کرام اور دوسرے غیر نبی انسان۔ اس آیت کے پہلے دو حصوں میں حضرات انبیائے کرام سے کلام کرنے کے دو طریقوں کا ذکر ہے۔ ایک طریقے کو وحی سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے مطلب ہے قلب نبوی پر وحی کا نزول جو حضرت جبریل کی وساطت سے ہوتا تھا اور دوسرا طریقہ تھا براہ راست خدا کی آواز جو پردے کے پیچھے سے سنائی دیتی تھی اور اس کا خصوصی ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم میں وضاحت سے ہے کہ کلم اللہ موسیٰ تکلیما (۱۶۴:۴) اور دوسرے مقام پر ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کی خواہش ظاہر کی کہ جو ذات مجھ سے یوں پس پردہ کلام کرتی ہے میں اسے بے نقاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس حصے کا یہ مفہوم لینا کہ انبیائے کرام کو خوابوں کے ذریعے وحی ملا کرتی تھی، کسی طرح بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ آیت کے تیسرے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام انسانوں سے خدا کا بات کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان کی طرف رسول بھیجتا ہے۔ اس رسول کی طرف خدا وحی کرتا ہے اور رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہم جب قرآن کریم پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے باتیں کر رہا ہوتا ہے"۔

جواب: "قرآنی بصیرت" کا جو نمونہ یہاں پیش فرمایا گیا ہے اس کا طول و عرض معلوم کرنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن مجید میں سورۂ

شوریٰ کا پانچواں رکوع نکال کر دیکھ لیجئے۔ جس آیت کے یہ معنی ڈاکٹر صاحب بیان فرما رہے ہیں' ٹھیک اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وکذلک اوحینا الیک روحاً من امرنا ماکنت تدری ماالکتب ولا الایمان ولکن جعلنہ نوراً نھدی بہ من نشآء من عبادنا وانک لتھدی الی صراط مستقیم (آیت ۵۲)

اور اسی طرح (اے نبی) ہم نے وحی کی تمہاری طرف اپنے فرمان کی روح' تم کو پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے' مگر ہم نے اس کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم رہنمائی کرتے ہیں جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں سے' اور یقیناً تم رہنمائی کرتے ہو راہ راست کی طرف۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ آیت کا کوئی حصہ بھی عام انسانوں تک خدا کی باتیں پہنچنے کی صورت بیان نہیں کر رہا ہے بلکہ اس میں صرف وہ طریقے بتائے گئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنے نبی تک اپنی بات پہنچاتا ہے۔ فرمان خداوندی پہنچنے کے جن تین طریقوں کا اس میں ذکر کیا گیا ہے انہی کی طرف اس آیت میں وکذلک (اور اسی طرح) کا لفظ اشارہ کر رہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ انہی تین طریقوں سے ہم نے اپنے فرمان کی روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ روحاً من امرنا سے مراد جبریل امین نہیں لیے جاسکتے' کیونکہ اگر وہ مراد ہوتے تو اوحینا الیک کہنے کے بجائے ارسلنا الیک فرمایا جاتا۔ اس لیے "فرمان کی روح" سے مراد وہ تمام ہدایات ہیں جو مذکورہ تین طریقوں سے حضورؐ پر وحی کی گئیں۔ پھر آخری دو فقروں میں واقعات کی ترتیب یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کی رہنمائی اس نور سے کر دی جو "روح فرمان" کی شکل میں اس کے پاس بھیجا گیا' اور اب وہ بندہ صراط مستقیم کی طرف لوگوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

تاہم اگر سیاق و سباق کو نظرانداز کر کے صرف اسی ایک آیت پر نگاہ مرکوز کر

لی جائے جس کی تفسیر ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں تب بھی اس کا وہ مطلب نہیں نکلتا جو انہوں نے اس سے نکالنے کی کوشش کی ہے' وہ آیت کے تیسرے حصے کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالٰی عام انسانوں کی طرف رسول بھیجتا ہے' رسول کی طرف خدا وحی کرتا ہے اور رسول اس وحی کو عام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ حالانکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں: او یرسل رسولاً فیوحی باذنہ ما یشآء (یا بھیجے ایک پیغام بر پھر وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو وہ چاہے)۔ اس فقرے میں اگر "رسول" سے مراد فرشتے کے بجائے بشر رسول لیا جائے تو اس کے معنی یہ بن جائیں گے کہ رسول عام انسانوں پر وحی کرتا ہے۔ کیا واقعی عام انسانوں پر انبیاء علیہم السلام وحی کیا کرتے تھے؟ وحی کے تو معنی ہی اشارۂ لطیف اور کلام مخفی کے ہیں۔ یہ لفظ نہ تو ازروئے لغت اس تبلیغ کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جو انبیاء علیہم السلام خلق خدا کے درمیان علانیہ کرتے تھے اور نہ قرآن ہی میں کہیں اسے اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے یہاں تو رسول کا لفظ صاف طور پر اس فرشتے کے لیے استعمال ہوا ہے جو انبیاء کے پاس وحی لاتا تھا۔ اسی کی پیغام بری کو وحی کرنے کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور کیا جا سکتا ہے۔

۳۶۔ وحی غیر متلو پر ایمان' ایمان بالرسول کا جز ہے

اعتراض: "جو وحی انبیائے کرام کو ملتی تھی اس کی مختلف قسموں کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی قرآن میں کہیں یہ ذکر آیا ہے کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحی کا مجموعہ ہے اور باقی اقسام کی وحییں جو رسول اللہ کو دی گئی تھیں وہ کہیں اور درج ہیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے خود قرآن کریم میں یہ کہلوایا گیا ہے کہ اوحی الی ھذا القرآن (سورۃ انعام:۱۹) "میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا"۔ کیا قرآن میں کسی ایک جگہ بھی درج ہے کہ میری طرف قرآن وحی کیا گیا اور اس کے علاوہ اور وحی بھی ملی ہے جو اس میں درج

نہیں۔ اصل یہ ہے کہ آپ وحی کی اہمیت کو سمجھے ہی نہیں۔ وحی پر ایمان لانے سے ایک شخص مومن ہو سکتا ہے اور یہ ایمان تمام و کمال وحی پر ایمان لانا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وحی کے ایک حصے پر ایمان لایا جائے اور دوسرے حصے پر ایمان نہ لایا جائے"۔

جواب: اس بات کا ثبوت اس سے پہلے اسی مراسلت کے سلسلے میں دیا جا چکا ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی حضورؐ پر وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۱۱۸ تا ۱۲۵)۔ رہا یہ سوال کہ اس دوسری قسم کی وحی پر ایمان لانے کا حکم کہاں دیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس پر ایمان لانا دراصل ایمان بالرسالت کا ایک لازمی جزو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے علاوہ اپنے رسول پر ایمان لانے کا جو حکم دیا ہے وہ خود اس بات کا مقتضی ہے کہ رسول جو ہدایت و تعلیم بھی دیں اس پر ایمان لایا جائے، کیونکہ وہ من جانب اللہ ہے۔ ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء:۸۰) "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ وان تطیعوہ تھتدوا (النور:۵۴) "اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے"۔ اولٓئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ (الانعام:۹۱) "یہ انبیاء وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے، پس تم ان کی ہدایت کی پیروی کرو"۔

شاید ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں ہے کہ متعدد انبیاء ایسے گزرے ہیں جن پر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی۔ کتاب تو کبھی نبی کے بغیر نہیں آئی ہے لیکن نبی کتاب کے بغیر بھی آئے ہیں اور لوگ ان کی تعلیم و ہدایت پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح کتاب اللہ پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ خود کتاب لانے والے انبیاء پر بھی اول روز ہی سے وحی متلو نازل ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کا نزول اس وقت شروع ہوا جب وہ فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد بنی اسرائیل کو

لے کر طور کے دامن میں پہنچے (ملاحظہ ہو سورۂ اعراف رکوع ۱۶-۱۷، سورۂ قصص آیات ۳۰-۳۴)۔

زمانہ قیام مصر میں ان پر کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود فرعون اور مصر کا ہر باشندہ ان باتوں پر ایمان لانے کے لیے مامور تھا جنہیں وہ اللہ کی طرف سے پیش کرتے تھے، حتیٰ کہ انہی پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے وہ اپنے لشکروں سمیت مستحق عذاب ہوا۔

منکرین حدیث کو اگر اس چیز کے ماننے سے انکار ہے تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ قرآن کی موجودہ ترتیب کے من جانب اللہ ہونے پر آپ ایمان رکھتے ہیں یا نہیں؟ قرآن میں خود اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب پاک بہ یک وقت ایک مرتب کتاب کی شکل میں نازل نہیں ہوئی ہے بلکہ اسے مختلف اوقات میں بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا ہے (بنی اسرائیل:۱۰۶، الفرقان:۳۲)۔ دوسری طرف قرآن ہی میں یہ صراحت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مرتب کر کے پڑھوا دینے کا ذمہ خود لیا تھا۔ ان علینا جمعہ وقرانہ فاذا قرانہ فاتبع قرانہ (القیامہ:۱۷، ۱۸)۔ اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب براہ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت ہوئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی مرضی سے خود مرتب نہیں کر لیا ہے۔ اب کیا کسی شخص کو قرآن میں کہیں یہ حکم ملتا ہے کہ اس کی سورتوں کو اس ترتیب کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی متفرق آیتوں کو کہاں کس سیاق و سباق میں رکھا جائے؟ اگر قرآن میں اس طرح کی کوئی ہدایت نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو لامحالہ کچھ خارج از قرآن ہدایات ہی حضورؐ کو اللہ تعالیٰ سے ملی ہوں گی جن کے تحت آپ نے یہ کتاب پاک اس ترتیب سے خود پڑھی اور صحابہ کرامؓ کو پڑھوائی۔ مزید برآں اسی سورۂ قیامہ میں اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ ثم ان علینا بیانہ "پھر اس کا مطلب سمجھانا بھی ہمارے ذمہ ہے" (آیت:۱۹)۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے احکام و

تعلیمات کی جو تشریح و تعبیر حضورؐ اپنے قول و عمل سے کرتے تھے وہ آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار نہ تھی بلکہ جو ذات پاک آپ پر قرآن نازل کرتی تھی وہی آپ کو اس کا مطلب بھی سمجھاتی تھی اور اس کی وضاحت طلب امور کی وضاحت بھی کرتی تھی۔ اسے ماننے سے کوئی ایسا شخص انکار کیسے کر سکتا ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو۔

۷۔ کیا وحی غیر متلو بھی جبریل ہی لاتے تھے؟

اعتراض: "آپ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں صرف وہی وحی درج ہے جو حضرت جبریل کی وساطت سے حضورؐ پر نازل ہوئی تھی۔ پہلے تو یہ فرمائیے کہ آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ کی طرف کوئی وحی حضرت جبریل کی وساطت کے بغیر بھی آتی تھی؟ دوسرے غالباً آپ کو اس کا علم نہیں کہ جس وحی کو آپ جبریل کی وساطت کے بغیر وحی کہتے ہیں (یعنی حدیث) اس کے متعلق حدیث کو وحی ماننے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اسے بھی جبریل لے کر اسی طرح نازل ہوتے تھے جس طرح قرآن کو لے کر ہوتے تھے (ملاحظہ فرمائیے جامع بیان العلم) اس لیے آپ کا یہ بیان خود آپ کے گروہ کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں"۔

جواب: یہ عجیب مرض ہے کہ جس بات کا ماخذ بار بار بتایا جا چکا ہے اسی کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ سورۂ شوریٰ کی آیت ۵۱ جس پر ابھی ڈاکٹر صاحب خود بحث کر آئے ہیں اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انبیاء پر وحی جبریل کی وساطت کے بغیر بھی نازل ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جامع بیان العلم کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے اور یونہی کہیں سے اس کا حوالہ نقل کر دیا ہے۔ اس کتاب میں تو حسان بن عطیہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ کان الوحی ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویحضرہ جبریل بالسنۃ التی تفسر ذالک۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی اور

جبریل آ کر اس کی توضیح کرتے اور اس پر عمل کا طریقہ بتاتے تھے۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلا کہ ہر وحی جبریل ہی لاتے تھے؟ اس سے تو صرف یہ بات نکلتی ہے کہ جبریل قرآن کے سوا دوسری وحیاں بھی لاتے تھے۔ "جبریل بھی لاتے" اور جبریل ہی لاتے" کا فرق سمجھنا کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔

۳۸۔ کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہیں یا الگ الگ

اعتراض : "آپ نے یہ دلیل دی ہے کہ خدا نے "کتاب و حکمت" دونوں کو منزل من اللہ کہا ہے۔ کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد سنت یا حدیث۔ آپ کی اس قرآن دانی پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے، کم ہے۔ بندہ نواز، کتاب و حکمت میں واو عطف کی نہیں (جس کے معنی "اور" ہوتے ہیں) یہ واؤ تفسیری ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت خود قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالٰی نے قرآن کو خود حکیم (حکمت والا) کہا ہے۔ یٰس والقرآن الحکیم دوسری جگہ الکتب کی جگہ الحکیم کہا ہے۔ تلک الحکیم (۳۱:۲)

جواب : منکرین حدیث اس غلط فہمی میں ہیں کہ حرف واؤ کے معنی لینے میں آدمی کو پوری آزادی ہے، جہاں چاہے اسے عاطفہ قرار دے لے اور جہاں چاہے تفسیری کہہ دے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عربی زبان ہی میں نہیں، کسی زبان کے ادب میں بھی الفاظ کے معنی متعین کرنے کا معاملہ اس طرح الل ٹپ نہیں ہے۔ واؤ کو تفسیری صرف اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ دو لفظ جن کے درمیان یہ حرف آیا ہو، باہم مترادف المعنی ہوں، یا قرینے سے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ قائل انہیں مترادف قرار دینا چاہتا ہے۔ یہی اردو زبان میں لفظ "اور" کے استعمال کا طریقہ ہے کہ اسے تفسیری صرف اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ وہ ہم معنی الفاظ کے درمیان آئے۔ جیسے کوئی شخص کہے "یہ جھوٹ اور افترا ہے"۔ لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں واؤ کا استعمال یا تو دو الگ الگ چیزوں کو جمع کرنے کے

لیے ہو گا' یا عام کو خاص پر' یا خاص کو عام پر عطف کرنے کے لیے ہو گا۔ ایسے مقامات پر واؤ کے تفسیری ہونے کا دعویٰ بالکل مہمل ہے۔

اب دیکھیے' جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے اس کی رو سے تو ظاہر ہی ہے کہ کتاب اور حکمت مترادف الفاظ نہیں ہیں بلکہ دونوں الگ معنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ رہا قرآن' تو اس کے استعمالات سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حکمت کو وہ کتاب کا ہم معنی قرار دیتا ہے۔ سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ "اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو"۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ دعوت دو؟

حضرت عیسیٰ کے متعلق سورۂ زخرف میں فرمایا قال قد جئتکم بالحکمۃ "اس نے کہا میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں"۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب لے کر آیا ہوں؟ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا "جسے حکمت دی گئی اسے بڑی دولت دے دی گئی"۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے کتاب دی گئی؟ سورۂ لقمان میں حکیم لقمان کے متعلق فرمایا ولقد اتینا لقمن الحکمۃ "ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی"۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ کتاب عطا کی تھی؟ دراصل قرآن میں کہیں بھی کتاب بول کر حکمت مراد نہیں لی گئی ہے اور نہ حکمت بول کر کتاب مراد لی گئی ہے۔ کتاب کا لفظ جہاں بھی آیا ہے' آیات الٰہی کے مجموعہ کے لیے آیا ہے اور حکمت کا لفظ جہاں بھی آیا ہے' اس دانائی کے معنی میں آیا ہے جس سے انسان حقائق کے سمجھنے اور فکر و عمل میں صحیح رویہ اختیار کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ چیز کتاب میں بھی ہو سکتی ہے' کتاب کے باہر بھی ہو سکتی ہے' اور کتاب کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ کتاب کے لیے جہاں "حکیم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' اس کے معنی تو یہ ضرور ہیں کہ کتاب کے اندر حکمت ہے' مگر یہ معنی نہیں ہیں کہ کتاب خود حکمت ہے یا حکمت صرف کتاب میں ہے اور اس کے باہر کوئی حکمت نہیں ہے۔

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اور حکمت نازل ہونے کا یہ مطلب لینا درست نہیں ہو گا کہ حضورؐ پر صرف کتاب نازل کی گئی' بلکہ اس کے صحیح معنی یہ ہوں گے کہ آپ پر کتاب کے ساتھ وہ دانائی بھی نازل کی گئی جس سے آپ اس کتاب کا منشا ٹھیک ٹھیک سمجھیں اور انسانی زندگی میں اس کو بہترین طریقے سے نافذ کر کے دکھا دیں۔ اسی طرح یعلمھم الکتب والحکمۃ کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آپ صرف کتاب کے الفاظ پڑھوا دیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کو کتاب کا مطلب سمجھائیں اور انہیں اس دانش مندی کی تعلیم و تربیت دیں جس سے لوگ دنیا کے نظامِ زندگی کو کتاب اللہ کے منشا کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو جائیں۔

لفظ "تلاوت" کے معنی

> اعتراض: "قرآن ہی کے حکمت ہونے کے تمام دلائل سے بڑھ کر وہ دلیل ہے جو سورۂ احزاب کی اس آیت میں موجود ہے جسے آپ نے خود درج کیا ہے اور جس کے متعلق آپؐ نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ وہ آیت ہے واذکرن ما یتلٰی فی بیوتکن من ایات اللہ والحکمۃ (۳۳:۳۵) آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وحی کو جو قرآن میں درج ہے آپ وحی متلو اور خارج از قرآن وحی کو وحی غیر متلو قرار دیا کرتے ہیں۔ اس آیت میں حکمت کو بھی "ما یتلٰی" کہا گیا ہے۔ لہٰذا حکمت سے مراد وحی متلو ہے۔ وحی غیر متلو نہیں۔ دوسرے مقامات میں قرآن کو متلو کہا گیا ہے۔ مثلاً سورہ کہف میں ہے واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک (۱۸:۲۷)۔ دوسری جگہ ہے وامرت ان اکون..... ان اتلوا القرآن (۲۷:۹۲) علاوہ ازیں قرآن کے متعدد مقامات میں یتلوا علیھم ایاتہ کے الفاظ آئے ہیں۔ احادیث کی تلاوت کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ اس لیے سورۂ احزاب میں جس حکمت کی تلاوت کا

ذکر ہی اس سے مراد قرآن ہی ہے۔

جواب: یہ استدلال بھی بے علمی اور کم فہمی پر مبنی ہے۔ لفظ تلاوت کو ایک اصطلاح کے طور پر صرف "تلاوت کتاب اللہ کے معنی میں مخصوص کرنا بعد کے اہل علم کا فعل ہے جس کی بنا پر "وحی متلو" اور "وحی غیر متلو" کی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔ قرآن میں تلاوت کا لفظ مجرد پڑھنے کے معنی میں آیا ہے' اصطلاح کے طور اسے صرف آیات کتاب کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اگر اس میں کچھ شک ہو تو سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۲ ملاحظہ فرمالیں۔ واتبعوا ما تتلوا الشیطین علٰی ملک سلیمن "اور انہوں نے پیروی کی اس چیز کی جسے شیاطین تلاوت کیا کرتے تھے سلیمان کی بادشاہی کے دور میں"۔

۴۰۔ کتاب کے ساتھ میزان کے نزول کا مطلب

سوال: "آپ فرماتے ہیں:

"پھر قرآن مجید ایک اور چیز کا بھی ذکر کرتا ہے جو اللہ نے کتاب کے ساتھ نازل کی ہے' اور وہ ہے المیزان یعنی رہنمائی کی صلاحیت۔ ظاہر ہے کہ یہ تیسری چیز نہ رسول اللہ کے اقوال میں شامل ہے نہ افعال میں۔ بالفاظ دیگر جس طرح رسول اللہ کے اقوال اور افعال قرآن سے الگ تھے اسی طرح حضورؐ کے اقوال و افعال اس آسمانی رہنمائی سے بھی الگ تھے جسے المیزان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حیرت ہے کہ آپ نے سورۂ حدید کی آیت ۲۵ کا اتنا ہی حصہ کیوں نقل فرمایا۔ جس میں کتاب اور میزان کا ذکر ہے۔ اور اس ٹکڑے کا ذکر کیوں نہ کیا جس میں کہا گیا ہے وانزلنا الحدید (اور ہم نے لوہا بھی نازل کیا) اس سے تو ظاہر ہے کہ کتاب اور میزان کے ساتھ چوتھی چیز الحدید بھی اسی طرح منزل من اللہ ہے۔

جواب: اگر یہ بحث محض برائے بحث نہ ہوتی تو یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور آپ کے اقوال و افعال میں ہر معقول آدمی کو خدا کی عطا کردہ حکمت اور میزان عدل کے آثار صاف نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بحث پیدا کرنا کہ جب حکمت حضورؐ کے اقوال و افعال پر مشتمل تھی تو یہ میزان آپ کے اقوال و افعال سے باہر ہونی چاہیے درحقیقت کج بحثی کی بدترین مثال ہے۔ ایک شخص کے اقوال و افعال میں بیک وقت دانشمندی بھی پائی جا سکتی ہے اور توازن بھی۔ کیا ان دونوں چیزوں میں کوئی ایسا تضاد ہے کہ ایک چیز موجود ہو تو دوسری اس کے ساتھ موجود نہ ہو سکے؟ انہی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ منکرین حدیث کس درجہ کج فہم اور کج بحث واقع ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ میزان سے میری مراد محض رہنمائی کی عام صلاحیت نہیں' بلکہ وہ صلاحیت ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کے منشا کے مطابق افراد اور معاشرے اور ریاست میں نظام عدل قائم کیا۔

رہا الحدید والا اعتراض' تو ناظرین براہ کرم خود سورۂ حدید کی آیت ۲۵ کو پڑھ کر دیکھ لیں۔ اس میں کتاب اور میزان کے متعلق تو فرمایا گیا ہے انزلنا معھم (ہم نے یہ دونوں چیزیں انبیاء کے ساتھ نازل کیں)۔ لیکن حدید کے متعلق صرف یہ فرمایا گیا کہ وانزلنا الحدید (اور ہم نے لوہا اتارا)۔ اس لیے اس کا شمار ان چیزوں میں نہیں کیا جا سکتا جو خصوصیت کے ساتھ انبیاء کو دی گئی ہیں۔ "لوہا" تو عادل اور ظالم سب استعمال کرتے ہیں۔ یہ خصائص انبیاء میں سے نہیں ہے۔ البتہ ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس طاقت کو کتاب اور میزان کا تابع رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ رہا لوہے کا منزل من اللہ ہونا' تو منکرین حدیث کے لیے یہ بڑی عجیب بات ہے مگر قرآن کے صاف الفاظ یہی ہیں کہ انزلنا الحدید "ہم نے لوہا اتارا"۔

۴۱۔ ایک اور کج بحثی

اعتراض: "آگے چل کر آپ فرماتے ہیں "پھر قرآن ایک تیسری چیز کی بھی خبر دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ نازل کی گئی تھی"۔ اس کے لیے آپ

نے حسب ذیل تین آیات درج فرمائی ہیں:

۱۔ فامنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا (التغابن۔۸)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔

۲۔ فالذین امنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولٓئک ھم المفلحون (الاعراف:۱۵۷)

پس جو لوگ ایمان لائیں اس رسول پر اور اس کی تعظیم و تکریم کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کے پیچھے چلیں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ وہی فلاح پانے والے ہیں۔

۳۔ قد جاء کم من اللہ نور وکتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام (المائدہ:۱۵۔۱۶)

تمہارے پاس آگیا ہے نور اور کتاب مبین جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو جو اس کی مرضی کی پیروی کرنے والا ہے' سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے۔

پہلی آیت میں اللہ اور رسول اور النور پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ کیا آپ کے خیال کے مطابق اللہ اور رسول کے علاوہ ایمان لانے کا حکم نہ کتاب پر ہے نہ حکمت پر' نہ میزان پر بلکہ صرف چوتھی چیز پر ہے جسے آپ کتاب و حکمت و میزان سے الگ قرار دیتے ہیں۔ دوسری آیت میں رسول اللہ پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور النور کے اتباع کا حکم یعنی اس میں کتاب اور حکمت کے اتباع کا حکم نہیں۔ یعنی آپ کے اس استدلال کے مطابق اگر کوئی شخص قرآن پر ایمان نہیں لاتا' صرف النور پر ایمان لاتا ہے اور وہ قرآن کا اتباع بھی نہیں کرتا صرف النور کا اتباع کرتا ہے وہ مومنین اور مفلحین کے زمرے میں داخل ہو گا۔ یہ النور کیا ہے؟ اس کی وضاحت میں آپ فرماتے ہیں: "اس سے مراد وہ علم ودانش اور وہ بصیرت و فراست ہی ہو سکتی ہے جو اللہ نے حضور کو عطا فرمائی تھی"۔ چلو قرآن پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے سے تو چھٹی پائی' بلکہ حضورؐ کے اقوال و افعال کی

اطاعت سے بھی۔ کیونکہ ان آیات میں صرف النور کا ذکر ہے"۔

جواب : یہ کج بحثی کی ایک اور دلچسپ مثال ہے۔ منکرین حدیث نے کبھی سوچ سمجھ کر قرآن پڑھا ہوتا تو انہیں اس کتاب کے انداز بیان کا پتہ لگا ہوتا۔ قرآن مختلف مقامات پر موقع و محل کی مناسبت سے اپنی تعلیم کے مختلف اجزاء کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ مثلاً کہیں وہ صرف ایمان باللہ کے نتیجے میں جنت کی بشارت دیتا ہے' کہیں صرف آخرت کے اقرار و انکار کو مدار فلاح و خسران بتاتا ہے۔ کہیں خدا اور یوم آخر پر ایمان کا ثمرہ یہ بتاتا ہے کہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون کہیں صرف رسول پر ایمان لانے کو موجب فلاح ٹھیراتا ہے۔ اسی طرح اعمال میں بھی کسی چیز کو نجات کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اور کبھی کسی دوسری چیز کو۔ اب کیا یہ ساری آیات ایک دوسرے سے اسی طرح ٹکرائی جائیں گی اور ان سے یہ نتیجہ برآمد کیا جائے گا کہ ان میں تضاد ہے؟ حالانکہ ذرا سی عقل بھی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ ان تمام مقامات پر قرآن نے ایک بڑی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو حسب موقع الگ الگ نمایاں کر کے پیش کیا ہے اور ان پہلوؤں میں سے کوئی کسی دوسرے پہلو کی نفی نہیں کرتا۔ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے گا اور اس روشنی کے پیچھے چلنا قبول کرلے گا جسے رسول پاکؐ لائے ہیں وہ آپ سے آپ قرآن کو بھی مانے گا اور حضورؐ کی سکھائی ہوئی حکمت و دانش سے بھی بہرہ مند ہونے کی کوشش کرے گا۔ قرآن کا انکار کرنے والے کے متعلق یہ تصور ہی کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ نور رسالت کا متبع ہے۔

۲۲۔ تحویل قبلہ والی آیت میں کون سا قبلہ مراد ہے؟

اعتراض : "آپ نے تحویل قبلہ والی آیت اور اس کا ترجمہ یوں لکھا ہے: "وما جعلنا القبلة التی کنت علیها الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علیٰ عقبیه (۱۴۳:۲) "اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم تھے' اسی لیے مقرر کیا تھا کہ یہ دیکھیں کہ کون رسولؐ کی

پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔

اس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ:

"مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا۔ اگر آیا ہو تو آپ اس کا حوالہ دے دیں"۔ (ایضاً ص ۴۴۹)

اگر اس کے متعلق خدا کی طرف سے کوئی حکم آیا ہوتا تو ضرور قرآن میں ہوتا۔ لیکن جب حکم آیا ہی نہیں تھا تو میں اس کا حوالہ قرآن سے کیسے دوں؟ آپ نے پہلے یہ فرض کر لیا ہے کہ پہلے قبلے کو خدا نے مقرر کیا تھا اور اس کے بعد آپ اس آیت کا ترجمہ اسی مفروضہ کے مطابق کرتے ہیں۔ اس آیت میں کنت کے معنی "تو تھا" نہیں۔ اس کے معنی ہیں "تو ہے" یعنی "ہم نے وہ قبلہ جس پر تو ہے اس لیے مقرر کیا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔ ان معانی کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے"۔

جواب: اس آیت میں کنت کے معنی "تو ہے" صرف اس بنیاد پر کر ڈالے گئے ہیں کہ عربی زبان میں کان کبھی کبھی "تھا" کے بجائے "ہے" کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ لیکن جس شخص نے بھی سورۂ بقرہ کا وہ پورا رکوع کبھی سمجھ کر پڑھا ہو جس میں یہ آیت وارد ہوئی ہے، وہ یہاں کنت کے معنی "تو ہے" ہرگز نہیں لے سکتا، کیونکہ مضمون ماسبق وما بعد یہ معنی لینے میں مانع ہے۔ رکوع کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے: سیقول السفھاء من الناس ما ولھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا "نادان لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے پھیر دیا، ان کو ان کے اس قبلے سے جس پر یہ تھے"۔ یہاں کانوا کا ترجمہ "یہ ہیں" کسی طرح بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ "کس چیز نے پھیر دیا" کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پہلے مسلمان کسی اور قبلے کی طرف رخ کرتے تھے، اب اسے چھوڑ کر دوسرے قبلے کی طرف رخ پھیرنے والے ہیں، اور اسی بنا پر مخالفین کی طرف سے اس اعتراض کا موقع پیدا ہو

رہا ہے کہ اپنے پہلے قبلے سے کیوں پھر گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اگر مخالفین یہ اعتراض کریں تو اس کا جواب کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ فقرہ ارشاد فرمایا جاتا ہے: وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیھا الا...... "اور ہم نے وہ قبلہ جس پر تم تھے' نہیں مقرر کیا گیا مگر اس لیے کہ......" یہاں کنت علیھا سے مراد بعینہ وہی چیز ہے جس کے متعلق اوپر کی آیت میں کانوا علیھا فرمایا گیا ہے۔ اس کے معنی "تو ہے" کسی طرح بھی نہیں لیے جا سکتے۔ سابقہ آیت قطعی طور پر اس کے معنی "تو تھا" متعین کر دیتی ہے۔ اس کے بعد تیسری آیت میں تحویل قبلہ کا حکم اس طرح دیا جاتا ہے: قد نریٰ تقلب وجھک فی السمآء فلنولینک قبلۃ ترضھا فول وجھک شطر المسجد الحرام "ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا۔ پس ہم پھیرے دیتے ہیں تم کو اس قبلے کی طرف جسے تم چاہتے ہو' اب موڑ دو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف"۔ ان الفاظ سے صاف نقشہ نگاہ کے سامنے یہ آتا ہے کہ پہلے مسجد حرام کے سوا کسی اور قبلے کی طرف رخ کرنے کا حکم تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ اب وہ قبلہ بدل دیا جائے۔ اس لیے آپ بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھاتے تھے کہ کب تبدیلی قبلہ کا حکم آتا ہے۔ اس حالت میں فرمان آگیا کہ لو اب ہم اس قبلے کی طرف تمہیں پھیرے دیتے ہیں جسے تم قبلہ بنانا چاہتے ہو۔ پھیر دو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف۔ اس سیاق و سباق میں آیت وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیھا الخ کو رکھ کر دیکھا جائے تو ان الٹی سیدھی تاویلات کی کوئی گنجائش نہیں رہتی' جو ڈاکٹر صاحب نے یہاں پیش فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ صاف فرما رہا ہے کہ مسجد حرام سے پہلے جو قبلہ تھا' وہ بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا تھا اور ہم نے اسے اس لیے مقرر کیا تھا کہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے روگردانی کرتا ہے۔

۳۴۔ قبلے کے معاملہ میں رسولؐ کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا تھا؟

اعتراض: "اگر تسلیم کیا جائے کہ پہلا قبلہ خدا نے مقرر کیا تھا تو اس ٹکڑے کے کچھ معنی ہی نہیں بنتے کہ "ہم نے یہ اس لیے کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے"۔ اس لیے کہ پہلے قبلہ کے تعین کے وقت کسی کا الٹے پاؤں پھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضورؐ ایک قبلے کی طرف رخ کرتے تھے جو شخص حضورؐ کے ساتھ شریک ہوتا تھا وہ بھی اسی طرف رخ کر لیتا تھا۔ "الٹے پاؤں پھرنے" کا سوال اس وقت پیدا ہوا جب اس قبلے میں تبدیلی کی گئی۔ اس وقت اس کے پرکھنے کا موقع آیا کہ کون اسی پہلے قبلے کو زیادہ عزیز رکھتا ہے اور کون رسولؐ کے اتباع میں (جس نے بحکم خداوندی یہ تبدیلی کی ہے) نئے قبلے کی طرف رخ کرتا ہے۔

جواب: یہ محض قلت فہم اور قلت علم کا کرشمہ ہے۔ منکرین حدیث کو یہ معلوم نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کعبہ تمام اہل عرب کے لیے مقدس ترین تیرتھ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اسلام میں ابتداء جب اس کے بجائے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا تو یہ عربوں کے لیے سخت آزمائش کا موقع تھا۔ ان کے لیے اپنے مرکزی معبد کو چھوڑ کر یہودیوں کے معبد کو قبلہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسی کی طرف آیت زیر بحث کا یہ فقرہ اشارہ کرتا ہے کہ وان کانت لکبیرۃ الا علی الذین ھدی اللہ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم "اگرچہ وہ قبلہ سخت گراں تھا مگر ان لوگوں پر نہیں، جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی تھی، اور اللہ تمہارے اس ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے"۔ ان الفاظ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قبلے کے معاملہ میں الٹ پھر جانے کا سوال کیوں پیدا ہوتا تھا۔ مزید برآں یہی الفاظ اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتے ہیں کہ جو حکم قرآن میں نہیں آیا تھا بلکہ رسول پاکؐ کے ذریعہ سے پہنچایا گیا

تھا اسی کے ذریعہ سے لوگوں کے ایمان کی آزمائش کی گئی تھی۔ اس حکم کی پیروی جن لوگوں نے کی انہیں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم تمہارے اس ایمان کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ کیا اب بھی اس امر میں کسی شک کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ غیراز قرآن بھی رسول کے پاس کوئی حکم بذریعہ وحی آ سکتا ہے اور اس پر بھی ایمان کا مطالبہ ہے؟

۴۴۔ نبی پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام

اعتراض: "یہ بات کہ اس نئے قبلے کا حکم ہی خدا کی طرف سے آیا تھا، پہلے قبلے کا نہیں، دو ہی آیات بعد قرآن نے واضح کر دی، جہاں کہا ہے کہ: لئن اتبعت اھواء ھم من بعدما جاءک من العلم انک اذا لمن الظلمین (۲:۱۴۵) یعنی "اگر تو العلم آ جانے کے بعد ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع کرے گا تو تو اس وقت بے شک ظالموں میں سے ہو جائے گا"۔ اس سے صاف واضح ہے کہ العلم (یعنی وحی خداوندی) نئے قبلے کے لیے آئی تھی۔ اگر پہلا قبلہ بھی العلم کے مطابق مقرر ہوتا تو یہاں یہ کبھی نہ کہا جاتا کہ "العلم" کے آنے کے بعد تم پہلے قبلے کی طرف رخ نہ کرنا۔

جواب: "مجھے شکایت تھی کہ منکرین حدیث میری عبارتوں کو توڑ مروڑ کر میرے ہی سامنے پیش فرماتے ہیں۔ مگر اب کیا اس کی شکایت کی جائے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو توڑ مروڑ کر ان کے من مانے مطلب نکالنے میں اس قدر بے باک ہوں ان کے سامنے ماوشما کی کیا ہستی ہے۔ جس آیت کا آخری ٹکڑا نقل کر کے اس سے یہ مطلب نچوڑا جا رہا ہے اس پوری آیت اور اس سے پہلے کی آیت کے آخری فقرے کو ملا کر پڑھئے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ منکرین حدیث قرآن مجید کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ بیت المقدس کو چھوڑ کر جب مسجد حرام کو قبلہ بنایا گیا تو یہودیوں کے لیے اسی طرح طعن و تشنیع کا موقع پیدا ہو گیا جس طرح قبلہ سابق پر

اہل عرب کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وان الذین اوتوا الکتب لیعلمون انه الحق من ربهم وما اللّٰه بغافل عما یعملون ولئن اتیت الذین اوتوا الکتب بکل ایة ما تبعوا قبلتک وما انت بتابع قبلتهم وما بعضهم بتابع قبلة بعض' ولئن اتبعت اهوآئهم من بعد ما جآءک من العلم انک اذا لمن الظلمین (البقرہ:۱۴۴-۱۴۵)

اہل کتاب خوب جانتے ہیں کہ یہ (یعنی مسجد حرام کو قبلہ بنانا) حق ہے' ان کے رب کی طرف سے' اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی ان اہل کتاب کے پاس لے آؤ' یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہ کریں گے اور تم ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہو' اور نہ ان میں سے کوئی کسی کے قبلے کی پیروی کرنے والا ہے۔ اور اگر تم نے وہ علم آ جانے کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے ان کی خواہشات کا اتباع کیا تو تم ظالموں میں سے ہو گے۔

اس سیاق و سباق میں جو بات کہی گئی ہے اس سے یہ مطلب آخر کیسے نکل آیا کہ پہلا قبلہ "العلم" کے مطابق مقرر نہیں کیا گیا تھا اور صرف یہ دوسرا قبلہ ہی اس کے مطابق مقرر کیا گیا ہے۔ اس میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ جب خدا کا حکم بیت المقدس کو چھوڑ کر مسجد حرام کو قبلہ بنانے کے لیے آگیا ہے تو اب اس العلم کے آ جانے کے بعد محض یہودیوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر سابق قبلے کی طرف رخ کرنا ظلم ہو گا۔ کسی منطق کی رو سے بھی اس کو یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ پہلے جس قبلے کی طرف رخ کیا تھا وہ حضورؐ کا خود ساختہ تھا۔ خصوصاً جبکہ اس سے پہلے کی آیتوں میں وہ کچھ تصریحات موجود ہوں جو نمبر ۴۲ و ۴۳ میں ابھی ابھی نقل کی جا چکی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر خود ساختہ قبلہ بنانے کا الزام رکھنا ایک بدترین قسم کی جسارت ہے۔

۴۵۔ لقد صدق اللہ رسولہ الرویا کا مطلب

اعتراض: دوسری آیت آپ نے یہ پیش کی ہے لقد صدق اللہ رسولہ الرویا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شآء اللہ امنین محلقین روسکم ومقصرین لا تخافون فعلم مالم تعلموا فجعل من دون ذالک فتحا قریبا اور اس کا ترجمہ کیا ہے "اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا....." (۴۸:۲۷) اول تو فرمایئے کہ آپ نے صدق اللہ رسولہ الرویا کا ترجمہ "اللہ نے سچا خواب دکھایا" کس قاعدے کی رو سے کیا ہے؟ صدق الرویا کے معنی "اس نے سچا خواب دکھایا" ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے معنی ہیں "خواب کو سچا کر دکھایا" جیسے لقد صدق اللہ وعدہ "اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا"۔ آپ نے خود اس کا ترجمہ "پورا کر دیا" کیے ہیں۔ یہ نہیں کیے کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا۔

جواب: صدق اللہ رسولہ الرویا کے معنی "اللہ نے رسول کا خواب سچا کر دکھایا"۔ کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے۔ یہ بات کہنی ہوتی تو صدق اللہ رویا الرسول کہا جاتا نہ کہ صدق اللہ رسولہ الرویا۔ اس فقرے میں صدق کے دو مفعول ہیں: ایک رسول جسے خواب دکھایا گیا۔ دوسرا خواب جو سچا تھا' یا جس میں سچی بات بتائی گئی تھی۔ اس لیے لامحالہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا' یا اس کو خواب میں سچی بات بتائی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے عربی میں کوئی کہے صدقنی الحدیث اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے مجھ سے سچی بات کہی' نہ یہ کہ اس نے جو بات مجھ سے کہی اسے سچا کر دکھایا۔

مزید برآں اگر اس فقرے کے وہ معنی لے بھی لیے جائیں جو ڈاکٹر صاحب لینا چاہتے ہیں تو اس کے بعد والا فقرہ قطعاً بے معنی ہو جاتا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لتدخلن المسجد الحرام "تم ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے"۔ یہ الفاظ

صاف بتا رہے ہیں کہ خواب میں جو بات دکھائی گئی تھی وہ ابھی پوری نہیں ہوئی ہے' اس کی سچائی ثابت ہونے سے پہلے جن لوگوں کو رسول کے خواب کی صداقت ہے' یہ خواب پورا ہو کر رہے گا۔ اگر ان آیات کے نزول سے پہلے وہ خواب سچا کر دکھایا گیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ لتدخلن (تم ضرور داخل ہو گے) کہنے کے بجائے قد دخلتم (تم داخل ہو چکے ہو) فرماتا۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ پوری سورۂ فتح جس کی ایک آیت پر یہاں کلام کیا جا رہا ہے' اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مسلمان عمرے سے روک دیئے گئے تھے اور مسجد حرام میں داخل ہونے کا واقعہ ابھی پیش نہیں آیا تھا۔ لہٰذا اس سیاق و سباق میں اس آیت کا یہ مطلب لیا ہی نہیں جا سکتا کہ اس وقت خواب پورا ہو چکا تھا۔

۴۶۔ کیا وحی خواب کی صورت میں بھی ہوتی ہے؟

اعتراض : "آپ نے اپنے ترجمہ کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضورؐ کا یہ خواب بھی از قبیل وحی تھا۔ خواب کو وحی قرار دینا وحی کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔

جواب : سورۂ صافات کی آیت ۱۰۲۔۱۰۵ ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کی قطعی تردید کر دیتی ہیں۔ حضرت ابراہیم اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں یابنی انی اری فی المنام انی اذبحک "بیٹا" میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں"۔ صاحبزادے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ یا ابت افعل ما تؤمر "ابا جان' جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کر گزریئے"۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ صاحبزادے نے اپنے پیغمبر باپ کے خواب کو محض خواب نہیں سمجھا کہ اللہ کا حکم سمجھا جو خواب میں دیا گیا تھا۔ اگر صاحبزادے نے یہ بات غلط سمجھی تھی تو اللہ تعالیٰ اس کی تصریح فرما دیتا کہ ہم پیغمبروں کو خواب میں احکام نہیں دیا کرتے۔ لیکن اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے فرمایا یا ابراھیم قد صدقت الرویا انا کذالک نجزی

المحسنین "اے ابراہیم تم نے خواب سچا کر دکھایا' ہم محسنوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں"۔

۴۷۔ بے معنی اعتراضات اور الزامات

اعتراض: آپ نے لکھا ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپ مکہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپ اس کی خبر صحابہ کرامؓ کو دیتے ہیں اور پھر عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفار مکہ آپ کو حدیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ واقع ہو جاتی ہے۔ بعض صحابہ اس سے خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سفر میں ایسا ہو گا؟"

آپ کی اس بیان کردہ تشریح پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) خود حضورؐ کو اپنی وحی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی۔

جواب: معلوم نہیں یہ اعتراض کس جگہ سے پیدا ہو گیا کہ "خود حضورؐ کو وحی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی"۔ جو عبارت اوپر نقل کی گئی ہے اس سے تو صرف یہ مطلب نکلتا ہے کہ حضورؐ کا خواب سن کر لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ اسی سفر میں عمرہ ہو گا اور جب وہ نہ ہو سکا تو لوگ خلجان میں پڑ گئے۔

اعتراض: "جو واقعہ آپ نے شروع سے آخر تک لکھا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ "رسول اللہ کو شروع ہی سے اللہ کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ اس سال روکے جائیں گے اور اگلے سال مکہ میں داخلہ ہو گا۔ (۲) رسولؐ اللہ نے اس کی اطلاع صحابہؓ میں سے کسی کو نہ

دی بلکہ انہیں یہ غلط تاثر دیا کہ مکہ میں داخلہ اسی سفر میں ہو گا' جبھی تو صحابہؓ خلجان میں پڑ گئے اور حضرت عمرؓ جیسے قریبی صحابی کو یہ کہنا پڑا کہ آپؐ نے تو ہم سے کہا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے کیا اس سے حضورؐ پر یہ الزام نہیں آتا کہ آپ نے صحابہؓ کو دھوکا دیا؟"

جواب: یہ بات کہاں سے نکل آئی کہ حضورؐ نے یہ تاثر دیا تھا؟ وہ تو بعض لوگوں نے بطور خود سمجھ لیا تھا کہ عمرہ اسی سال ہو جائے گا۔ اوپر میری جو عبارت ڈاکٹر صاحب نے خود نقل کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ جب حضورؐ سے عرض کیا گیا کہ "کیا آپ نے ہمیں خبر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے"۔ تو حضورؐ نے ان کو جواب دیا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہو گا"۔ ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ نے واقعی لوگوں کو خود یہ تاثر دیا ہوتا کہ اسی سفر میں عمرہ ہو گا تو حضورؐ ان کے جواب میں یہ بات کیسے فرما سکتے تھے؟

اس موقع پر ناظرین اس کتاب کا صفحہ ۱۲۱۔۱۲۲ نکال کر پورا واقعہ خود دیکھ لیں کہ اصل بات کیا تھی اور اسے توڑ مروڑ کر کیا بنایا جا رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں دیکھتے ہیں کہ آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ یہ خواب آپ جوں کا توں صحابہ کو سنا دیتے ہیں۔ اور ان کو ساتھ لے کر عمرہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر نہ تو حضورؐ یہ تصریح کرتے ہیں کہ عمرہ اسی سال ہو گا اور نہ یہی فرماتے ہیں کہ اس سال نہیں ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ اس پر "غلط تاثر دینے" یا دھوکا دینے کا الزام کیسے عائد ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک سپہ سالار کو حکومت بالادست ایک مہم پر فوج لے جانے کا حکم دیتی ہے۔ سپہ سالار کو معلوم ہے کہ یہ مہم اس سفر میں نہیں بلکہ اس کے بعد ایک اور سفر میں پوری ہو گی اور یہ مہم اصل مقصد کے لیے راستہ صاف کرنے کی خاطر بھیجی جا رہی ہے۔ لیکن سپہ سالار فوج پر اس کو ظاہر نہیں کرتا اور اسے صرف

اتنا بتاتا ہے کہ مجھے یہ مہم انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا اس کو یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ اس نے فوج کو دھوکا دیا؟ کیا ایک سپہ سالار کے لیے واقعی یہ ضروری ہے کہ حکومت عالیہ کے پیش نظر جو اسکیم ہے وہ پوری کی پوری فوج پر پہلے ہی کھول دے اور اس بات کی کوئی پرواہ نہ کرے کہ اس کے ظاہر ہو جانے سے فوج کے عزم پر کیا اثر پڑے گا؟ اگر سپہ سالار فوج سے نہ یہ کہے کہ یہ مہم اسی سفر میں پوری کی جائے گی اور نہ یہی کہے کہ اس سفر میں پوری نہیں کی جائے گی تو اسے آخر کس قانون کی رو سے جھوٹ قرار دیا جائے گا۔

اعتراض: "جب اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ یہ معاملہ آخر تک یوں ہو گا تو پھر صحابہؓ کے دریافت کرنے پر اللہ تعالیٰ کو یہ کہنے کی ضرورت کیا پڑی تھی کہ "اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا' تم مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور داخل ہوں گے"۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) خود حضورؐ کو تردد ہو گیا تھا کہ معلوم نہیں خدا نے مجھے سچا خواب دکھایا تھا یا یونہی کہہ دیا تھا کہ کے چلے جاؤ' تم مسجد حرام میں داخل ہو جاؤ گے۔ اور اس تردد کو دور کرنے کے لیے خدا کو بار دیگر یہ یقین دلانا پڑا کہ آپ متردد نہ ہو جایئے۔ ہم نے سچا خواب دکھایا تھا۔ آپ ضرور مسجد حرام میں داخل ہوں گے۔

جواب: اعتراض کے شوق میں ڈاکٹر صاحب کو یہ ہوش بھی نہ رہا کہ "تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے" کا خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ لتدخلن صیغہ جمع ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو صحابہ حضورؐ کے ساتھ آئے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا' تم لوگ ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے۔

اعتراض: "آپ کے بیان سے حضورؐ پر جھوٹ کا جو الزام آتا ہے یہ آپ کے لیے کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ آپ تو اپنے جھوٹوں کے جواز میں یہاں تک کہہ

چکے ہیں کہ ایسے مواقع پر (معاذ اللہ' معاذ اللہ) حضورؐ نے بھی جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ اسے واجب قرار دیا تھا"۔

جواب: یہ "دروغ گویم بر روئے تو" کا مصداق ہے۔ منکرین حدیث جھوٹے پروپیگنڈے میں اب اس درجہ بے باک ہو چکے ہیں کہ ایک شخص کو مخاطب کر کے اس پر رو در رو جھوٹا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ کیا یہ لوگ میری کوئی عبارت اس بات کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں کہ "ایسے مواقع پر خود حضورؐ نے بھی جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت دی تھی بلکہ اسے واجب قرار دیا تھا"۔ دراصل میں نے اپنے ایک مضمون میں جو بات کہی ہے' وہ یہ نہیں ہے کہ "ایسے مواقع پر" جھوٹ جائز یا واجب ہے' بلکہ یہ ہے کہ جہاں سچائی کسی بڑے ظلم میں مددگار ہوتی ہو اور اس ظلم کو دفع کرنے کے لیے خلاف واقعہ بات کہنے کے سوا چارہ نہ ہو' وہاں سچ بولنا گناہ ہو جاتا ہے اور ناگزیر ضرورت کی حد تک خلاف واقعہ بات کہنا بعض حالات میں جائز اور بعض حالات میں واجب ہوتا ہے۔ میں نے اس کی ایک مثال بھی اسی مضمون میں دی تھی۔ فرض کیجئے کہ اسلامی فوج کی کفار سے جنگ ہو رہی ہے اور آپ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے ہیں' اگر دشمن آپ سے معلوم کرنا چاہے کہ آپ کی فوج کہاں کہاں کس کس تعداد میں ہے اور آپ کے میگزین کس کس جگہ واقع ہیں' اور ایسے ہی دوسرے فوجی راز وہ دریافت کرے تو فرمایئے کہ اس وقت آپ سچ بول کر دشمن کو تمام اطلاعات صحیح صحیح بہم پہنچا دیں گے؟ ڈاکٹر صاحب اگر اس پر معترض ہیں تو وہ اب اس سوال کا سامنا کریں اور اس کا صاف صاف جواب عنایت فرما دیں۔

اعتراض: آپ نے تو یہاں تک دریدہ دہنی سے کام لیا ہے کہ یہ کہتے ہوئے بھی نہ شرمائے کہ جب تک حکومت حاصل نہیں ہوئی تھی اس وقت تک حضور مساوات انسانی کا سبق دیتے رہے۔ اور جب حکومت حاصل ہو گئی تو اس وعظ و تلقین کو (خاکم بدہن) بالائے طاق رکھ کر

حضورؐ نے حکومت کو اپنے خاندان میں محدود کر لیا"۔

جواب: یہ رو در رو بہتان کی ایک اور مثال ہے۔ میرے جس مضمون کا حلیہ بگاڑ کر میرے ہی سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ اسلام کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں اندھا دھند طریقوں سے کام نہیں لیا جا سکتا' بلکہ کسی اصول کو کسی معاملہ پر منطبق کرتے ہوئے یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ آیا اس کو نافذ کرنے کے لیے حالات سازگار ہیں یا نہیں۔ اگر حالات سازگار نہ ہوں تو پہلے انہیں سازگار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے' پھر اسے نافذ کرنا چاہیے۔ اس کی مثال میں یہ بتایا گیا تھا کہ اگرچہ اسلام کے اصول مساوات کا یہ تقاضا تھا کہ دوسرے تمام مناصب کی طرح خلیفہ کے انتخاب میں بھی صرف اہلیت کو پیش نظر رکھا جاتا اور اس بات کا کوئی لحاظ نہ کیا جاتا کہ اہل آدمی کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ عرب کے حالات خلافت کے معاملہ میں اس قاعدے کو نافذ کرنے کے لیے اس وقت سازگار نہیں ہیں' اور ایک غیر قریشی کو خلیفہ بنا دینے سے آغاز ہی میں اسلامی خلافت کے ناکام ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ تو آپ نے ہدایت فرما دی کہ خلیفہ قریش میں سے ہو۔ اس بات کو جو معنی ڈاکٹر صاحب نے پہنائے ہیں' انہیں ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے۔

۴۸۔ نبانی العلیم الخبیر کا مطلب

اعتراض: سورۂ تحریم کی آیت آپ نے یوں پیش کی ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو راز میں ایک بات بتاتے ہیں۔ وہ اس کا ذکر دوسروں سے کر دیتی ہیں۔ حضورؐ اس پر بازپرس کرتے ہیں تو وہ پوچھتی ہیں کہ آپؐ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہہ دی ہے۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ (نبانی العلیم الخبیر) مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے"۔

اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں:

"فرمایئے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا"۔

پہلے تو یہ فرمایئے کہ حضورؐ نے جب کہا کہ مجھے "علیم و خبیر" نے خبردی ہے تو اس سے کیسے ثابت ہو گیا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے خدا نے خبردی ہے۔ کیا اس سے یہ مفہوم نہیں کہ حضورؐ کو اس نے خبردی جسے اس راز کی علم و آگہی ہو گئی تھی۔ تاہم میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ العلیم الخبیر سے مراد اللہ تعالیٰ ہی ہیں لیکن اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ خدا نے یہ اطلاع بذریعہ وحی دی تھی؟ جس شخص نے قرآن کریم کو ذرا بھی بنگاہ تعمق پڑھا ہے' اس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ جب کسی کے علم کو خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس سے مراد (بالضرور) وحی کے ذریعے علم دینا نہیں ہوتا۔ مثلاً سورہ مائدہ میں ہے وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونهن مما علمکم اللّٰہ (۵:۴) اور جو تم شکاری جانوروں کو سکھاتے ہو تو انہیں اس علم کے ذریعے سکھاتے ہو' جو اللہ نے تمہیں سکھایا ہے"۔ فرمایئے کیا یہاں "علمکم اللّٰہ" سے یہ مراد ہے کہ اللہ شکاری جانوروں کو سدھانے والوں کو بذریعہ وحی سکھاتا ہے کہ تم ان جانوروں کو اس طرح سدھاؤ؟ یاعلم الانسان مالم یعلمْ علم بالقلم (۹۶:۴-۵) کے یہ معنی ہیں کہ اللہ ہر انسان کو بذریعہ وحی یہ کچھ سکھاتا ہے جسے وہ نہیں جانتا اور خود قلم ہاتھ میں لے کر سکھاتا ہے۔

جس طرح ان آیات میں اللہ کے علم یا حکم دینے سے مراد علم و حکم بذریعہ وحی نہیں۔ اسی طرح نبانی فی العلیم الخبیر میں بذریعہ وحی اطلاع دینا مراد نہیں۔ حضورؐ نے اس بات کا علم اس طرح حاصل کیا تھا جس طرح ایسے حالات میں علم

حاصل کیا جاتا ہے۔

جواب: اس کتاب کا صفحہ ۱۳۲ نکال کر دیکھئے۔ سورۂ تحریم کی جس آیت پر یہ تقریر فرمائی جا رہی ہے' وہاں وہ پوری نقل کر دی گئی ہے۔ اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ اظھرہ اللہ علیہ "اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا"۔ اس لیے نبانی العلیم الخبیر "مجھے علیم و خبیر نے بتایا" سے مراد لامحالہ اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسرا مخبر نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں العلیم الخبیر کے الفاظ اللہ کے سوا کسی کے لیے استعمال بھی نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ کے سوا خبر دینے والا کوئی اور ہوتا تو حضورؐ فبانی خبیر (ایک باخبر نے مجھے بتایا) فرماتے۔

اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام انسانی ذرائع سے اس بات کی اطلاع ہوئی ہوتی تو محض اتنا سا واقعہ کہ بیوی نے آپ کا راز کسی اور سے کہہ دیا اور کسی مخبر نے آپ کو اس کی اطلاع دے دی۔ سرے سے قرآن میں قابل ذکر ہی نہ ہوتا' نہ اس بات کو اس طرح بیان کیا جاتا کہ "اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا" اور "مجھے العلیم الخبیر نے بتایا"۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کو اس شان سے بیان کرنے کا تو مقصد ہی لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا تھا کہ تمہارا معاملہ کسی عام انسان سے نہیں بلکہ اس رسولؐ سے ہے جس کی پشت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت ہے۔

۴۹۔ حضرت زینب کا نکاح اللہ کے حکم سے ہوا تھا یا نہیں؟

اعتراض: آپ پوچھتے ہیں کہ اللہ نے نبی اکرم کو جو حکم دیا تھا کہ تم زید کی بیوی سے نکاح کر لو تو وہ قرآن میں کہاں ہے؟ پہلے تو یہ دیکھئے کہ آپ نے لکھا ہے کہ حضورؐ نے وہ نکاح "خدا کے حکم" سے کیا تھا۔ حالانکہ آیت میں فقط یہ ہے کہ زوجنکھا' جس کا ترجمہ آپ نے بھی یہ کیا ہے کہ "ہم نے اس خاتون کا نکاح تم سے کر دیا"۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جو باتیں خدا کے بتائے ہوئے قاعدے اور قانون کے مطابق کی جائیں انہیں خدا کے بتائے ہوئے

قاعدے اور قانون کے مطابق کی جائیں۔ انہیں خدا اپنی طرف منسوب کرتا ہے' خواہ وہ کسی کے ہاتھوں سرزد ہوں' جیسے (مثلاً) سورۂ انفال میں مقتولین جنگ کے متعلق ہے۔ فلم تقتلوهم ولكن الله قتلهم (۸:۱۷) "انہیں تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا"۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ قتل جماعت مومنین کے ہاتھوں ہی سرزد ہوا تھا۔ یہی مطلب زوجنکھا سے ہے یعنی حضورؐ نے وہ نکاح خدا کے قانون کے مطابق کیا۔ وہ قانون یہ تھا کہ تم پر حرام ہیں۔ حلائل ابناء کم الذین من اصلابکم (۴:۲۳) "تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہارے صلب سے ہوں"۔ اور چونکہ منہ بولا بیٹا صلبی نہیں ہوتا اس لیے اس کی بیوی سے نکاح حرام نہیں' جائز ہے۔ حضورؐ نے خدا کے اس حکم کے مطابق حضرت زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا تھا۔

جواب: منکرین حدیث کے پیش نظر تو قرآن سے صرف اپنا مطلب نکالنا ہوتا ہے لیکن اس بحث کو جو لوگ سمجھنا چاہتے ہوں ان سے میں عرض کروں گا کہ براہ کرم سورۂ احزاب کی پہلی چار آیتیں بغور پڑھئے' پھر پانچویں رکوع کی وہ آیتیں دیکھیے جن میں حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر ہے۔ پہلی چار آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ اے نبی کافروں اور منافقوں سے نہ دبو اور اللہ کے بھروسے پر اس وحی کی پیروی کرو جو تم پر کی جا رہی ہے' منہ بولے بیٹے ہرگز اصلی بیٹے نہیں ہیں' یہ صرف ایک قول ہے جو تم لوگ منہ سے نکال دیتے ہو۔ اس ارشاد باری تعالیٰ سے یہ اشارہ تو صاف ملتا ہے کہ جس وحی کا ذکر آیت نمبر ۲ میں کیا گیا ہے وہ منہ بولے بیٹوں کے معاملہ سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی صراحت اس امر کی نہیں ہے کہ اس رسم کو توڑنے کے لیے حضورؐ کو خود اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے بعد آیات نمبر ۳۷-۳۹ یہ فقرے ملاحظہ ہوں:

فلما قضٰی زید منها وطراً زوجنكها لكی لا يكون علی

المومنین حرج فی ازواج ادعیالهم اذا قضوا منهن وطراً وکان امر اللّٰہ مفعولاً۔ ماکان علی النبی من حرج فیما فرض اللّٰہ لہ سنۃ اللّٰہ فی الذین خلوا من قبل' وکان امر اللّٰہ قدراً مقدوراً الذین یبلغون رسلت اللّٰہ ویخشرنہ ولا یخشرنہ احداً الا اللّٰہ وکفی باللّٰہ حسیباً۔

"پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے اس خاتون کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہل ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کو بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں۔ اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی تھا۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے فرض کر دیا ہو۔ اللہ کا یہی طریقہ ان لوگوں کے لیے بھی مقرر تھا۔ جو پہلے گزر چکے ہیں۔ اللہ کا حکم (ان پیغمبروں کے لیے) ایک بچا تلا فیصلہ ہے' جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے ڈرتے نہیں' اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے"۔

اس پوری عبارت پر اور خصوصاً خط کشیدہ فقروں پر غور کیجئے۔ کیا یہ مضمون اور یہ انداز بیان یہی بتا رہا ہے کہ ایک کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے قانون کے مطابق کیا تھا۔ اس لیے اللہ نے اسے اپنی طرف منسوب کر دیا؟ یا یہ صاف طور پر اس بات کی صراحت کر رہا ہے کہ اس نکاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حکم دیا تھا اور اس متعین مقصد کے لیے دیا تھا کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں حقیقی بہوؤں کی طرح حرام نہ رہیں؟ عام لوگوں کے لیے تو ایسے بیٹوں کی مطلقہ بیویوں سے نکاح صرف جائز تھا مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کو فرض کیا گیا تھا' اور یہ فرض اس فریضہ رسالت کا ایک حصہ تھا جسے ادا کرنے کے لیے حضورؐ مامور تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تقریر ملاحظہ کیجئے اور خود اندازہ کیجئے

کہ یہ لوگ واقعی قرآن کے پیرو ہیں یا قرآن کو اپنے نظریات کا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔

۵۰۔ باذن اللّٰہ سے مراد قاعدۂ جاریہ ہے یا حکم الٰہی؟

اعتراض: پانچویں آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ حضورؐ نے جب بنی نضیر کے خلاف فوج کشی کی تو اس وقت گردو پیش کے بہت سے درخت کاٹ ڈالے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو۔ اس پر اللہ نے کہا کہ ماقطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علی اصولھا فباذن اللہ (۵:۵۹) "کھجوروں کے درخت جو تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیئے یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے"۔

اس پر آپ پوچھتے ہیں کہ:

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآن کریم کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی؟"

سورۂ حج کی اس آیت میں جس میں کہا گیا ہے کہ اذن للذین یقتلون بانھم ظلموا (۳۹:۲۲) "ان لوگوں کو جن کے خلاف اعلان جنگ کیا جاتا ہے، جنگ کی اجازت دی جاتی ہے، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے"۔ اس آیت میں جماعت مومنین کو ظالمین کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جنگ کی اس اصولی اجازت میں ہر اس بات کی اجازت شامل ہے جو (قاعدے اور قانون کی رو سے) جنگ کے لیے ضروری ہو۔ جو بات خدا کے مقرر کردہ قاعدے کی رو سے اور قانون کے مطابق ہو، قرآن اسے باذن اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً وما اصابکم یوم التقی الجمعن فباذن اللہ (۱۶۵:۳) "اور جو کچھ تمہیں اس دن مصیبت پہنچی جب دو گروہ آمنے سامنے ہوئے تھے تو وہ باذن اللہ تھا"۔ خواہ وہ قانون خارجی کائنات میں ہی کیوں نہ کارفرما ہو۔

جواب: یہ ساری بحث یہاں میرے استدلال کا مرکزی نکتہ چھوڑ کر کی گئی ہے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ جب مسلمانوں نے یہ کام کیا تو مخالفین نے شور مچا دیا کہ باغوں کو اجاڑ کر اور ہرے بھرے ثمروار درختوں کاٹ کر ان لوگوں نے فساد فی الارض برپا کیا ہے (ملاحظہ ہو کتاب ہذا صفحہ ۱۲۴)۔ یہ میرے استدلال کی اصل بنیاد تھی جسے ڈاکٹر صاحب نے قصداً درمیان سے ہٹا کر اپنی بحث کا راستہ صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا استدلال یہ تھا کہ یہود اور منافقین نے مسلمانوں پر ایک متعین الزام لگایا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ مصلح بن کر اٹھے ہیں اور اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم فساد فی الارض کو مٹانے والے ہیں، مگر لو دیکھ لو کہ یہ کیسا فساد فی الارض برپا کر رہے ہیں۔ اس کا جواب جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ مسلمانوں نے یہ کام ہماری اجازت سے کیا ہے، تو لامحالہ یہ ان کے اعتراض کا جواب اسی صورت میں قرار پا سکتا ہے جبکہ خاص طور پر اسی کام کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو۔ جنگ کے عام قاعدے جو دنیا میں رائج تھے، وہ بنائے جواب نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ دنیا کے جنگی رواجات تو اس زمانے میں زیادہ تر وحشیانہ و ظالمانہ تھے اور مسلمان خود ان کو فساد فی الارض قرار دیتے تھے۔ معترضین کے جواب میں ان کا سہارا کیسے لیا جا سکتا تھا۔ رہے قوانین فطرت، تو ان کا حوالہ تو یہاں صریحاً مضحکہ انگیز ہی ہوتا۔ کسی شخص کی عقل ٹھکانے ہو تو وہ کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس موقع پر جب مخالفین نے مسلمانوں کو فساد فی الارض کا مجرم ٹھہرایا ہو گا تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں یہ فرمایا ہو گا کہ میاں قوانین فطرت یہی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید سے جو چند مثالیں یہاں پیش کی ہیں، ان سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ منکرین سنت قرآن کے فہم سے بالکل کورے ہیں۔ آیات قرآنی کے موقع و محل اور سیاق و سباق اور پس منظر سے آنکھیں بند کر کے بے تکلف ایک موقع کی آیات کے معنی بالکل مختلف مواقع کی آیات سے متعین کر ڈالتے ہیں۔

۵۱۔ ایک اور خانہ ساز تاویل

اعتراض: چھٹی آیت آپ نے یہ پیش کی ہے:

واذیعدکم اللّٰہ احدی الطائفتین انھا لکم.... ویرید اللّٰہ ان یحق الحق بکلمتہ ویقطع دابر الکافرین (۸:۷)

"اور جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں (یعنی تجارتی قافلے اور قریش کے لشکر) میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا اور تم چاہتے تھے کہ بے زور گروہ (یعنی تجارتی قافلہ) تمہیں ملے۔ حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی کمر توڑ دے"۔

اس کے بعد آپ دریافت فرماتے ہیں کہ:

"کیا آپ پورے قرآن میں کسی آیت کی نشان دہی فرما سکتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نازل ہوا ہو کہ اے لوگو جو مدینہ سے بدر کی طرف جا رہے ہو۔ ہم دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں قابو عطا فرمائیں گے؟"

اصولی طور پر یہ وہی کلی وعدہ تھا جس کے مطابق خدا نے جماعت مومنین سے کہہ رکھا تھا کہ انہیں استخلاف فی الارض عطا کرے گا۔ خدا اور رسولؐ کامیاب رہیں گے۔ غلبہ و تسلط حزب اللہ کا ہو گا۔ مومن اعلون ہوں گے۔ خدا کافروں کو مومنوں پر کبھی کامیابی نہیں دے گا۔ مجاہدین مخالفین کے اموال و املاک تک کے مالک ہوں گے' وغیرہ وغیرہ۔ اور اس خاص واقعہ میں یہ "وعدہ" پیش افتادہ حالات (Circumstances) دلا رہے تھے جن کی وضاحت قرآن کریم نے یہ کہہ کر دی ہے کہ وتودون ان غیر الشوکۃ تکون لکم (۸:۷) یعنی ان میں سے ایک گروہ بغیر ہتھیاروں کے تھا۔ اور اس پر غلبہ پالنا یقینی نظر آتا تھا۔

میں یہ پہلے وضاحت سے بتا چکا ہوں کہ جو باتیں طبعی قوانین کے مطابق ہوں' خدا انہیں بھی اپنی طرف منسوب کر سکتا ہے۔ یہ "اللہ کا وعدہ" بھی اسی قبیل سے

تھا یعنی حالات بتا رہے تھے کہ ان دونوں میں سے ایک گروہ پر قابو پالینا یقینی ہے۔

جواب : یہاں پھر سیاق و سباق اور موقع و محل کو نظرانداز کر کے سخن سازی کی کوشش کی گئی ہے۔ ذکر ایک خاص موقع کا ہے۔ ایک طرف مکہ سے کفار کا لشکر بڑے سازوسامان کے ساتھ آ رہا تھا اور اس کی فوجی طاقت مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی۔ دوسری طرف شام سے قریش کا تجارتی قافلہ آ رہا تھا جس کے ساتھ بہت سا مال تھا اور فوجی طاقت برائے نام تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس موقع پر ہم نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک پر تم کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ تجارتی قافلے پر ہمیں غلبہ حاصل ہو جائے۔ یہ ایک صاف اور صریح وعدہ تھا جو دو متعین چیزوں میں سے ایک کے بارے میں کیا گیا تھا مگر ڈاکٹر صاحب اس کی دو تاویلیں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد استخلاف فی الارض اور انتم الاعلون والا وعدۂ عام ہے' حالانکہ اگر وہ مراد ہوتا تو دونوں پر ہی غلبہ کا وعدہ ہونا چاہیے تھا نہ کہ دو میں سے ایک پر۔ دوسری تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ اس وقت حالات بتا رہے تھے کہ دونوں میں سے ایک گروہ پر قابو پالینا یقینی ہے' اور حالات کی اسی نشان دہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ قرار دیا۔ حالانکہ بدر کی فتح سے پہلے جو حالات تھے وہ یہ بتا رہے تھے کہ تجارتی قافلے پر قابو پالینا تو یقینی ہے لیکن لشکر قریش پر قابو پانا سخت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی آیت سے پہلے والی آیت میں خود فرما رہا ہے کہ اس لشکر کے مقابلے پر جاتے ہوئے مسلمانوں کی کیفیت یہ ہو رہی تھی کہ کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون (الانفال:٦) "گویا وہ آنکھوں دیکھتے موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں"۔ کیا یہی وہ حالات تھے جو بتا رہے تھے کہ لشکر قریش پر بھی قابو پالینا اسی طرح یقینی ہے جس طرح قافلے پر قابو پانا؟ اسی طرح کی سخن سازیوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منکرین حدیث کا یہ گروہ قرآن سے اپنے ہی نظریات نہیں بناتا بلکہ قرآن پر اپنے نظریات ٹھونستا ہے' خواہ اس کے الفاظ کتنا ہی ان سے انکار کر رہے ہوں۔

۵۲۔ سوال از آسمان و جواب از ریسماں

اعتراض: آخری آیت آپ نے یہ پیش کی ہے کہ:

"اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکة مردفین (۸:۹)" جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد کے جواب میں فرمایا میں تمہاری مدد کے لیے لگاتار ایک ہزار فرشتے بھیجنے والا ہوں"۔

اس کے بعد آپ پوچھتے ہیں:

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالٰی کی طرف سے مسلمانوں کی فریاد کا یہ جواب قرآن کی کس آیت میں نازل ہوا تھا؟"

کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ جب اللہ نے کہا کہ اجیب دعوة الداع اذا دعان (۲:۱۸۶) "میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں' جب وہ مجھے پکارتا ہے"۔ تو خدا کی طرف سے پکارنے والے کی پکار کا جواب کس فرشتے کے ذریعے ملتا ہے؟ جس طریق سے ہر پکارنے والے کو خدا کی طرف سے اس کی پکار کا جواب ملتا ہے اسی طریق سے جماعت مومنین کو ان کی پکار کا جواب ملا تھا۔ لیکن جواب ان لوگوں کو کسی طرح نظر آجائے جو خدا کی ہر بات کو کاغذ پر تحریر شدہ مانگیں"۔

جواب: سوال از آسمان و جواب از ریسماں۔ میرا سوال یہ تھا کہ اللہ تعالٰی نے مسلمانوں کی فریاد کے جواب میں ایک ہزار فرشتے بھیجنے کے جس صریح اور قطعی وعدے کا ذکر اس آیت میں کیا ہے وہ قرآن کی کس آیت میں نازل ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جس طریقے سے ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب اللہ کے ہاں سے ملا کرتا ہے اسی طریقے سے جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی پکار کا جواب بھی ملا تھا۔ کیا ہر پکارنے والے کو اللہ تعالٰی کی طرف سے ایسا ہی واضح جواب ملا کرتا ہے کہ تیری مدد کے لیے اتنے ہزار فرشتے بھیجے جا رہے ہیں؟ اور کیا تعداد کے اس قطعی تعین کے ساتھ صاف الفاظ میں اس جواب کا ذکر کتاب اللہ

میں بھی لکھا ہوا مل جاتا ہے؟

یہاں یہ عجیب اور دلچسپ بات بھی لائق ملاحظہ ہے کہ ہم پر "خدا کی ہر بات کو کاغذ پر تحریر شدہ مانگنے" کا الزام وہ لوگ عائد کر رہے ہیں' جنہیں اصرار ہے کہ جو وحی لکھی گئی ہو' ہم صرف اسی کو مانیں گے۔

۵۳۔ وحی بلا الفاظ کی حقیقت و نوعیت

اعتراض: آپ نے آگے چل کر لکھا ہے کہ "وحی لازماً الفاظ کی صورت میں ہی نہیں ہوتی' وہ ایک خیال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جو دل میں ڈال دیا جائے"۔ اس کا دعویٰ تو ہمہ دانی کا ہے اور معلوم اتنا بھی نہیں کہ یہ بات ممکنات میں سے نہیں کہ کسی شخص کے دل میں ایک خیال آئے اور اس کے لیے الفاظ نہ ہوں۔ نہ کوئی خیال الفاظ کے بغیر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی لفظ بلا خیال کے وجود میں آ سکتا ہے۔ ارباب علم سے پوچھیے کہ "وحی بلا الفاظ" کی "مہمل ترکیب" کا مطلب کیا ہے؟"

جواب: منکرین حدیث کو یہ معلوم نہیں ہے کہ خیال اور جامہ الفاظ دونوں اپنی حقیقت میں بھی مختلف ہیں اور ان کا وقوع بھی ایک ساتھ نہیں ہوتا' چاہے انسانی ذہن کسی خیال کو جامہ الفاظ پہنانے میں ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ ہی وقت لے' لیکن بہرحال خیال کے ذہن میں آنے اور ذہن کے اس کو جامہ الفاظ پہنانے میں ترتیب زمانی ضرور ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ انسان کے ذہن میں خیال لازماً لفظ ہی کے ساتھ آتا ہے تو وہ اس کی کیا توجیہ کرے گا کہ ایک ہی خیال انگریز کے ذہن میں انگریزی' عرب کے ذہن میں عربی اور ہمارے ذہن میں اردو الفاظ کے ساتھ کیوں آتا ہے؟ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ انسانی ذہن میں پہلے ایک خیال اپنی مجرد صورت میں آتا ہے' پھر ذہن اس کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتا ہے۔ یہ عمل عام طور پر تو بہت تیزی کے ساتھ ہوتا ہے' لیکن جن لوگوں کو سوچ کر بولنے یا لکھنے کا کبھی موقع ملا ہے' وہ جانتے ہیں کہ بسااوقات ذہن میں ایک

تخیل گھوم رہا ہوتا ہے اور ذہن کو اس کے لیے جامہ الفاظ تلاش کرنے میں خاصی کاوش کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے یہ بات صرف ایک اناڑی ہی کہہ سکتا ہے کہ خیال الفاظ ہی کی صورت میں آتا ہے یا خیال اور الفاظ لازماً ایک ساتھ آتے ہیں۔ وحی کی بہت سی صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجرد ایک خیال نبی کے دل میں ڈالا جاتا ہے اور نبی خود اس کو اپنے الفاظ کا جامہ پہناتا ہے اس طرح کی وحی کے غیر متلو ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں نہ تو الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القا ہوتے ہیں اور نہ نبی اس بات پر مامور ہوتا ہے کہ خاص الفاظ میں اسے لوگوں تک پہنچائے۔

۵۴۔ وحی متلو اور غیر متلو کا فرق

اعتراض: آپ کہتے ہیں کہ "عربی زبان میں وحی کے معنی اشارۂ لطیف کے ہیں"۔ "سوال وحی" کے لغوی معنی کے متعلق نہیں' سوال اس اصطلاحی "وحی" کے متعلق ہے جو اللہ کی طرف سے حضرات انبیائے کرام کو ملتی تھی۔ کیا اس وحی کے محض "لطیف اشارات" خدا کی طرف سے ہوتے تھے یا الفاظ بھی منزل من اللہ ہوتے تھے؟ اگر محض لطیف اشارات ہی ہوتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے الفاظ حضورؐ کے اپنے تھے"۔

جواب: اس کا جواب اس کتاب کے صفحہ ۲۰۸ کی اس عبارت میں موجود ہے جس کے ایک دو فقرے لے کر ڈاکٹر صاحب یہ بحث فرما رہے ہیں۔ قرآن کریم میں معنی اور لفظ دونوں اللہ تعالیٰ کے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کو اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ آپ اسے انہی الفاظ میں لوگوں تک پہنچائیں۔ اسی لیے اس کو وحی متلو کہا جاتا ہے۔ وحی کی دوسری قسم یعنی غیر متلو اپنی نوعیت و کیفیت اور مقصد میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے آتی تھی اور لوگوں تک وہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں نہیں بلکہ حضورؐ کے ارشادات'

فیصلوں اور کاموں کی صورت میں پہنچتی تھی۔ اگر ایک شخص یہ تسلیم کرتا ہو کہ نبی کے پاس پہلی قسم کی وحی آسکتی ہے؟ اگر قرآن کا معجزانہ کلام ہمیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ یہ اللہ ہی کا کلام ہو سکتا ہے تو کیا رسول پاکؐ کی معجزانہ زندگی اور آپؐ کے معجزانہ کارنامے ہمیں یہ یقین نہیں دلاتے کہ یہ بھی خدا ہی کی رہنمائی کا نتیجہ ہیں؟

۵۵۔ سنت ثابتہ سے انکار اطاعت رسولؐ سے انکار ہے

اعتراض: "احادیث کے موجودہ مجموعوں میں سے جن سنتوں کی شہادت ملتی ہے' ان کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے سنت ہونے پر امت شروع سے آج تک متفق رہی ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ متواتر سنتیں ہیں۔ اور امت کا ان پر اجماع ہے۔ ان میں سے کسی کو ماننے سے جو شخص بھی انکار کرے گا وہ اسی طرح دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا جس طرح قرآن کی کسی آیت کا انکار کرنے والا خارج از اسلام ہو گا۔

دوسری قسم کی سنتیں وہ ہیں جن کے ثبوت میں اختلاف ہے یا ہو سکتا ہے اس قسم کی سنتوں میں سے کسی کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری تحقیق کے مطابق فلاں سنت ثابت نہیں ہے' اس لیے میں اسے قبول نہیں کرتا تو اس قول سے اس کے ایمان پر قطعاً کوئی آنچ نہ آئے گی۔

کیا آپ بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کس مقام پر یہ کہا ہے کہ جو شخص ان متواتر سنتوں کے ماننے سے انکار کرے گا جن پر امت کا اجماع ہے' وہ کافر ہو جائے گا اور جو ایسی سنتوں سے انکار کرے گا جن میں اختلاف ہے' اس کے ایمان پر حرف نہیں آئے گا؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اطاعت کو مدار کفر و اسلام قرار دیا ہے لہٰذا جہاں یقینی طور پر معلوم ہو کہ حضورؐ نے فلاں چیز کا حکم

دیا ہے یا فلاں چیز سے روکا ہے یا فلاں معاملہ میں یہ ہدایت دی ہے وہاں تو اتباع و اطاعت سے انکار لازماً موجب کفر ہو گا لیکن جہاں حضورؐ سے کسی حکم کا یقینی ثبوت نہ ملتا ہو' وہاں کم تر درجے کی شہادتوں کو قبول کرنے یا نہ کرنے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی شہادت کو کمزور پا کر یہ کہتا ہے کہ اس حکم کا ثبوت حضورؐ سے نہیں ملتا اس لیے میں اس کی پیروی نہیں کرتا تو اس کی یہ رائے بجائے خود غلط ہو یا صحیح' بہرحال یہ موجب کفر نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ حکم حضورؐ ہی کا ہو' تب بھی میرے لیے سند و حجت نہیں۔ اس کے کافر ہونے میں قطعاً شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک سیدھی اور صاف بات ہے جسے سمجھنے میں کسی معقول آدمی کو الجھن پیش نہیں آ سکتی۔

عدالت عالیہ مغربی پاکستان کا ایک اہم فیصلہ

(ترجمہ از ملک غلام علی صاحب)

(جناب جسٹس محمد شفیع صاحب' جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جس فیصلے کے بیشتر حصے کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے' یہ دراصل ایک اپیل کا فیصلہ ہے جس میں اصل مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ ایک بیوہ اپنی نابالغ اولاد کی موجودگی میں اگر ایسے مرد سے نکاح ثانی کر لے جو اولاد کے لیے غیر محرم ہو' تو ایسی صورت میں آیا اس بیوہ کے لیے اس اولاد کی حضانت کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟ اس امر متنازعہ فیہ کا فیصلہ کرتے ہوئے فاضل جج نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان اصولی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے کہ اسلام میں قانون کا تصور' اور قانون سازی کا طریق کیا ہے' قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی مسلمانوں کے لیے ماخذ قانون تسلیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں' اور بالخصوص پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت کہاں تک فقہ حنفی کے قواعد و ضوابط کی پابند سمجھی جا سکتی ہے؟ اس لحاظ سے یہ فیصلہ اسلامی قانون کے اساسی اور اہم ترین مسائل کو اپنے دائرۂ بحث میں لے آیا ہے۔

اس فیصلے کے جو حصے اصل مقدمے سے متعلق ہیں ان کو چھوڑ کر صرف اس کے اصولی مباحث کا ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ بعض مقامات پر فیصلے میں جو قرآنی آیات نقل کی گئی ہیں انھیں معہ ترجمہ درج کرنے کے بجائے صرف سورۃ اور آیات کا نمبر دے دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ پی۔ ایل۔ڈی ۱۹۶۰ء لاہور (صفحہ ۱۱۴۲ تا ۱۱۷۹) کے مطبوعہ متن کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ اصل اور مکمل فیصلہ وہیں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ (غلام علی)

۴۔ بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ولی کا تقرر ضروری تھا اور گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کی دفعہ نمبر ۱۷ کا اطلاق اس مقدمے پر ہوتا تھا' تب ایک بڑا فیصلہ طلب سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ قانون کیا ہے جس کا ایک نابالغ پابند ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ نابالغان اور ان کے والدین مسلمان ہیں اور مسلم لا کے تابع ہیں۔ لیکن اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے کہ ولایت نابالغ کے معاملے میں وہ کون سا قانون ہے جس کی پابندی لازم ہے۔ تقریباً تمام کی تمام کتابیں' جن میں سے بعض انتہائی مشہور و معروف اور قابل احترام قانون دانوں اور ججوں کی تصانیف ہیں۔ ایسے قواعد و ضوابط پر مشتمل ہیں' جن کی پابندی نابالغان کی ذات اور جائداد کی ولایت کے معاملے میں' ایک عرصہ دراز سے ہندو پاکستان میں کی جا رہی ہے۔ درحقیقت ہندوستان کی جملہ عدالتیں بشمول سپریم کورٹ' برطانوی عہد قبل تقسیم سے لے کر اب تک ان قواعد کی سختی سے پابندی کرتی رہی ہیں۔ اس امر کا امکان موجود ہے کہ برطانوی حکومت سے پہلے کے قاضی اور ماہرین قانون بھی ان قواعد و ضوابط کی پیروی کرتے رہے ہوں اور بعد میں بھی ان کی پابندی کی جاتی رہی ہو' کیونکہ مسلمان قانون دان یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز یا دوسرے غیر مسلم اپنے مقصد کے مطابق قرآن پاک کی تفسیر و تعبیر کریں اور قوانین بنائیں۔ فتاویٰ عالمگیری کو مسلم قانون سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات میں جو

اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس حقیقت کی صاف نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن اب حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ یہ قواعد و ضوابط مختصراً درج ذیل ہیں:

(اس کے بعد پیراگراف ۴ کے بقیہ حصے اور پیراگراف ۵ و ۶ میں فاضل جج نے مسئلہ حضانت کے بارے میں حنفی' شافعی اور شیعہ فقہ کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں)

۷۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں' اصل تصفیہ طلب سوال یہ ہے کہ کیا کسی درجے کی قطعیت کے ساتھ ان قواعد کو اسلامی قانون کہا جا سکتا ہے۔ جسے وہی لزوم کا مرتبہ حاصل ہو جو ایک کتاب آئین میں درج شدہ قانون کو حاصل ہوتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آیا یہ وہی قانون ہے جس کی پابندی گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کی دفعہ نمبر ۱۷ کے منشاء کے مطابق ایک مسلم نابالغ پر واجب ہے؟

۸۔ مسلمان کے عقیدے کی رو سے' قطع نظر اس کے کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے' جو قانون اس کی زندگی کے ہر شعبے میں حکمراں ہونا چاہیے' خواہ وہ اس کی زندگی کا مذہبی شعبہ ہو یا سیاسی' یا معاشرتی یا معاشی' وہ صرف خدا کا قانون ہے۔ اللہ ہی حاکم اعلیٰ ہے' علیم و حکیم ہے اور قادر مطلق ہے۔ اسلام میں خدا اور بندے کے مابین تعلق سادہ اور بلاواسطہ ہے۔ کوئی پیشوا' امام' پیر یا کوئی دوسرا شخص (خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ' قبر میں ہو یا قبر سے باہر ہو) اس تعلق کے مابین وسیلہ بن کر حائل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں پیشہ ورانہ پیشواؤں کا کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جو اپنی لعنت کی دھمکی دے کر اور خدا کے غضب کا اجارہ دار بن کر' اپنے مزعومات کو تحکمانہ انداز میں ہم پر ٹھونسے۔ قرآن نے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں' ان کے اندر مسلمانوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ اسلام میں ذہنی اور روحانی حریت کی فضا موجود ہے۔ چونکہ قانون انسانی آزادی پر پابندیاں عائد کرنے والی طاقت ہے اس لیے خدا نے قانون سازی کے اختیارات پوری طرح

اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ اسلام میں کسی شخص کو اس طرح کام کرنے کا اختیار نہیں ہے گویا کہ وہ دوسروں سے بالاتر ہے۔ قرآن انفرادیت پسندی کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اسلام نے عالمگیر اخوت اور کامل مساوات کا سبق دے کر اپنے اخلاقی نظام کے اندر انسان پر سے انسان کے تفوق اور برتری کو بالکلیہ ختم کر دیا ہے' خواہ وہ برتری علمی دائرے میں ہو یا زندگی کے دوسرے دوائر میں۔ دنیا بھر کے مسلمان نہیں تو کم از کم ایک ملک کے مسلمانوں کا ایک ہی لڑی میں پرویا جانا ضروری ہے۔ اسلامی ریاست میں ایسے شخص کا وجود ناممکن ہے جو مطلق العنانی اور شاہنشاہانہ اختیارات کا مدعی ہو' ایک اسلامی ریاست کے صدر کا کام بھی صحیح معنوں میں یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام و فرامین پر عمل درآمد کرے۔ قرآن بلکہ اسلام اس تصور سے قطعاً ناآشنا ہے کہ ایک آدمی تمام مسلمانوں کے لیے قانون وضع کرے۔ قرآن مجید بتکرار اور باصرار اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ اور صرف اللہ ہی دنیا و آخرت کا بادشاہ ہے اور اس کے احکام آخری اور قطعی ہیں۔ سورۃ ۶: آیت ۵۷' سورۃ ۱۲: آیت ۴۰ و ۶۷ میں فرمایا گیا ہے کہ حکمران صرف اللہ ہے۔ اسی طرح سورہ ۴۰: آیت ۱۲ میں فرمایا گیا ہے:

فالحکم للہ العلی الکبیر

پس فیصلہ اللہ کے لیے ہے جو برتر اور بزرگ ہے۔

یہ بات سورۃ ۵۹: ۲۳۔ ۲۴ سے بھی واضح ہے کہ حاکم اعلیٰ اللہ کی ذات ہے۔

هو الذی لا اله الا هو الملک القدوس السلام المومن المهیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان الله عما یشرکون هو الله الخالق الباری المصور له الاسماء الحسنیٰ یسبح له ما فی السموات والارض وهو العزیز الحکیم

وہی اللہ ہے کہ نہیں کوئی الٰہ سوا اس کے' پادشاہ ہے' پاک ہے' سلامتی والا ہے' امن دینے والا ہے' نگہبان ہے' زبردست ہے' غالب ہے اور

بڑائی والا ہے۔ پاک ہے اس سے جسے وہ شریک کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہے' خالق ہے' بنانے والا ہے' صورت گری کرتا ہے' اس کے لیے ہیں بہت اچھے نام۔ پاکیزگی بیان کرتی ہے اس کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہ زبردست دانا ہے۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے چاروں خلفاء کا عمل اس بات کی واضح شہادت فراہم کرتا ہے کہ بادشاہت اسلام کے قطعاً منافی ہے' ورنہ ان کے لیے اس سے آسان تر بات کوئی نہیں تھی کہ وہ مسلمان قوم کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیتے۔ اگر وہ ایسا کر دیتے تو ان کے دعوے کو فوراً تسلیم کر لیا جاتا' کیونکہ ان کی صلاحیت' دیانت اور استقامت شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ یہ بات بھی پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ نہ یہ یقین رکھتے تھے اور نہ اس کا اعلان ہی کرتے تھے کہ وہ اسلامی دنیا کے خود مختار اور مطلق العنان فرمانروا ہیں۔ وہ جو کام بھی کرتے تھے' دوسرے مسلمانوں کے باہمی مشورے سے کرتے تھے۔ تمام مسلمان ایک ہی برادری میں شریک تھے جو ان کے یا دوسرے لفظوں میں اسلامی عقیدے کا لازمی تقاضا تھا۔ اس عقیدے کا عین مزاج یہ تھا کہ انسان پر سے انسان کی فوقیت کا خاتمہ ہو گیا اور اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل کے لیے دروازہ کھل گیا۔ نہ کوئی حاکم تھا' نہ کوئی محکوم' نہ کوئی پروہت تھا نہ کوئی پیر۔ ہر شخص امام بن سکتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے ان لوگوں کی پیروی کرنی پڑتی تھی جو تقویٰ یا کسی دوسرے لحاظ سے اس پر فائق تھے۔ امیر معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اخوت اسلام پر ایک کاری ضرب لگائی اور اپنے لڑکے کو ریاست کا جانشین نامزد کر کے پوری قوم کو اپنے خاندان کے عوض میں گرو کر دیا۔ ہمارے جمہوریت پسند رسول کی وفات کے جلد ہی بعد اسلام کی لائی ہوئی جمہوریت کو امپیریلزم میں تبدیل کر دیا گیا۔ معاویہ نے نسلی خلافت کا آغاز کر کے اسلام کی جڑ پر تیشہ رکھ دیا۔ محمد رسول اللہ اگرچہ اپنے بعض قرابت داروں سے بڑی محبت رکھتے تھے' لیکن انہوں نے ان میں سے کسی کو بھی

اپنے بعد امت مسلمہ کا سربراہ مقرر نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ کی روش نمایاں طور پر جمہوری رہی۔ معاویہ کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے نے ان کے حسب منشاء خلافت پر غاصبانہ قبضہ جمالیا اور خود نبی کے نواسے نے یزید کی اس خلاف ورزی قرآن کا سدباب کرنے کے لیے اپنی اور اپنے عزیزوں کی جانوں کو قربان کر دیا۔ یہ بنو امیہ کا پراپیگنڈہ تھا کہ امام حسینؓ نے اپنی جان اس لیے دی تاکہ وہ خلافت کے حق کو اہل بیت کے لیے محفوظ کر سکیں۔ یہ پراپیگنڈہ بالکل جھوٹا تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ شیعہ حضرات بھی اسی پراپیگنڈے کا ارتکاب کیے جا رہے ہیں۔ بدقسمتی سے امام حسینؓ کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہت اور استبداد مسلمانوں کے اندر ایک مسلم قاعدے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لیے اپنے امیر کے انتخاب میں کوئی اختیار باقی نہ رہا اور اپنے معاملات کے کنٹرول میں ان کا کوئی دخل نہ رہا۔ معاویہ نے جس کام کا آغاز کیا اس کا شاید کوئی فوری خراب نتیجہ برآمد نہ ہوا' لیکن آخرکار اس نے مسلم سوسائٹی کے صحت مندانہ ارتقا اور نشوونما کو ناگزیر طور پر متاثر کیا اور آج اقوام عالم کی برادری میں اس کی حیثیت ثانوی بن کر رہ گئی ہے۔

۱۰۔ قرآن مجید کی رو سے مسلمانوں کا امیر صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو علمی اور جسمانی حیثیت سے اس منصب کے لیے موزوں ہو۔ اس سے صاف طور پر امارت کی نسلی بنیاد کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس معاملے میں مندرجہ ذیل آیات کا نقل کرنا مفید ہو گا۔

وقال لهم نبيهم ان الله قد بعث لكم طالوت ملكاً قالوا انى يكون له الملک علينا ونحن احق بالملک منه ولم يوت سعة من المال قال ان الله اصطفه عليكم وزاده بسطة فى العلم والجسم والله يوتى ملكه من يشآء والله واسع عليم

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر

کیا ہے۔ وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا۔ حالانکہ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے"۔ نبی نے کہا "اللہ نے تمہارے مقابلے میں اس کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے۔ اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے"۔

۱۱۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اسلامی قانون کے ٹھیک ٹھیک مطابق قانون سازی اللہ اور صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ آدم سے لے کر اب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین اپنے انبیاء اور رسولوں کے ذریعے سے نافذ فرمائے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اللہ کی حکمت بالغہ اس امر کی متقضی ہوئی کہ لوگوں کو آخری شریعت عطا کی جائے۔ یہ قانون شریعت انسانوں کی طرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کی شکل میں نازل ہوا۔ یہ وحی لکھ لی گئی یا زبانی یاد کر لی گئی اور بعد میں اسے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا گیا جو قرآن مجید کے نام سے معروف ہے۔ اس کے بعد نسل انسانی کے تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کو معاملات کا تصفیہ ان احکام کی روشنی میں کیا جاتا تھا، جو اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمائے۔ یہی احکام بتاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے، کیا پسندیدہ ہے اور کیا غیر پسندیدہ ہے، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، کیا مستحب ہے اور کیا مکروہ ہے۔ غرض قرآن مجید مسلم معاشرے کی ایک لازمی بنیاد ہے۔ یہ وہ مرکز و محور ہے جس کے گرد پورا اسلامی قانون گردش کرتا ہے۔

۱۱ (الف) یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسانون پر مشتمل سوسائٹی ایک نہایت پیچیدہ شے ہے۔ اگرچہ فطرت ابدی و ازلی ارادے کے اظہار کا نام ہے اور یہ ایک ابدی قانون کے تابع ہے لیکن انسانی احوال و کوائف ہر زمانے اور ہر مقام کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ شخصیات اور مادی حالات کا اجتماع مستقبل کے واقعات کے

لیے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔ انسان کے ہزار گونہ معاملات ہیں جن میں ہزار گونہ حالات و کوائف سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ ہر بچہ جو دنیا میں آئے' اپنے ساتھ خیالات کی ایک نئی دنیا لائے۔ ہر طلوع ہونے والا دن نئے اور غیر متوقع تغیرات کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں چونکہ انسانی حالات اور مسائل بدلتے رہتے ہیں' اس لیے اس بدلتی ہوئی دنیا کے اندر مستقل' ناقابل تغیر و تبدل احکام و قوانین نہیں چل سکتے۔ قرآن مجید بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے مختلف معاملات میں چند وسیع اور عام قاعدے انسانی ہدایت کے لیے دے دیئے ہیں۔ یہ ہمیں بجرو قواعد کا ایک کامل ترین نظام اور خیرو صلاح پر مبنی ایک ضابطہ اخلاق دیتا ہے۔ بعض خاص معاملات (مثلاً وراثت) میں یہ زیادہ واضح اور مفصل ہے۔ بعض امور ایسے ہیں جن کا ذکر تمثیل و تلمیح کے انداز میں کیا گیا ہے۔ بعض معاملات ایسے ہیں جن میں قرآن نے مکمل سکوت اختیار کیا ہے تاکہ ان معاملات میں انسان اپنا طرز عمل زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق متعین کرے۔ قرآن مجید میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ نہایت سادہ زبان میں نازل کیا گیا ہے تاکہ ہر ایک اسے سمجھ سکے۔ بعض آیات جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے ان کا یہاں نقل کر دینا مفید ثابت ہو گا۔

(اس کے بعد فاضل جج نے سورہ ۲: آیت ۲۴۲' سورہ ۶: آیت ۹۹' سورہ ۶: آیت ۱۰۶' سورہ ۹: ۱۲۷' سورہ ۱۱: آیت ۱' سورہ ۱۲: آیت ۲' سورہ ۱۵: آیت ۱' سورہ ۱۷: آیت ۸۹' سورہ ۱۷: آیت ۱۰۶' سورہ ۳۹: آیت ۲۸' سورہ ۵۴: آیت ۱۷' سورہ ۵۷: آیت ۲۵' سورہ ۳: آیت ۵۸' سورہ ۴۱: ۴۴ نقل کی ہیں' اور ان کا ترجمہ بھی ساتھ دیا ہے)۔

پس یہ امر بالکل واضح ہے کہ قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا ایک دو آدمیوں کا مخصوص حق نہیں ہے۔ قرآن سادہ اور آسان زبان میں ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے' تاکہ تمام مسلمان اگر چاہیں تو اسے سمجھ سکیں اور اس کے مطابق عمل کر سکیں

یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر مسلمان کو دیا گیا ہے اور کوئی شخص' خواہ وہ کتنا ہی فاضل یا عالی مقام کیوں نہ ہو' وہ مسلمان سے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا حق نہیں چھین سکتا۔ قرآن مجید کو سمجھتے ہوئے ایک آدمی پرانے زمانے کے لائق مفسرین کی تفاسیر سے قیمتی امداد حاصل کر سکتا ہے لیکن اس معاملے کو بس یہیں تک رہنا چاہیے۔ ان تفسیروں کو اپنے موضوع پر حرف آخر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ قرآن مجید کا پڑھنا اور سمجھنا خود اس امر کو متضمن ہے کہ آدمی اس کی تعبیر کرے اور اس کی تعبیر کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی اس کو وقت کے حالات پر اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضرورت پر منطبق کرے۔ اس مقدس کتاب کی جو تعبیریں قدیم مفسرین' مثلاً امام ابو حنیفہ' امام مالک اور امام شافعی وغیرہ نے کی ہیں۔ جن کا تمام مسلمان اور میں خود بھی انتہائی احترام کرتا ہوں' وہ آج کے زمانے میں جوں کی توں نہیں مانی جا سکتیں۔ ان کی تعبیرات کو درحقیقت دوسرے بہت سے فضلاء نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے جن میں ان کے اپنے شاگرد بھی شامل ہیں۔ قرآن مجید کے مختلف ارشادات کا جو غائر مطالعہ ان حضرات نے کیا تھا' وہ ہم پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ ان گردوپیش کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے ہیں جو اس زمانے میں ماحول پر طاری تھے۔ وہ ان مسائل کے بارے میں ایک خاص نتیجے تک پہنچے ہیں جو ان کے اپنے ملک یا زمانے میں درپیش تھے۔ آج نے بارہ یا تیرہ سو برس پہلے کے مفسرین کے اقوال کو حرف آخر مان لیا جائے تو اسلامی سوسائٹی ایک آہنی قفس میں بند ہو کر رہ جائے گی اور زمانے کے ساتھ ساتھ نشوونما کا اسے موقع نہیں ملے گا۔ یہ پھر ایک ابدی اور عالمگیر دین نہیں رہے گا بلکہ جس زمان و مکان میں اس کا نزول ہوا تھا' یہ اسی تک محدود رہے گا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے' اگر قرآن کوئی لگے بندھے ضوابط مقرر نہیں کرتا تو امام ابو حنیفہ وغیرہ کی تشریحات کو بھی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ بالواسطہ اسی نتیجے کا باعث بنیں۔ بدقسمتی سے حالات جدیدہ کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر کا دروازہ چند صدیوں سے بالکل بند کر دیا گیا ہے جس

کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان ذہنی جمود' تہذیبی انحطاط' سیاسی پژمردگی اور معاشی زوال کا شکار ہو چکے ہیں۔ سائنٹیفک ریسرچ اور ترقی جو ایک زمانے میں مسلمانوں کا اجارہ تھی وہ دوسروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان ہمیشہ کی نیند سو گئے ہیں۔ اس صورت حال کا خاتمہ لازمی ہے مسلمانوں کو بیدار ہو کر زمانے کے ساتھ چلنا ہو گا۔ اجتماعی' معاشی اور سیاسی حیثیت سے جو بے حسی اور بے عملی مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے اس سے نجات حاصل کرنی پڑے گی۔ قرآن مجید کے عام اصولوں کو سوسائٹی کے بدلتے ہوئے تقاضوں پر منطبق کرنے کے لیے ان کی ایسی معقول اور دانشمندانہ تعبیر کرنی ہو گی کہ لوگ اپنی تقدیر اور اپنے خیالات اور اخلاقی تصورات کی تشکیل اس کے مطابق کر سکیں اور اپنے ملک اور زمانے کے لیے موزوں طریقے پر کام کر سکیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح مسلمان بھی عقل اور ذہانت رکھتے ہیں اور یہ طاقت استعمال کرنے ہی کے لیے دی گئی ہے' بیکار ضائع ہونے کے لیے نہیں ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں عوام کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اس بات پر غور و خوض اور تحقیق کریں کہ نصوص قرآنی کا مدعا اور مفہوم عنداللہ کیا ہے اور اسے اپنے مخصوص احوال پر کس طرح چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ پس تمام مسلمانوں کو قرآن پڑھنا' سمجھنا اور اس کی تعبیر کرنا ہو گا۔

ومنهم من يستمع اليک حتیٰ اذا خرجوا من عندک قالوا للذين اوتوا العلم ماذا قال انفا اولئک الذين طبع الله علیٰ قلوبهم واتبعوا اهواءهم

(اور ان میں سے وہ ہیں جو تمہاری بات بہ تکلف سنتے ہیں' یہاں تک کہ جب وہ تمہارے پاس سے نکل جاتے ہیں تو وہ ان لوگوں سے جنہیں علم دیا گیا ہے' کہتے ہیں "کیا کہا ہے اس نے ابھی؟" یہی لوگ ہیں جن کے دل پر اللہ نے ٹھپا لگا دیا ہے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے)۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین

(وہی ہے جس نے پیدا کیا امیوں میں ایک رسول ان میں سے جو تلاوت کرتا ہے اور ان پر اس کی آیات اور انھیں پاک کرتا ہے اور سکھاتا ہے انھیں کتاب اور حکمت' حالانکہ وہ پہلے یقیناً کھلی ہوئی گمراہی میں تھے)۔

لوگوں پر لازم ہے کہ وہ قرآن میں تدبر کریں اور اپنے دلوں پر قفل نہ لگا دیں۔

کتاب انزلنه الیک مبرک لیدبروا ایته ولیتذکر اولوا الالباب

(یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے' برکت والی ہے' تاکہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقلمند نصیحت حاصل کریں)

لوگوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن میں غور و فکر کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں جس طرح دنیا میں دیگر مقاصد کے حصول کی خاطر سخت جدوجہد کی ضرورت ہے' اسی طرح قرآن کو سمجھنے اور اس کے مدعا کو پانے کی سخت کوشش ہی کا نام اجتہاد ہے۔

ومن جاهد فانما یجاهد لنفسه ان الله لغنی عن العلمین

(جو کوئی سخت جدوجہد کرتا ہے' وہ اپنی جان کے لیے جدوجہد کرتا ہے' یقیناً اللہ بے نیاز ہے جہان والوں سے)۔

دوبارہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ قرآن مجید کا مکمل اور صحیح علم حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

حتی اذا جاءو قال اکذبتم بایتی ولم تحیطوا بها علما ماذا کنتم تعملون

(یہاں تک کہ جب وہ آ جائیں گے وہ کہے گا: کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا' حالانکہ تم نے علم سے ان کا احاطہ نہیں کیا' یا تم کیا کر رہے تھے؟)

وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ھو اجتبکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملة ابیکم ابراھیم ھو سمکم المسلمین من قبل وفی ھذا لیکون الرسول شھیدا علیکم وتکونوا شھدآء علی الناس فاقیموا الصلوة واتوا الزکوة واعتصموا باللہ ھو مولکم فنعم المولی ونعم النصیر

(اور سخت کوشش کرو اللہ (کی راہ) میں جیسا کہ اس کے لیے کوشش کا ہے۔ اس نے تمہیں چنا ہے اور نہیں بنائی تم پر دین کے معاملے میں تنگی' طریقہ تمہارے باپ ابراہیم کا' اس نے نام رکھا تمہارا مسلمین پہلے اور اس میں' تاکہ رسول تم پر گواہ بنے اور تم لوگوں پر گواہ بنو' پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو وہ تمہارا حامی و نگہبان ہے پس کیا ہی اچھا حامی اور کیا ہی اچھا مددگار ہے)۔

فتعالی اللہ الملک الحق ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیک وحیہ وقل رب زدنی علما (پس بہت بلند و برتر ہے اللہ' بادشاہ حقیقی اور نہ جلدی کرو قرآن کے ساتھ اس کے کہ پوری ہو جائے تمہاری طرف وحی اس کی اور کہو اے رب میرے' بڑھا مجھے علم میں)

یہ تمام آیات اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ تمام مسلمانوں سے' نہ کہ ان کے کسی خاص طبقے سے' یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ قرآن کا علم حاصل کریں' اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس کی تعبیر کریں۔ تشریح و تعبیر کے لیے چند مسلم اصولوں کی پابندی لازم ہے۔ ان اصولوں میں سے چند ایک یہ ہو سکتے ہیں:

(۱) قرآن مجید کے بعض احکام اہم اور بنیادی ہیں۔ ان کی خلاف ورزی ہرگز نہیں ہونی چاہئے بلکہ ان پر جوں کا توں عمل کرنا چاہئے۔

(۲) کچھ اور آیات ایسی ہیں جن کی نوعیت ہدایات کی ہے اور جن کی پیروی کرنا کم و بیش ضروری ہے۔

(۳) جہاں الفاظ بالکل سادہ اور واضح ہوں، جو متعین اور غیر مبہم مفہوم پر دلالت کرتے ہوں، وہاں الفاظ کے وہی معانی مراد لینے چاہئیں جو لغت اور گرامر کی رو سے صحیح اور متبادر ہوں۔ دوسرے لفظوں میں اس مقدس کتاب کے الفاظ کے ساتھ کسی طرح کی کھینچ تان روا نہیں ہے۔

(۴) اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہئے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ بے معنی، متناقض یا زائد ضرورت نہیں ہے۔

(۵) سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی معنی نہیں نکالنے چاہئیں۔

(۶) شان نزول کے مطابق یعنی نزول قرآن کے وقت جو حالات درپیش تھے، ان کے پس منظر میں رکھ کر قرآن کے معانی کی تشریح کرنا خطرناک ہے۔

(۷) قرآن کی تعبیر معقول (Rational) ہونی چاہئے۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ اسے گردوپیش کے احوال سے متاثر ہونے والے انسانی رویے سے مطابق ہونا چاہئے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ نئے اور غیر متوقع حالات ہمیشہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ سوسائٹی کی ضروریات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اور تشریح ان حالات و مقتضیات کی روشنی میں کی جانی ضروری ہے۔

(۱۱) زمان و مکان کے اختلاف کی بنا پر جو مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں، ان میں مشابہت و عدم مشابہت کا باہمی موازنہ ہونا چاہئے۔ تقابل کرتے ہوئے ہمیں حالات و درجات کی رعایت کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور بعید و قریب کے حقائق کو جانچتے ہوئے ماضی سے حال کی جانب اس طرح پیش قدمی کرنی چاہئے کہ مفروضات و قیاسات اور غیر مطلق اور قابل ترک اعتقادات سب ہماری نگاہ کے سامنے رہیں۔

(۱۲) بدقسمتی سے اس دنیا میں کم از کم خلافت راشدہ کے بعد، کوئی ایسی صحیح اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی جس میں لوگوں نے پورے شعور و ارادہ اور باہمی تعاون کے ساتھ قرآن مجید کی تعبیر کا کام کیا ہو۔ قرآن مجید کے مقرر کردہ اصول ابدی ہیں لیکن ان کا انطباق ابدی نہیں ہے کیونکہ انطباق ایسے حقائق و

مقاصد کا مرہون منت ہے جو مسلسل تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اب اگر قرآن مجید کی ایک خاص نص کی ایک سے زائد تعبیرات ممکن ہوں اور ہر مسلمان کو اس بات کا حق دے دیا جائے کہ وہ اپنے فہم و ذوق کے مطابق تشریح کر دے' تو اس کے نتیجے میں بے شمار تعبیرات وجود میں آ کر ایک بد نظمی کا موجب بن جائیں گی۔ اسی طرح جن معاملات میں قرآن مجید ساکت ہے۔ ان میں بھی اگر ہر شخص کو اس کے نقطہ نظر کے موافق ایک ضابطہ بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو ایک پراگندہ اور غیر مربوط سوسائٹی پیدا ہو جائے گی۔ ہر دوسری سوسائٹی کی طرح اسلامی سوسائٹی بھی کم سے کم زحمت دہی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ افراد کو زیادہ سے زیادہ راحت و مسرت پیش کرتی ہے۔ اس لیے غلبہ اکثریت ہی کی رائے کو حاصل ہو گا۔

(۱۳) ایک آدمی یا چند آدمی فطرتاً عقل اور قوت میں ناقص ہوتے ہیں کوئی شخص خواہ کتنا ہی طاقتور اور ذہین ہو' اس کے کامل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک اعلیٰ درجے کا حساس اور صاحب نظر انسان بھی اپنے مشاہدے میں آنے والے جملہ امور کی اہمیت کا کماحقہ اندازہ نہیں کر سکتا۔ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اجتماعی زندگی ایک نظم کے ساتھ بسر کر رہے ہیں' اپنی اجتماعی حیثیت میں افراد کی بہ نسبت زیادہ عقل اور طاقت رکھتے ہیں۔ ان کی قوت مشاہدہ اور قوت متخیلہ مقابلتاً بہتر اور برتر ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی رو سے بھی کتاب اللہ کی تعبیر اور حالات پر اس کے عام اصولوں کا انطباق ایک آدمی یا چند آدمیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بلکہ یہ کام مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے۔

والذین استجابوا لربهم واقاموا الصلوٰة وامرهم شورٰی بینهم ومما رزقنهم ینفقون

(وہ جنہوں نے اپنے رب کے بلاوے کا جواب دیا اور نماز قائم کی اور ان کا کام باہمی مشورے سے ہوتا ہے اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں وہ خرچ کرتے ہیں)۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ وکنتم علی شفا حفرۃ من النار فانقذکم منہا کذالک یبین اللہ لکم ایتہ لعلکم تہتدون (اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھامو سب' اور تفرقہ مت پیدا کرو اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہوئی جب تھے تم دشمن' پس اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور ہو گئے تم اس کے فضل سے بھائی بھائی۔ اور تھے تم آگ کے گڑھے کے کنارے پس بچایا۔ اس نے تم کو اس سے' اس طرح واضح کرتا ہے اللہ تمہارے لیے اپنی آیات' شاید کہ تم ہدایت پاؤ)۔

اور بہت سی آیات میں بھی مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قرآن مجید کو سمجھنے کی اور اس کی آیات پر غور و فکر کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کام انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر سرانجام دیا جانا چاہیے۔

(۱۴) اس سیاق و سباق کے اندر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ "قانون" کے لفظ کے معنی کیا ہیں؟ میری رائے میں قانون سے مراد وہ ضابطہ ہے جس کے متعلق لوگوں کی اکثریت یہ خیال کرتی ہو کہ ان کے معاملات اس کے مطابق ہونے چاہئیں۔

(۱۵) ابتدا میں نسل انسانی کی تعداد بہت قلیل اور منتشر تھی اور ان میں سے ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتا تھا۔ بعد میں جب انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور انہیں گروہوں کی شکل میں بسنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس وقت ان کے لیے ایک مشترک ضابطہ اخلاق کی حاجت بھی رونما ہوئی۔ مثال کے طور پر پچاس آدمیوں کی ایک جماعت میں قتل کا ارتکاب کیا گیا۔ اکثریت کے خیال کے مطابق یہ ایک غلط اور ناجائز کام تھا۔ چند افراد کے نزدیک شاید ایسا نہیں تھا چونکہ اکثریت کے پاس طاقت تھی' اس لیے انہوں نے اپنی مرضی کو اقلیت پر بہ جبر نافذ کر

دیا اور اسی کو قانون کا درجہ حاصل ہو گیا گویا کہ ان پچاس آدمیوں میں سے کوئی بھی قتل کا مرتکب نہیں ہو گا۔ یہ استدلال آج کل کے حالات کے لحاظ سے بھی صحیح ہے۔ کئی کروڑ باشندوں کے ایک ملک میں باشندوں کی اکثریت کو قرآن کی ان آیات کی جن کے اندر دو یا زائد تعبیروں کی گنجائش ہو' ایسی تعبیر کرنی چاہیئے جو ان کے حالات کے لیے موزوں ترین ہو اور اسی طرح قرآن کے عام اصولوں کو حالات موجودہ پر منطبق کرنا چاہیئے تاکہ فکر و عمل میں یکسانی و وحدت پیدا ہو سکے۔ اسی طرح یہ اکثریت کا کام ہے کہ ان مسائل و معاملات میں جن پر قرآن ساکت ہے' کوئی قانون بنائے۔ اس کے بعد جو سوال بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ کروڑوں انسان قرآن مجید کی تعبیر و انطباق اور مسکوت عنہا معاملات میں قانون سازی کے حق کو کس طرح استعمال کریں گے؟ ایک ملک کے حالات کو دیکھ کر اس امر کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کے لیے اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کی بہترین صورت کیا ہے جنہیں وہ اعتماد کے ساتھ اپنے اختیارات اور اظہار رائے کے حقوق تفویض کر سکیں۔ وہ فرد واحد کو بھی اپنا نمائندہ منتخب کر سکتے ہیں۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک شخص کو مختار مطلق بنا دینے کے نتائج ہمیشہ مہلک ثابت ہوئے ہیں' اقتدار کا نشہ فرد' جماعت اور قانون کی حکمرانی میں اختلال اور بگاڑ کا موجب ہوتا ہے اور جہاں اقتدار بلاقید اور مطلق ہو' وہاں یہ سہ گونہ فساد بھی اپنی آخری حد کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک ملک کی تاریخ میں ایسے حالات پیش آ سکتے ہیں جو ایک شخص کو مجبور کر دیں کہ وہ اصلاح احوال اور ملک کو تباہی سے بچانے کی خاطر عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن یہ ایک ہنگامی صورت ہے جو جمہوریت کو بحال کرنے اور اختیارات کی امانت کو عوام کی طرف لوٹانے کے لیے قطعی طور پر جائز ہے۔

اس لیے صحیح اسلامی قانون کے مطابق اس امر کی بڑی اہمیت ہے کہ اختیارات متعدد افراد کے اندر منقسم ہوں تاکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے روک تھام اور احتساب کا باعث ہو' اور سب مل جل کر پوری قوم کی رہنمائی کے لیے قوانین و

ضوابط وضع کر سکیں۔ حالات کا قدرتی اقتضاء یہ ہے کہ یہ جملہ بااختیار افراد عوام الناس کے سامنے مسئول اور جوابدہ ہوں۔ صرف اسی صورت میں ہی ایک منظم طریق کار کے ساتھ کسی پروگرام کو کامیابی کے مراحل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اسلام میں سارے مسلمان اقتدار کے یکساں طور پر حامل ہیں اور ان پر صرف اللہ کی بالادستی ہے ان کے فیصلے آزاد شہریوں کی حیثیت سے اجتماعی اور مشترک طور پر کیے جاتے ہیں' اسی کا نام "اجماع" ہے۔

"اجتہاد" قانون کا ایک مسلم ماخذ ہے۔ اس سے مراد کسی مشتبہ یا مشکل قانونی مسئلے میں رائے قائم کرنے کے لیے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر مصروف کار کرنا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے بڑے وسیع پیمانے پر "اجتہاد" کا استعمال کیا ہے۔ "اجتہاد" کی جن مختلف صورتوں کو امام ابوحنیفہ اور دوسرے فقہاء کام میں لائے ہیں وہ یہ ہیں: قیاس' استحسان' استصلاح اور استدلال۔ مسلمان فقیہ فرد واحد یا چند افراد کے لیے "اجتہاد" کو خطرناک سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ اس بات کو قابل ترجیح خیال کرتے تھے کہ کسی خاص قانونی مسئلے میں فقہاء اور مجتہدین کے اجماع یا کثرت رائے سے فیصلہ ہو۔ قدیم زمانے میں تو شاید یہ درست تھا کہ اجتہاد کو چند فقہاء تک محدود کر دیا جائے' کیونکہ لوگوں میں آزادانہ اور عمومیت کے ساتھ علم نہیں پھیلایا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں یہ فریضہ باشندوں کے نمائندوں کو انجام دینا چاہیے' کیونکہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں' قرآن مجید کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے عام اصولوں کو حالات پر منطبق کرنا ایک یا دو اشخاص کا مخصوص استحقاق نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا حق اور فرض ہے اور یہ کام ان لوگوں کو انجام دینا چاہیے جنہیں تمام مسلمانوں نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہو۔ لہذا یہ بات آپ سے آپ لازم آتی ہے کہ جن معاملات میں قرآن مجید کا حکم واضح ہو' وہ مسلمانوں کے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے اور جہاں تک قرآن مجید کی تعبیر اور اس کے کلیات کو جزئیات پر چسپاں کرنے کا تعلق ہے' ان میں جو کچھ عوام کے منتخب

نمائندے طے کریں گے' اسے بھی قانون کا درجہ حاصل ہو گا۔

(۱۶) اوپر جو نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے اسے چند مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ میں پہلے قرآن مجید کی سورۂ نسا کی تیسری آیت کو لوں گا' جسے اکثر غلط استعمال کیا گیا ہے۔

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمٰی فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنٰی وثلث وربع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم ذالک ادنٰی الا تعولوا۔

(اور اگر تم ڈرو کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف نہیں کرو گے تو نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں' عورتوں سے دو دو' تین تین' چار چار۔ پھر اگر تم ڈرو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی سہی یا جن کے مالک ہیں تمہارے سیدھے ہاتھ۔ اس سے اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تم بے انصافی نہ کرو گے)۔

جیسا کہ میں اپنے فیصلے کے ابتدائی حصے میں بیان کر چکا ہوں' قرآن مجید کے کسی حکم کا کوئی جزء بھی فضول یا بے معنی نہ سمجھا جانا چاہیے۔ لوگوں کے منتخب نمائندوں کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں ایک قانون بنائیں کہ آیا ایک مسلمان ایک سے زائد بیویاں کر سکتا ہے یا نہیں اور اگر کر سکتا ہے تو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ۔ از راہ قیاس ایسی شادی کو یتیموں کے فائدے کے لیے ہونا چاہیے۔

(۱۷) بہرکیف اس آیت سے صرف جواز ثابت ہوتا ہے نہ کہ لزوم اور میری دانست میں ریاست اس اجازت کو محدود کر سکتی ہے۔ اگر پچاس آدمیوں کی جماعت میں سے اکثریہ قانون بنا سکتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قتل کا ارتکاب نہیں کرے گا' تو اس مثال پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کہے کہ "میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کروں گا' کیونکہ میں

اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی' تمدنی یا سیاسی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کا کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ اس آیت کو قرآن مجید کی دو دوسری آیات کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ پہلی آیت سورہ ۲۴ کی آیت ۳۳ ہے جس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کرنے کے ذرائع نہ رکھتے ہوں' ان کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک شخص کو ایک بیوی کرنے سے روکا جا سکتا ہے تو انہی وجوہ یا ایسے ہی وجوہ کی بنا پر اسے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے روک دیا جانا چاہیے۔ شادی بیوی اور بچوں کے وجود پر متضمن ہے۔ اگر خاندان کی عدم کفالت کی صورت میں ایک شخص کے لیے نکاح ممنوع ہو سکتا ہے تو اسے اس امر پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے ہی بچے پیدا کرے' جتنے پال سکے۔ اگر وہ خود تحدید نسل نہ کر سکے تو ریاست کو اس کے لیے یہ کام کرنا چاہیے۔ اس اصول کا وسیع پیمانے پر اطلاق کرتے ہوئے' مثلاً اگر کسی ملک کی غذائی حالت خراب ہو اور برتھ کنٹرول کی حاجت ہو تو ریاست کے لیے یہ قانون بنانا بالکل جائز ہو گا کہ کوئی شخص ایک سے زائد بیویاں نہ رکھے اور ایک بھی صرف اس صورت میں رکھے جبکہ وہ اپنے کنبے کی ضروریات فراہم کر سکتا ہو اور بچے بھی ایک خاص حد تک رکھے۔ مزید برآں آیت مذکورۂ بالا میں خاص طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ایک مسلمان ڈرا ہو کہ وہ دو بیویوں کے درمیان عدل نہیں کر سکے گا' تو وہ صرف ایک بیوی سے شادی کرے۔ آگے سورۃ ۴' آیت ۱۲۹ میں اللہ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانی ہستیوں کے بس میں نہیں ہے۔

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النسآء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقة وان تصلحوا او تتقوا فان اللہ کان غفوراً رحیما۔

(تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ عدل کر سکو' عورتوں کے درمیان خواہ تم اس کے کیسے ہی خواہشمند ہو۔ پس ایک سے کامل بے رخی اختیار نہ کرو کہ اسے ایسا چھوڑ دو جیسے وہ لٹکی ہوئی ہو اور اگر تم اصلاح کرو اور بچو (برائی سے) تو یقیناً اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے)۔

یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بنائے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کر دے۔

(۱۸) ریاست یہ کہہ سکتی ہے کہ دو بیویاں کرنے کی صورت میں چونکہ سالہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے' اور قرآن میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں برتاؤ ناممکن ہے' لہٰذا یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے۔ یہ تین آیات عام اصول بیان کرتی ہیں۔ ان عام اصولوں کا انطباق ریاست کو اپنی نگرانی میں کرنا چاہئے۔ ریاست لوگوں کو ایک سے زیادہ شادی کر کے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو تباہ کرنے سے بچا سکتی ہے۔ قومی اور ملکی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ جب کبھی ضرورت محسوس ہو' شادی پر پابندی عائد کر دی جائے۔

(۱۹) چوری کے معاملے میں سورہ ۵' آیت ۳۸ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ چور مردوں اور چور عورتوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے جرم کی عبرت ناک سزا ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۳۹ یہ بتاتی ہے "جو کوئی اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کر لے' تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے"۔ پس عام اصول یہ ہے کہ چوری کی زیادہ سے زیادہ سزا قطع ید ہے لیکن یہ طے کرنا ریاست کا کام ہے کہ چوری کیا ہے اور کون سی چوری کی کیا سزا ہے؟ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ریاست کو لوگوں کے لیے قرآنی احکام پر مبنی قواعد و ضوابط بنانے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ اختیارات بہت وسیع ہیں اور منظم عملی پروگرام نافذ کرنے کے لیے ان کا آزادانہ استعمال ہونا چاہئے۔

(۲۰) ہندو پاکستان میں جتنی کتابیں بھی قانونی لحاظ سے مستند تسلیم کی جاتی ہیں'

ان میں اولاد صغار کے متعلق بیان کردہ اصول قرآن مجید پر مبنی نہیں ہیں۔ اس مقدس کتاب میں جو احکام نابالغ بچوں سے متعلق ہیں ان میں سے چند یہاں نقل کیے جا رہے ہیں:

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة وعلی المولود رزقھن وکسوتھن بالمعروف لا تکلف نفس الا وسعھا لا تضار والدة بولدھا ولا مولود بولده وعلی الوارث مثل ذالک فان اراد فصالاً عن تراض منھما وتشاور فلا جناح علیھما وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم فلا جناح علیکم اذا سلمتم ما اتیتم بالمعروف واتقوا اللّٰہ واعلموا ان اللّٰہ بما تعملون

(اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال اس کے لیے جو رضاعت کو پورا کرنا چاہے اور باپ کے ذمے ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا معروف طریق پر۔ کسی جان کو تکلیف نہ دی جائے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ نہ والدہ کو ضرر پہنچایا جائے اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ والد کو' اور وارث کے ذمے بھی اسی کی مانند ہے۔ پس اگر دونوں دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور مشورے سے تو کوئی گناہ نہیں ان پر اور اگر تم چاہو کہ دوسری عورت سے دودھ پلاؤ اپنے بچوں کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر جب کہ تم نے جو کچھ طے کیا ہے وہ معروف طریقے پر حوالے کر دو۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو اللہ جو کچھ تم کرتے ہو' اسے دیکھنے والا ہے)۔

اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم ولا تضار وھن لتضیقوا علیھن وان کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتی یضعن حملھن فان ارضعن لکم فاتوھن اجورھن واتمروا بینکم

بمعروف وان تعاسرتم فسترضع لہ اخریٰ

(ٹھہراؤ انہیں جہاں تم ٹھہرے ہو اپنے وسائل کے مطابق اور انہیں نقصان نہ پہنچاؤ تاکہ ان پر تنگی کرو اور اگر حمل والی ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ وضع حمل ہو جائے۔ پھر اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو دو انہیں ان کے معاوضے اور مشورہ کر لو آپس میں معروف کے مطابق اور اگر باہمی اختلاف ہو تو دوسری عورت اسے دودھ پلائے)۔

ان آیات کی رو سے ماؤں کو پورے دو سال تک بچوں کو دودھ پلانا ہو گا۔ باپ کو سارے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے جن میں نظر بظاہر بچے اور والدہ دونوں کے اخراجات شامل ہیں۔ اس سے شیعہ قانون کی تائید ہوتی ہے جس کی رو سے لڑکے کے معاملے میں والدہ کا حق حضانت دو سال ہے۔ لیکن حضانت کے مسئلے میں لڑکے اور لڑکی کے مابین جو تمیز قائم کی جاتی ہے' اس کے حق میں مجھے قرآن سے کوئی وجہ جواز فراہم نہیں ہو سکی۔ قرآن مجید والدین میں سے ہر دو پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ بچے کی پرورش کریں۔ بچے سے محروم نہ والد کو کیا جا سکتا ہے اور نہ والدہ کو۔ بہرکیف قرآن مجید میں ایسی کوئی ہدایت نہیں کہ ایک عورت طلاق پا کر اگر دوسری شادی کر لے تو پہلا شوہر اس سے اپنا بچہ لے سکتا ہے۔ اگر محض اس بنا پر کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے' وہ بچہ سے محروم ہو سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ ایک مرد دوسری شادی کر لینے کی صورت میں کیوں نہ اپنے بچے سے محروم ہو۔ سوتیلی ماں اگر سوتیلے باپ سے زیادہ نہیں تو کم از کم اس کے برابر تکلیف دہ اور خطرناک ضرور ہے۔ بہر حال نابالغوں کے متعلق قانون بنانا ریاست کا کام ہے کیونکہ قرآن اس بارے میں قطعاً ساکت ہے۔ گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کے بارے میں یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ نابالغاں کے معاملات اس کے تابع ہیں۔ پاکستان کی اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد ملک کے منتخب نمائندوں نے اس قانون کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن اس قانون میں بھی اس بارے میں

کوئی واضح اور متعین ضابطہ نہیں ہے کہ والدہ کے نکاح ثانی کے بعد نابالغ بچے کا حق حضانت کسے حاصل ہو گا۔ قرآن اور اس ایکٹ دونوں کے مطابق واحد قابل لحاظ امر بچے کی فلاح و بہبود ہے۔ اگر بچے کی فلاح و بہبود کا تقاضا یہ ہو کہ بچہ والدہ کے پاس رہے' تو والدہ کے نکاح ثانی کے باوجود بچہ اسی کی تحویل میں رہنا چاہیے۔ ہر مقدمے کا فیصلہ اس کے خاص حالات و کوائف کی بنا پر ہو گا۔

(۲۱) قرآن کے علاوہ حدیث یا سنت کو بھی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اسلامی قانون کا ایک اتنا ہی اہم ماخذ سمجھ لیا ہے۔ متعین مفہوم کے مطابق حدیث سے مراد رسول اللہ کا قول ہے۔ لیکن عام طور پر حدیث سے مراد رسول کا قول و عمل لیا جاتا ہے جسے آپ نے پسند یا ناپسند فرمایا' یا ناپسند نہیں فرمایا۔ اسلامی قانون کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے حدیث کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ رسول پاک کا مرتبہ و مقام اسلامی دنیا میں کیا ہے؟ میں اس فیصلے کے ابتدائی حصہ میں یہ بتا چکا ہوں کہ اسلام ایک خدائی دین ہے۔ یہ اپنی سند خدا اور صرف خدا ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اگر یہ اسلام کا صحیح تصور ہے تو اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی کے اقوال و اعمال اور کردار کو خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کی سی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ ان سے یہ معلوم کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی' یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو خاص واقعات پر کس طرح منطبق کیا گیا تھا۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محمد رسول اللہ ایک کامل انسان تھے۔ نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ جس عزت و تکریم کے مستحق ہیں یا جس عزت و تکریم کا ہم ان کے لیے اظہار کرنا چاہتے ہیں' اس کے اظہار کی قوت و قابلیت وہ رکھتا ہے لیکن بایں ہمہ وہ خدا نہ تھے' نہ خدا سمجھے جا سکتے ہیں۔ دوسرے تمام رسولوں کی طرح وہ بھی انسان ہی ہیں۔ (اس کے بعد فاضل جج نے سورہ ۱۲: آیت ۱۰۹' سورہ ۱۴: آیت ۱۰-۱۱' سورہ ۴۳: آیت

۱۴۳' سورہ ۷: آیت ۱۸۸' سورہ ۴۱: آیت ۶' سورہ ۵۱: آیت ۵۱ مع ترجمہ نقل کی ہیں۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا ذکر ہے۔ اس کے بعد فاضل جج فرماتے ہیں):

ان کو اللہ کے احکام کی پابندی اسی طرح کرنی پڑتی تھی جس طرح ہمیں کرنی پڑتی ہے' بلکہ شاید ان کی ذمہ داریاں قرآن مجید کی رو سے ہماری ذمہ داریوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھیں۔ وہ مسلمانوں کو اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے تھے جتنا کچھ کہ ان پر نازل ہوا تھا۔

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسلتہ واللہ یعصمک من الناس۔ ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین

(اے رسول! پہنچادو جو کچھ نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تمہیں بچائے گا لوگوں سے یقیناً اللہ نہیں ہدایت دیتا کافروں کی قوم کو)۔

(۲۲) میرے لیے اس بات پر زور دینے کی خاطر قرآن مجید کی آیات نقل کرتے جانا غیر ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ اگرچہ بڑے عالی مرتبہ انسان تھے مگر ان کو خدا کے بعد دوسرا درجہ ہی دیا جا سکتا ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے' ماسوا اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی تھی' وہ خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور اپنے ان خیالات کے زیر اثر وہ کام کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا' مگر وہ غلطیاں تو کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے:

لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر ویتم نعمتہ علیک ویھدیک صراطا مستقیما

(تاکہ اللہ بخش دے تیری اگلی پچھلی خطاؤں کو اور اپنی نعمت تمام کرے تم

پر اور راہنمائی کرے تمہاری سیدھے راستے کی طرف)۔

ایک سے زیادہ مقامات پر قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ محمد رسول اللہ دنیا کے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہیں' مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک آدمی کو ویسا ہی ایماندار' ویسا ہی راست باز' ویسا ہی سرگرم اور ویسا ہی دیندار اور متقی ہونا چاہیے جیسے وہ تھے' نہ کہ ہم بھی بعینہ اسی طرح سوچیں اور عمل کریں جس طرح وہ سوچتے اور عمل کرتے تھے' کیونکہ یہ تو غیر فطری بات ہو گی اور ایسا کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں تو زندگی بالکل ہی مشکل ہو جائے گی۔

(۲۳) یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن پاک اس کی تاکید کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ کی اطاعت کی جائے مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں انہوں نے ہم کو ایک خاص کام ایک خاص طرح کرنے کا حکم دیا ہے' ہم وہ کام اسی طرح کریں۔ اطاعت تو ایک حکم ہی کی ہو سکتی ہے۔ جہاں کوئی حکم نہ ہو' وہاں نہ اطاعت ہو سکتی ہے نہ عدم اطاعت۔ قرآن کے ان ارشادات سے یہ مطلب اخذ کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم ٹھیک وہی کچھ کریں جو رسول نے کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک فرد واحد کے زمانہ حیات کا تجربہ واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا' اگرچہ وہ فرد واحد نبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ بات پورے زور کے ساتھ کہی جانی چاہیے کہ اسلام نے نبی کو کبھی خدا نہیں سمجھا ہے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ قرآن اور حدیث میں جوہری اور حقیقی فرق ہے۔ جہاں تک ان سوالات کا تعلق ہے کہ ایک قوم کے لیے خاص معاملات میں ضابطہ اخلاق کیا ہو اور ایک خاص مقدمے کا فیصلہ کس طرح ہو' انہیں انصاف اور موجودہ حالات کے تقاضوں ہی کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے۔

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس
ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا

بصیراً۔

(یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں اور جب تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرو عدل کے ساتھ۔ یقیناً اللہ بہت اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے تمہیں۔ اللہ سننے والا' دیکھنے والا ہے)۔

سمعون للکذب اکلون للسحت فان جآء ک فاحکم بینھم او اعرض عنھم وان تعرض عنھم فلن یضروک شیئا وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین

(بہت جھوٹ سننے والے اور حرام خور ہیں' پس اگر تمہارے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کرو یا اعراض کرو ان سے اور اگر تم ان سے منہ پھیر لو تو تمہارا کچھ بگاڑ نہیں لیں گے اور اگر تم فیصلہ کرو تو فیصلہ کرو ان کے درمیان عدل سے۔ اللہ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

فلذالک فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم وقل امنت بما انزل اللہ من کتب وامرت لا عدل بینکم اللہ ربنا وربکم لنا اعمالنا ولکم اعمالکم لا حجۃ بیننا وبینکم اللہ یجمع بیننا والیہ المصیر۔

(پس اس طرف بلاؤ اور سیدھے رہو جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اور مت پیروی کرو ان کی خواہشات کی اور کہو ایمان لایا میں اس پر جو کچھ اللہ نے نازل کیا کتاب سے اور حکم دیا گیا ہے مجھے کہ میں عدل کروں تمہارے مابین۔ اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ جمع کرے گا ہمیں اور اسی کی طرف پلٹنا ہے)۔

انفرادی اور قومی معاملات کا تصفیہ کرنے کے لیے ہم زمان و مکان کے اختلافات کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔

(۲۴) کوئی مستند شہادت ایسی موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ خلفائے اربعہ محمد رسول اللہ کے اقوال و افعال اور کردار کو کیا اہمیت دیتے تھے؟ لیکن بحث کی خاطر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ افراد کے معاملات اور قومی اہمیت رکھنے والے مسائل کا فیصلہ کرنے میں حدیث کا بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کرتے تھے' تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے کیونکہ وہ ہماری بہ نسبت بلحاظ زمانہ بھی اور بلحاظ مقام بھی محمد رسولؐ اللہ سے قریب تر تھے۔ مگر ابو حنیفہ نے جو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ستر سال بعد فوت ہوئے' تقریباً ۱۷ یا ۱۸ حدیثیں ان مسائل کا فیصلہ کرنے میں استعمال کیں جو ان کے سامنے پیش کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ رسول اللہ کے زمانے سے اس قدر قریب نہیں تھے جتنے پہلے چار خلفاء تھے۔ انہوں نے اپنے تمام فیصلوں کی بنیاد قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی اور متن قرآن کے الفاظ کے پیچھے ان محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو ان ہدایات کے موجب تھے۔ وہ استدلال و استنباط کی بڑی قوت رکھتے تھے۔ انہوں نے عملی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول و نظریات مرتب کیے۔ اگر ابو حنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں کریں تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید کی تفسیر اور مقدمات کے فیصلے میں ابو حنیفہ کے اقوال کو حرف آخر ان کے شاگردوں اور پیروؤں نے بھی نہ مانا۔ وہ بہرحال ایک انسان تھے اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے فرد واحد کی رائے پر انحصار صحیح نہیں ہے۔ ایک قوم کے لیے صرف ان آراء و قوانین کی پابندی لازمی ہو سکتی ہے جو اس کے منتخب نمائندوں نے بالاجماع طے کیے ہوں۔ ابو حنیفہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ سوسائٹی کو جن قواعد و قوانین کی حاجت ہے وہ سب نہیں بلکہ ان میں سے چند ایک ہی قرآن میں موجود ہیں۔ اس

کے برعکس بعد میں آنے والوں میں سے بعض کی رائے یہ تھی کہ ہر مستنبط قانون قرآن میں مضمر تھا اور ان کے استنباط کی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن کے اندر مخفی تھا اسے وہ منظر عام پر لے آئے ہیں۔ میں اس معاملے میں جو بڑا متنازعہ فیہ ہے' اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ آج کل جبکہ ہم ایک منظم اور منضبط دنیا میں جی رہے ہیں اور ہر طرح کی حکیمانہ تحقیق کی سہولتیں ہمیں حاصل ہیں' یہ ٹھیک وقت ہے کہ ہم حدیث کے ماخذ قانون ہونے کی حیثیت کا جائزہ لیں' نیز اس مسئلے پر بھی غور کریں کہ آیا امام ابو حنیفہ یا ان جیسے دیگر عالی مرتبت فقہاء کے اقوال کی پابندی ہم پر لازم ہے یا حاضر و واقعی حالات کی روشنی میں ہمارے لیے بھی قیاس و استنباط کا حق بحال کیا جا سکتا ہے؟

(۲۵) تمام فقہائے اسلام اس بات کو بالاتفاق مانتے ہیں کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا' جعلی حدیثوں کا ایک جم غفیر اسلامی قوانین کا ایک جائز و مسلم ماخذ بنتا چلا گیا۔ جھوٹی حدیثیں خود محمد رسول اللہ کے زمانے میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ جھوٹی اور غلط حدیثیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دور میں روایت حدیث پر پابندیاں لگا دیں بلکہ اس کی ممانعت کر دی۔ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس بات سے انکار کرے گا کہ جس طرح قرآن کو محفوظ کیا گیا اس طرح کی کوئی کوشش رسول اللہ کے اپنے عہد میں احادیث کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جو شہادت موجود ہے وہ یہ ہے کہ محمد رسولؐ اللہ نے سختی کے ساتھ احادیث کو محفوظ کرنے سے منع کیا تھا۔ اگر مسلم کی روایات صحیح ہیں تو محمد رسولؐ اللہ نے پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ ان کے اقوال اور افعال کو دیکھیں۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ جس کسی نے ان کی احادیث کو محفوظ کر رکھا ہو' وہ انہیں فوراً ضائع کر دے۔ لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا ولا حرج۔ اسی

حدیث یا ایسی ہی ایک حدیث کا ترجمہ مولانا محمد علی نے اپنی کتاب "دین اسلام" کے ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں صفحہ ۶۲ پر ان الفاظ میں دیا ہے:

"روایت ہے کہ ابوہریرہؓ نے کہا رسولؐ خدا ہمارے پاس آئے اس حال میں کہ ہم حدیث لکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا تم لوگ کیا لکھ رہے ہو؟ ہم نے کہا حدیث جو ہم آپؐ سے سنتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا یہ کیا! اللہ کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب؟"

اس امر کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کے فوراً بعد جو چار خلیفہ ہوئے ان کے زمانے میں احادیث محفوظ یا مرتب کی گئی ہوں۔ اس امر واقعہ کا کیا مطلب لیا جانا چاہیے؟ یہ گہری تحقیقات کا طالب ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ اور ان کے بعد آنے والے چاروں خلفاء نے احادیث کو محفوظ کرنے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ یہ احادیث عام انطباق کے لیے نہیں تھیں؟ مسلمانوں کی بڑی اکثریت نے قرآن کو حفظ کر لیا۔ وہ جس وقت وحی آتی تھی، اس کے فوراً بعد کتابت کا جو سامان بھی میسر آتا تھا اس پر لکھ لیا جاتا تھا اور اس غرض کے لیے رسول کریمؐ نے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ لیکن جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ نہ یاد کی گئیں، نہ محفوظ کی گئیں۔ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرنے کے بعد مر گئے، یہاں تک کہ رسولؐ کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا۔ میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ یہ معلوم کرنے کے لیے ایک مکمل اور منظم ریسرچ کی جائے کہ عربوں کے حیرت انگیز حافظے اور زبردست قوت یادداشت کے باوجود آیا احادیث کو موجودہ شکل میں قابل اعتماد اور صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ بعد میں پہلی مرتبہ رسولؐ اللہ کے تقریباً ایک سو سال بعد احادیث کو جمع کیا گیا مگر ان کا ریکارڈ اب قابل حصول نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کو حسب ذیل اصحاب نے جمع کیا: امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ)، امام

مسلم (متوفی ۲۶۱ھ)، ابوداؤد (متوفی ۲۷۵ھ)، جامع ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ)، سنن نسائی (متوفی ۳۰۳ھ)، سنن ابن ماجہ (متوفی ۲۸۳)، سنن الدرہی (متوفی ۱۸۱ھ)، بیہقی (ولادت ۳۸۴ھ)، امام احمد (پیدائش ۱۶۴ھ)۔ شیعہ حضرات جن جامعین حدیث کے مجموعوں کو مستند سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں: ابو جعفر (۳۲۹ھ)، شیخ علی (۳۸۱ھ)، شیخ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین (۴۶۶ھ)، سید الرضی (۴۰۶ھ)۔ ظاہر ہے کہ یہ مجموعے امام بخاری وغیرہ کے مجموعوں سے بھی بعد میں مرتب کیے گئے۔ ایسی بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعین حدیث متفق ہوں۔ کیا یہ چیز احادیث کو انتہائی مشکوک نہیں بنا دیتی کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے؟ جن لوگوں کو تحقیقات کا کام سپرد کیا گیا ہو وہ ضرور اس بات پر نگاہ رکھیں گے کہ ہزار دو ہزار جعلی حدیثیں پھیلائی گئی ہیں تاکہ اسلام اور محمدؐ رسول اللہ کو بدنام کیا جائے۔ انہیں اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا ہو گا کہ عربوں کا حافظہ خواہ کتنا ہی قوی ہو، کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابل اعتماد سمجھی جا سکتی ہیں؟ آخر آج کے عربوں کا حافظہ بھی تو ویسا ہی ہے جیسے تیرہ سو برس ان کا حافظہ رہا ہو گا۔ آج کل عربوں کا حافظہ جیسا کچھ ہے وہ ہمیں رائے قائم کرنے کے لیے ایک اہم سراغ کا کام دے سکتا ہے؟ عربوں کے مبالغے نے، اور جن راویوں کے ذریعے سے یہ روایات ہم تک پہنچی ہیں، ان کے اپنے معتقدات اور تعصبات نے بھی ضرور بڑی حد تک نقل روایت کو مسخ کیا ہو گا۔ جب الفاظ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں، وہ ذہن خواہ عرب کا ہو یا کسی اور کا بہرحال ان الفاظ میں ایسے تغیرات ہو جاتے ہیں جو ہر ذہن کی اپنی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر ذہن ان کو اپنے طرز پر موڑتا توڑتا ہے، اور جبکہ الفاظ بہت سے ذہنوں سے گزر کر آئے ہوں تو ایک شخص تصور کر سکتا ہے کہ ان میں کتنا بڑا تغیر ہو جائے گا۔ ہمیں اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے کہ فطرت انسانی ہر جگہ یکساں ہے۔ اللہ نے انسان کو ناقص بنایا ہے اور بشری مشاہدہ انتہائی خام اور کمزور ہے۔

(۲۶) ایک شخص اگر حدیث کے مجموعوں کا مطالعہ کرے تو ان میں کم از کم بعض حدیثیں ایسی بھی موجود ہیں جنہیں داخلی شہادت کی بنا پر صحیح ماننا مشکل ہے۔ا۔

عن عطاء انه قال دخلت علیٰ عائشة فقلت اخبرینا باعجب مارایت من رسول الله صلعم فبکت وقالت وای شانه لم یکن عجبًا۔ اتانی فی لیلة فدخل معی فی فراشی (او قالت فی لحافی) حتی مس جلدی جلده ثم قال یا ابنة ابی بکر ذرینی اتعبد لربی قلت انی احب قربک لکن اوثر ھواک فاذنت له فقام الیٰ قربة فتوضاء فلم یکثر صب الماء ثم قام یصلی فبکی حتی سالت دموعه علی صدره ثم رکع فبکی ثم سجد فبکی ثم رفع راسه فبکی فلم یزل کذالک یبکی حتیٰ جاء بلال فاذنه بالصلوة فقلت یا رسول الله ما یبکیک وقد غفر الله ما تقدم من ذنبک وما تاخر قال افلا اکون عبداً شکوراً۔

(عطاء سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت عائشہؓ کے پاس گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سب سے زیادہ پسندیدہ اور عجیب بات دیکھی ہو، وہ بتائیں۔ حضرت عائشہؓ رو دیں اور فرمایا: آنحضور کی کون سی حالت عجیب اور خوش کن نہیں تھی۔۲۔ ایک رات آپ تشریف لائے اور میرے ساتھ میرے بستر یا

ا۔ اس سے آگے فاضل جج نے جو احادیث مع ترجمہ درج کی ہیں وہ فضل الکریم صاحب کے انگریزی ترجمہ مشکوٰۃ "الحدیث" جلد اول 'طبع ۱۹۳۸ء سے جوں کی توں نقل کردی گئی ہیں۔ ان احادیث کی عبارت اور ان کے ترجمے متعدد مقامات پر سخت غلطیاں موجود ہیں۔ اصل مشکوٰۃ سے مراجعت کے بعد ہم نے حتی الوسع ان غلطیوں کی اصلاح کردی ہے۔(غ)

۲۔ اس فقرے کا ترجمہ اصل فیصلے کے متن میں یوں کیا گیا ہے: "اس سے زیادہ عجیب اور پسندیدہ بات کون سی ہوگی" یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

لحاف میں داخل ہو گئے حتیٰ کہ میرے بدن نے آپؐ کے بدن کو چھو لیا۔ پھر فرمایا اے ابوبکر کی بیٹی' مجھے اپنے رب کی عبادت کرنے دو۔اہ میں نے عرض کیا: مجھے آپؐ کا قرب پسند ہے لیکن میں آپؐ کی خواہش کو قابل ترجیح سمجھتی ہوں۔ پس میں نے آپؐ کو اجازت دے دی۔ آپؐ پانی کے ایک مشکیزے کے پاس تشریف لے گئے۔ پھر آپؐ نے وضو کیا اور زیادہ پانی نہیں بہایا۔ پھر آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے اور اتنے روئے کہ آپؐ کے آنسو آپؐ کے سینہ مبارک پر بہ نکلے۔ پھر آپؐ نے روتے ہوئے رکوع کیا پھر روتے ہوئے سجدہ کیا' پھر روتے ہوئے سر اٹھایا۔ آپؐ مسلسل اسی طرح روتے رہے' یہاں تک کہ بلال آئے اور انہوں نے نماز (کا وقت ہو جانے) کی خبر دی۔ میں نے عرض کیا' اے اللہ کے رسولؐ' آپ کیوں روتے ہیں حالانکہ اللہ نے آپؐ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے؟ آنحضورؐ نے فرمایا: تو کیا میں ایک شکرگزار بندہ نہ بنوں؟"

عن عائشة قالت كان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقبل ازواجہ ثم یصلی ولا یتوضا

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیتے تھے اور پھر وضو کیے بغیر نماز پڑھ لیتے تھے)۔

عن ام سلمة قالت قالت ام سلیم یا رسول اللّٰہ ان اللّٰہ لا یستحی من الحق فھل علی المراۃ من غسل اذا احتلمت قال نعم اذا رات الماء فغطت ام سلمة وجھہا وقالت یا رسول اللّٰہ او تحتلم المراۃ قال نعم

اہ اس فقرے کا ترجمہ فیضے میں یوں ہے: مجھے چھوڑ دو۔ کیا تم اپنے رب کی عبادت کرو گی؟" یہ ترجمہ درست نہیں۔

تربت یمینک فبم یشبہا ولدھا (متفق علیہ) وزاد مسلم بروایۃ ام سلیم ان ماء الرجل غلیظ وما المرأۃ رقیق اصفر فمن ایھما علا او سبق یکون منہ الشبہ۔

(حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ ام سلیم نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ اللہ حق (بات) سے شرم روا نہیں رکھتا۔ پس کیا عورت پر غسل ہے جب اسے احتلام ہو؟ آنحضورؐ نے فرمایا' ہاں' جب وہ پانی دیکھے (یعنی جبکہ فی الواقع خواب میں اسے انزال ہو گیا ہو)۔ حضرت ام سلمہؓ نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور کہا: اے اللہ کے رسول' کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں' تیرا سیدھا ہاتھ خاک آلود ہو' آخر اس کا بچہ اس سے کیسے مشابہ ہوتا ہے۔ اور مسلم نے ام سلیم کی روایت میں یہ اضافہ کیا کہ مرد کا مادہ گاڑھا سفید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور پیلا۔ پس ان میں سے جو بھی غلبہ حاصل کرے اسی سے مشابہت ہوتی ہے۔

عن معاذۃ قالت عائشۃ کنت اغتسل انا ورسول اللہ صلعم من اناء واحد بینتی وبینہ فیبادرنی حتی اقول دع لی قالت وھما جنبان۔

(معاذ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے جو میرے اور آپ کے درمیان ہوتا تھا۔ آپؐ مجھ سے زیادہ جلدی کرتے تھے یہاں تک کہ میں کہتی تھی میرے لیے (پانی) چھوڑ دیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ اس وقت دونوں حالت جنابت میں ہوتے تھے۔

عن عائشۃ قالت سئل رسول اللہ صلعم عن الرجل یجد البلل ولا یذکر احتلاما قال یغتسل وعن الرجل الذی یری انہ قد احتلم ولا یجد بللا قال لا غسل علیہ۔ قالت ام سلیم ھل علی المرأۃ

تری ذالک غسلاً قال نعم' ان النساء شقائق الرجال۔

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو تری دیکھے لیکن احتلام اسے یاد نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: وہ غسل کرے اور ایسے شخص کے بارے میں (بھی پوچھا گیا) جسے احتلام یاد ہو لیکن وہ تری نہ پائے۔ آپ نے فرمایا: (اس پر غسل) نہیں ہے۔ ام سلیم نے کہا: اگر عورت اس طرح (رطوبت) دیکھے' تو اس پر بھی غسل ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں' عورتیں مردوں کا آدھا حصہ ہیں)۔

عنها قالت رسول اللہ صلعم اذا جاوز الختان الختان وجب الغسل فعلته انا ورسول اللہ صلعم فاغتسلنا

(انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شرم گاہوں کے اگلے حصے باہم متجاوز ہو جائیں تو غسل واجب ہے۔ میں نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا اور غسل کیا)۔

عن عائشة قالت كان رسول الله صلی الله عليه وسلم يغتسل من الجنابة ثم يستدفی بی قبل ان اغتسل

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت کر لینے کے بعد (سردی دور کرنے کے لیے) مجھ سے گرمی حاصل کرتے تھے' قبل اس کے کہ میں غسل کروں)

عن عائشة قالت كنت اغتسل انا والنبی صلعم من اناء واحد وكلانا جنب وكان يامرنی فاتزر فيباشرنی وانا حائض ويخرج راسه الی وهو معتكف فاغسله وانا حائض۔

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور میں ایک ہی برتن سے نہاتے تھے' درآں حالیکہ ہم دونوں جنبی

ہوتے تھے اور آپ مجھے حالت حیض ازار باندھنے کا حکم دیتے تھے اور مجھ سے بغل گیر ہوتے تھے اور آپ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر (مسجد سے) باہر کرتے تھے اور میں حیض کی حالت میں اسے دھوتی تھی)

عن عائشة کنت اشرب وانا حائض ثم اناوله النبی صلعم فیضع فاه علٰی موضع فی فیشرب واتعرق العرق وانا حائض ثم اناوله النبی صلعم فیضع فاه علٰی موضع فی

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں حیض کی حالت میں برتن سے پانی پیتی تھی اور پھر اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بڑھا دیتی تھی۔ پس آپؐ وہاں منہ رکھتے تھے جہاں میں نے منہ رکھا ہوتا تھا اور آپؐ پیتے تھے۔ اور میں بحالت حیض ہڈی پر سے گوشت کھاتی تھی اور پھر اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیتی تھی اور آپ اس جگہ اپنا منہ رکھتے تھے جہاں میں نے رکھا ہوتا تھا)۔

عن عائشة قالت کنت اذا حضت نزلت عن المثال علی الحصیر فلم نقرب رسول اللّٰہ صلعم ولم ندن منه حتی نطھر۔

(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: جب میں حائضہ ہوتی تو میں بستر چھوڑ کر چٹائی پر لیٹتی تھی پس ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقاربت نہیں کرتے تھے جب تک کہ پاکیزگی حاصل نہیں کر لیتے تھے)۔[۱]

عنھا قالت قال لی النبی صلعم ناولینی الخمرة من المسجد فقلت انی حائض فقال ان حیضتک لیست فی یدک

۱۔ اصل فیصلے میں اس حدیث کے نقل کردہ الفاظ اور ترجمے میں بعض غلطیاں تھیں جن سے مسلب خبط ہو جاتا تھا۔ انہیں یہاں درست کر دیا گیا ہے۔

(انہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: مجھے مسجد سے چٹائی اٹھا کر دے دو۔ میں نے عرض کیا کہ میں حیض کی حالت میں ہوں۔ آپ نے فرمایا: حیض (کا اثر) تمہرے ہاتھ میں تو نہیں ہے (یعنی تم ہاتھ بڑھا کر مسجد سے چٹائی لے سکتی ہو)۔

(۲۷) مذکورۂ بالا بیشتر احادیث میں جو مضامین بیان کیے گئے ہیں' ان کی روایت حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حضرت ام سلمہؓ کی طرف منسوب ہیں۔ میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ یہ دونوں ازواج ہر لحاظ سے کامل تھیں۔ انہوں نے اسی عریانی کے ساتھ اپنی ان پرائیویٹ باتوں کو ظاہر کر دیا ہو گا جو ان کے اور محمدؐ رسول اللہ کے درمیان میاں بیوی کی صورت میں ہوئی ہوں گی۔

(۲۸) میں اپنے آپ کو یہ یقین کرنے کے ناقابل پاتا ہوں کہ محمدؐ رسول اللہ نے یہ باتیں کہی ہوں گی کہ دوزخ میں اکثریت عورتوں پر مشتمل ہو گی اور جنت کی اکثریت غرباء پر مشتمل ہو گی۔

عن اسامة بن زيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قمت على باب الجنة فكان عامة من دخلها المساكين واصحاب الجد محبوسون غير ان۔ اصحاب النار قد امر بهم الى النار وقمت على باب النار فاذا عامة من دخلها النساء

(اسامہ بن زید سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا اور (میں نے دیکھا) کہ اکثریت جو اس میں داخل ہو رہی تھی' وہ مساکین کی تھی اور دولت مند لوگ روک لیے گئے' سوائے اس کے کہ جو لوگ آگ کے لائق تھے انہیں آگ میں ڈالے جانے کا حکم دے دیا گیا' اور میں آگ کے

ا۔ غیر ان کا ترجمہ فیصلے میں (In addition to) درج ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

دروازے پر کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں داخل ہونے والی بالعموم عورتیں تھیں)۔

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطلعت فی الجنۃ ایت أکثر اھلھا الفقراء واطلعت فی النار فرایت أکثر اھلھا النساء

(ابن عباس سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت فقراء کی ہے اور میں نے دوزخ میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت عورتوں کی ہے)۔

(۲۹) کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو دولت کمانے سے بالواسطہ طریق پر منع کر دیا گیا ہے' کیونکہ اگر وہ دولت حاصل کریں گے تو ان کے جنت میں داخلے کے امکانات کم ہو جائیں گے؟ اگر سارے مسلمان غریب ہو جائیں تو ان کا کیا بنے گا؟ کیا ان کا کلی طور پر خاتمہ نہیں ہو جائے گا؟ کیا اس طرح زندگی کے ہر میدان میں ان کی ترقی رک نہیں جائے گی؟ مزید بر آں کیا یہ قابل یقین ہے کہ محمدؐ رسول اللہ نے وہ بات فرمائی ہو گی جو حدیث بخاری کے صفحہ ۸۵۲ پر روایت نمبر ۶۰۲:۷۳ میں عبداللہ بن قیس سے مروی ہے کہ "مسلمان جنت میں ان عورتوں سے مباشرت کریں گے جو ایک خیمہ کے مختلف گوشوں میں بیٹھی ہوں گی"۔ حدیثوں اور قرآن مجید کی پرانی تفسیروں نے اسلام کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے اور اس کی وسعت بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا ہمیں ان حالات کو برقرار رہنے دینا چاہئے؟

(۳۰) بحث کی خاطر اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ جو احادیث محدثین نے جمع کی ہیں وہ صحیح ہیں' تب بھی اس امر کی شہادت موجود ہے کہ اگر ان احادیث کا تعلق دین سے نہ ہو تو رسولؐ اللہ انہیں حرف آخر کا درجہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ مسلم میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے۔

عن رافع بن خدیج قال قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینة وھم یابرون النخل فقال ما تصنعون قالوا کنا نصنعه قال لعلکم لو لم تفعلوا کان خیرا۔ ترکوه فنقصت فذکروا ذلک له فقال انا بشر اذا امرتکم بشئی من امر دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشئی من رای فانما انا بشر

(رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ مدینے کے لوگ کھجوروں میں پیوند لگاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم لوگ یہ کیا کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم پہلے سے ایسا کرتے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا: شاید تم ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ پس لوگوں نے یہ عمل چھوڑ دیا اور پیداوار کم ہوئی۔ انہوں نے آنحضورؐ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: میں انسان ہوں، جب میں تمہارے دین کے معاملے میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی پیروی کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بس ایک بشر ہی ہوں"۔

اس کے علاوہ ایک سے زائد احادیث میں محمدؐ رسول اللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ صرف قرآن ہی وہ ایک کتاب ہے جو تمام شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں کی رہنما ہونی چاہئے۔

(۳۱) یہ بات کہ محدثین خود اپنی جمع کردہ احادیث کی صحت پر مطمئن نہ تھے صرف اسی ایک امر واقعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے یہ نہیں کہتے کہ ہماری جمع کردہ احادیث کو صحیح مان لو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں ہمارے معیار صحت پر جانچ کر اپنا اطمینان کر لو۔ اگر انہیں ان احادیث کی صحت کا یقین ہوتا تو یہ جانچنے کا سوال بالکل غیر ضروری تھا۔

(۳۲) بعض احادیث ایسی ہیں جو انسان کی توجہ اس دنیا سے ہٹا دیتی ہیں۔ روحانیت ایک اچھی چیز ہے لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اسے بیہودہ

انتہاء تک پہنچا دیں۔ بنیادی طور پر اللہ نے ہمیں انسان بنایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم اسی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ اگر وہ چاہتا کہ ہم روحانی مخلوق یا فرشتے بن جائیں' تو اس کے لیے اس سے زیادہ آسان بات کوئی اور نہیں تھی کہ وہ ہمیں ایسا ہی بنا دیتا۔ حقیقی اسلامی قانون کے مطابق مسلمانوں کو اپنی توانائیاں اس مقصد کے لیے صرف کرنی چاہئیں کہ وہ زندگی کو مفید تر' حسین تر اور مکمل طور پر پرلطف بنا سکیں۔

(۳۳) اگر ہم احادیث کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اکثر احادیث مختصر اور بے ربط ہیں جنہیں سیاق و سباق اور موقع و محل سے الگ کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا مشخص کرنا ممکن نہیں ہے جب تک ان کا سیاق و سباق سامنے نہ ہو اور وہ حالات معلوم نہ ہوں جن میں رسول پاکؐ نے کوئی بات کہی ہے یا کوئی کام کیا ہے۔ بہرحال احادیث کی بالکل نئے سرے سے پوری چھان بین اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ حدیث قرآن کے احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی' مگر کم از کم ایک مسئلے میں تو احادیث نے قرآن پاک میں ترمیم کر دی ہے اور وہ وصیت کا مسئلہ ہے۔ احادیث کے بارے میں پورا غور و تامل کرنے کے بعد میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں کہ انہیں اپنی موجودہ شکل میں قرآن کے برابر درجہ نہیں دینا چاہئے اور نہ ہی ان کے اطلاق کو عام خیال کرنا چاہئے۔ میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ مختلف محدثین کی جمع کردہ احادیث کو اسلامی قانون کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ تسلیم کیا جائے جب تک ان کی دوبارہ جانچ پڑتال نہ کر لی جائے اور یہ پڑتال بھی کسی تنگ نظری اور تعصب پر مبنی نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ ان تمام قواعد و شرائط کو بھی از سر نو استعمال کیا جانا چاہئے جنہیں امام بخاری وغیرہ نے بے شمار جھوٹی' موضوع اور جعلی حدیثوں میں سے صحیح احادیث کو الگ کرنے کے لیے مقرر کیا تھا' نیز ان معیارات کو بھی کام میں لانا چاہئے جو نئے حقائق و تجربات نے ہمارے

لیے فراہم کیے ہیں۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ حقائق موجودہ کی روشنی میں قیاس و استدلال کے نازک اور لطیف طریقوں کو عمل میں لاتے ہوئے ججوں اور عوام کے منتخب نمائندوں کو قرآن پاک کی تفسیر کرنی چاہیے۔ ابوحنیفہ اور اس طرح کے دوسرے فقہاء نے جو فیصلے کیے ہیں اور جو بعض کتابوں میں مذکور ہیں انہیں نظائر کی حیثیت میں وہی درجہ استناد دیا جانا چاہیے جو عام عدالتی فیصلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے اندر مندرج قانون جامد نہیں بلکہ متحرک و منظم ہے۔ قرآن مجید کی تعبیر کو اس انسانی طرز عمل سے ہم آہنگ ہونا چاہیے جو حالات حاضرہ سے متاثر اور مختلف عناصر سے متعین ہوتا ہے۔ ابوحنیفہ کی طرح دنیوی معاملات کی تحقیقات میں عقل کو استعمال میں لانا چاہیے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق برعظیم ہندو پاکستان کے مسلمانوں کا قانون وسیع تغیرات کا محتاج ہے اور اسے ملک کے موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔

(اس کے بعد پیرا نمبر ۳۲ سے لے کر آخری پیراگراف نمبر ۴۱ تک فاضل جج نے اپیل کے اصل تصفیہ طلب مسئلہ' یعنی مسئلہ حضانت پر بحث کی ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر جامعین حدیث کی روایات کو صحیح اور قرآن کی طرح واجب الاتباع تسلیم کر بھی لیا جائے' تب بھی ان سے حضانت کے معاملے میں مسلمانوں کے مروج شخصی قانون کی تائید نہیں ہوتی۔ اگرچہ فیصلے کا یہ حصہ بھی بہت غور طلب اور لائق توجہ ہے' تاہم یہ چونکہ اصل موضوع فیصلہ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے زیر بحث لانا مقصود نہیں ہے' اس لیے اس کا ترجمہ نہیں کیا جا رہا ہے' اس حصے کو اصل انگریزی فیصلے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

تبصرہ

کچھ مدت سے ہمارے بعض حاکمان عدالت کی تقریروں اور تحریروں میں سنت کی صحت پر شکوک کے اظہار اور اس کو اسلامی قانون کی بنیاد تسلیم کرنے سے انکار کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ بعض عدالتی فیصلوں تک میں یہ خیالات نمایاں ہونے لگے تھے۔ مثال کے طور پر اب سے تین چار سال قبل مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ایک فیصلے میں لکھا گیا تھا:

"اصل مشکل سے سابقہ حدیث کے معاملہ میں پیش آتا ہے جو سنت یا عمل رسولؐ کی خبر دیتی ہے۔ اول تو یہ امر واقعہ ہے کہ کسی خاص مسئلے سے متعلق ایک حدیث کی صحت مختلف فیہ ہونے سے کم ہی محفوظ ہوتی ہے، پھر مزید برآں چند معاملات میں تو نبی کی ثابت شدہ سنت سے بھی بعض خلفائے راشدین اور خصوصاً حضرت عمرؓ نے انحراف کیا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اردو کے ایک عمدہ رسالے میں جمع کی گئی ہیں، جس کو ادارۂ طلوع اسلام کراچی نے "اسلام میں قانون سازی کے اصول" کے نام سے شائع کیا ہے اور میں نے اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔۔۔ یہاں میرے لیے یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ سنت کے مبنی بروحی ہونے کی دلیل کچھ مضبوط نہیں ہے"۔ (پی۔ایل۔ڈی، نومبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۳۔۱۰۱۲)

یہ رجحان بڑھتے بڑھتے اب جسٹس محمد شفیع صاحب کے زیر تبصرہ فیصلے میں ایک قطعی واضح اور انتہائی صورت تک پہنچ گیا ہے اور منکرین حدیث کا گروہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس لیے ہم ناگزیر سمجھتے ہیں کہ تفصیل کے ساتھ اس فیصلے کا علمی جائزہ لیا جائے اور ملک کے حکام عدالت اور قانون دان اصحاب کو اس طرز

فکر کی کمزوریوں سے آگاہ کر دیا جائے۔ جس مقدمے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے' اس کے واقعات سے ہمیں قطعاً کوئی بحث نہیں ہے' اور اس میں جو حکم فاضل جج نے صادر کیا ہے' اس پر بھی ہم کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ ہماری بحث صرف ان اصولی مسائل تک محدود ہے جو اس فیصلے میں قرآن اور سنت اور فقہ کی پوزیشن کے متعلق چھیڑے گئے ہیں۔

دو اصولی سوالات

اس سلسلے میں قبل اس کے کہ ہم اصل فیصلے پر تبصرہ شروع کریں' دو اصولی سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں:

پہلا سوال عدالت کے اختیارات سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلامی قانون سے متعلق چودہ صدیوں سے یہ بات تمام دنیا کے مسلمانوں میں مسلم چلی آ رہی ہے کہ قرآن کے بعد اس کا دوسرا ماخذ سنت رسول ہے۔ ان طول صدیوں کے دوران میں اس قانون پر جس قابل ذکر مصنف نے بھی کچھ لکھا ہے' خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم' اس نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اندر کسی ایسے مذہب فکر (School of thought) کسی ایسے فقیہ (Jurist) کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا۔ جس کی پیروی مسلمانوں کی کسی قابل لحاظ تعداد نے اختیار کی ہو' اور وہ سنت کے ماخذ قانون ہونے کا انکار کرتا ہو۔ متحدہ ہندوستان میں جو اینگلو محمڈن لاء رائج رہا ہے' اس کے اصولوں میں بھی ہمیشہ یہ چیز مسلم رہی ہے۔ اور ہمارے علم میں آج تک کسی مجلس قانون ساز کا بھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں آیا ہے جس کی رو سے اسلامی قانون کے اصولوں میں یہ بنیادی رد و بدل کیا گیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت حال میں کوئی منفرد جج' یا کوئی ہائی کورٹ' بلکہ خود سپریم کورٹ بھی قانون میں یہ اصولی تبدیلی کر دینے کا مجاز ہے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے عدالت کوئی مستقل بالذات قانون

ساز ادارہ نہیں ہے۔ جن اصولوں پر ہمارے ملک کا نظام عدل و آئین مبنی ہے' ان کی رو سے عدالتیں اس قانون پر کام کرنے کی پابند ہیں جو ان کو قانون ساز ادارے کی طرف سے دیا جائے۔ وہ قانون کی تعبیر ضرور کر سکتی ہیں اور اس نظام میں ان کی تعبیر کو بلاشبہ قانونی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ہمارے علم میں آج تک یہ بات نہیں آئی ہے کہ انہیں بجائے خود قانون یا اس کے مسلمہ اصولوں میں رد و بدل کر دینے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ اختیار عدالتوں کو کب اور کہاں سے حاصل ہوا ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ قانون میں اس طرح کی اصولی تبدیلی کا مجاز آخر ہے کون؟ اس وقت تک مملکت پاکستان کے متعلق دعویٰ یہی ہے کہ یہ مملکت جمہوریت کے اصول پر قائم ہوئی ہے اور جمہوریت کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر اس میں باشندوں کی اکثریت کا منشا حکمراں نہ ہو۔ اب اگر پاکستان کے مسلمان باشندوں سے کوئی استصواب عام کرایا جائے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ۹۹۹۹ فی دس ہزار سے بھی زیادہ اکثریت اس عقیدے کا اظہار کرے گی کہ قرآن کے بعد سنت رسولؐ اسلامی قانون کی لازمی بنیاد ہے' اور وہ لوگ شاید پوری طرح دس ہزار میں ایک بھی نہ ہوں گے جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال جب تک موجود ہے' کیا اسلامی قانون کے ماخذ میں سے سنت کا اسقاط کر دینا کسی حاکم عدالت کے اختیار میں ہے؟ یا کوئی حکومت ایسا کر سکتی ہے؟ یا کوئی قانون ساز ادارہ اس کا مجاز ہے؟ ان سوالات کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا تھا اگر یہاں کسی خاص طبقے کی آمریت قائم ہوتی۔ لیکن جمہوری اصول پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ کوئی شخص ان کا جواب اثبات میں کیسے دے سکتا ہے۔ جس وقت تک یہاں جمہوریت کی قطعی نفی نہیں ہو جاتی' کسی

ذی اختیار شخص کو اپنے اختیارات اپنی ذاتی آراء کے مطابق استعمال کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ وہ انہیں اس قانون ہی کے مطابق استعمال کر سکتا ہے جو یہاں اکثریت کی مرضی سے نافذ ہے۔ حکام میں سے جو اصحاب اپنے کچھ زیادہ پرزور خیالات رکھتے ہوں' ان کے لیے سیدھا راستہ یہ کھلا ہوا ہے کہ مستعفی ہو کر اپنی پوری علمی قابلیت عامہ مسلمین کا عقیدہ تبدیل کرنے میں صرف کریں۔ لیکن جب تک وہ کسی بااختیار منصب پر فائز ہیں' وہ اس تبدیلی کے لیے اپنے اختیارات استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ جمہوریت کا کھلا ہوا منطقی تقاضا ہے۔ اس سے انکار کے لیے کسی کے پاس اگر کچھ دلائل ہوں تو ہم انہیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

مذکورۂ بالا دونوں اصولی مسائل کے متعلق جو نقطہ نظر ہم نے اوپر پیش کیا ہے' اس کو اگر درست تسلیم کیا جائے تو عدالت کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ گزارش کریں گے کہ فاضل جج کے لیے اپنے ان مخصوص خیالات کو اپنے ایک عدالتی فیصلے میں بیان کرنا مناسب نہ تھا۔ وہ ان کو اپنی شخصی حیثیت میں ایک مضمون کے طور پر تحریر فرماتے اور کسی رسالے میں شائع کرا دیتے تو چنداں قابل اعتراض نہ ہوتا۔ اس صورت میں زیادہ آزادی کے ساتھ ان پر بحث ہو سکتی تھی بغیر اس کے کہ احترام عدالت کسی کے لیے آزادی تنقید میں مانع ہو۔

فقہ حنفی کی اصل حیثیت

اب ہم اس فیصلے کے اصولی مباحث پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں جیسا کہ اس کے مطالعہ سے ناظرین کے سامنے آ چکا ہے۔ یہ حضانت کے ایک مقدمہ کا فیصلہ ہے۔ اس سلسلے میں حضانت کے متعلق فقہ حنفی کے قواعد کا حوالہ دیتے ہوئے فاضل جج یہ فرماتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے دور میں پریوی کونسل تک تمام عدالتیں ان قواعد کی پوری پابندی کرتی رہی ہیں' اور اس کی وجہ ان کی رائے میں یہ ہے کہ:

"مسلمان قانون دان یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز یا دوسرے غیر مسلم

اپنے مقصد کے مطابق قرآن پاک کی تفسیر و تعبیر کریں اور قوانین بنائیں۔ مسلم قانون سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات میں فتاوائے عالمگیری کو جو اہمیت دی گئی ہے وہ اسی حقیقت کی صاف نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن اب حالات بالکل بدل چکے ہیں"۔ (پیراگراف نمبر ۴)

پھر حضرات کے حنفی قانون کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہ دوبارہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ:

"کیا کسی درجہ کی قطعیت کے ساتھ ان قواعد کو اسلامی قانون کہا جا سکتا ہے جسے وہی لزوم کا مرتبہ حاصل ہو جو ایک کتاب آئین میں درج شدہ قانون کو حاصل ہوتا ہے؟" (پیراگراف ۷)

ہمارے خیال میں یہ رائے ظاہر کرتے وقت فاضل جج کی نگاہ ان تمام اسباب پر نہیں تھی جن کی بنا پر حنفی قانون نہ صرف انگریزی دور میں اور نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ تیسری صدی ہجری سے دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصے میں اسلامی قانون مانا جاتا رہا ہے۔ انہوں نے اس کے ایک بہت ہی خفیف سے جزوی سبب کا نوٹس لیا ہے' اور اسی بنا پر ان کا یہ ارشاد بھی صحیح صورت واقعہ کی ترجمانی نہیں کرتا کہ "اب حالات بالکل بدل چکے ہیں"۔

اسلامی قانون کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ خلافت راشدہ کی جگہ شاہی طرز حکومت قائم ہو جانے سے اسلامی نظام قانون میں ایک بڑا خلا رونما ہو گیا تھا جو ایک صدی سے زیادہ مدت تک موجود رہا۔ خلافت راشدہ میں "شوریٰ" ٹھیک وہی کام کرتی تھی جو موجودہ زمانہ میں ایک مجلس قانون ساز کا کام ہوتا ہے۔ مسلم مملکت میں جو جو مسائل بھی ایسے پیش آتے تھے جن پر ایک واضح قانونی حکم کی ضرورت ہوتی تھی' خلیفہ کی مجلس شوریٰ ان پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں اجتماعی فکر و اجتہاد سے کام لے کر فیصلے کرتی تھی اور وہی فیصلے پوری مملکت میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہوتے تھے۔ قرآن مجید

کے کسی فرمان کی تعبیر میں اختلاف ہو' یا سنت رسولؐ کی تحقیق میں' یا کسی نئے پیش آمدہ مسئلے پر اصول شریعت کی تطبیق میں' مجلس شوریٰ کے سامنے ایسا ہر اختلاف ہر وقت پیش ہو جاتا تھا۔ خلافت راشدہ کی اس مجلس کو یہ حیثیت محض سیاسی طاقت کے بل پر حاصل نہ تھی' بلکہ اس کی اصل وجہ وہ اعتماد تھا جو عام مسلمان خلیفہ اور اس کے اہل شوریٰ کی خدا ترسی' دیانت' خلوص اور علم دین پر رکھتے تھے۔

جب یہ نظام باقی نہ رہا اور شاہی حکومتوں نے اس کی جگہ لے لی تو فرمانروا اگرچہ مسلمان تھے اور ان کے اعیان حکومت اور اہل دربار بھی مسلمان ہی تھے' لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ جرات نہ کر سکا کہ مسائل و معاملات میں خلفائے راشدین کی طرح فیصلے دیتا' کیونکہ وہ خود جانتے تھے کہ انہیں عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل نہیں ہے اور ان کے فیصلے قانون اسلام کا جز نہیں بن سکتے۔ وہ اگر خلفائے راشدین کی شوریٰ کے مانند عام مسلمانوں کے معتمد اہل علم و تقویٰ کی ایک مجلس بناتے اور اس کو وہی آئینی حیثیت دیتے جو اس شوریٰ کو حاصل تھی' تو ان کی بادشاہی نہ چل سکتی تھی۔ اور اگر وہ اپنے مطلب کے لوگوں کی مجلس شوریٰ بنا کر فیصلے صادر کرنے شروع کر دیتے تو مسلمان ان کے فیصلوں کو شرعی فیصلے ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایسے فیصلے طاقت کے ذریعہ سے مسلط کیے جا سکتے تھے' لیکن انہیں مسلط کرنے والی طاقت جب بھی ہٹتی وہ فیصلے اسی جگہ پھینک دیئے جاتے جہاں ان کے نافذ کرنے والے گئے تھے۔ ان کا ایک مستقل جزو شریعت بن کر رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

اس حالت میں اسلامی نظام قانون کے اندر ایک خلا پیدا ہو گیا۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں مسائل و معاملات کے جو فیصلے اجماعی طور پر ہو گئے تھے' وہ تو پوری مملکت کا قانون رہے' لیکن اس کے بعد پیش آنے والے مسائل و معاملات میں ایسا کوئی ادارہ موجود نہ رہا جو قرآن کی تعبیر اور سنت کی تحقیق اور قوت اجتہادیہ کے استعمال سے ایک فیصلہ دیتا اور وہ مملکت کا قانون قرار پاتا۔ اس دور

میں مختلف قاضی اور مفتی اپنے اپنے طور پر جو فتوے اور فیصلے دیتے رہے' وہ ان کے دائرۂ اثر و اختیار میں نافذ ہوتے رہے۔ ان متفرق فتاویٰ اور فیصلوں سے مملکت میں ایک قانونی طوائف الملوکی پیدا ہو گئی۔ کوئی ایک قانون نہ رہا جو یکسانی کے ساتھ تمام عدالتوں میں نافذ ہوتا اور جس کے مطابق تمام انتظامی محکمے کام کرتے۔ منصور عباسی کے عہد میں ابن المقفع نے اس طوائف الملوکی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا' اور خلیفہ کو مشورہ دیا کہ وہ خود اس خلا کو بھرنے کی کوشش کرے لیکن خلیفہ اپنی حیثیت کو خود جانتا تھا۔ وہ کم از کم اتنا برخود غلط نہ تھا جتنے آج کل کے ڈکٹیٹر حضرات ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ جو قانون اس کی صدارت میں اس کے نامزد کیے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں بنیں گے اور اس کے امضاء (Sanction) سے نافذ ہوں گے انہیں کتنے مسلمان شریعت کے احکام مان لیں گے۔

قریب قریب ایک صدی اس حالت پر گزر چکی تھی کہ امام ابو حنیفہ اس خلا کو بھرنے کے لیے آگے بڑھے۔ انہوں نے کسی سیاسی طاقت اور کسی آئینی حیثیت کے بغیر اپنے تربیت کردہ شاگردوں کی ایک غیر سرکاری مجلس قانون ساز (Legislature Private) بنائی۔ اس میں قرآن کے احکام کی تعبیر' سنتوں کی تحقیق' سلف کے اجماعی فیصلوں کی تلاش و جستجو' صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے فتاویٰ کی جانچ پڑتال اور معاملات و مسائل پر اصول شریعت کی تطبیق کا کام بڑے وسیع پیمانے پر کیا گیا اور پچیس تیس سال کی مدت میں اسلام کا پورا قانون مدون کر کے رکھ دیا گیا۔ یہ قانون کسی بادشاہ کی رضا سے مدون نہیں کیا گیا تھا۔ کوئی طاقت اس کی پشت پر نہیں تھی جس کے زور سے یہ نافذ ہوتا۔ لیکن پچاس برس بھی نہ گزرے تھے کہ یہ سلطنت عباسیہ کا قانون بن گیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کو ان لوگوں نے مرتب کیا تھا جن کے متعلق عام مسلمانوں کو یہ اعتماد تھا کہ وہ عالم بھی ہیں اور متقی و محتاط بھی' وہ قرآن اور سنت کو ٹھیک ٹھیک سمجھتے اور جانتے ہیں' صحیح اسلامی ذہن رکھتے ہیں' غیر اسلامی افکار و نظریات سے متاثر نہیں ہیں اور اسلامی قانون کی

تدوین میں اپنے یا کسی کے ذاتی مفادات' رجحانات یا خواہشات کو ذرہ برابر دخل دینے والے نہیں ہیں۔ مسلمان ان پر پورا اطمینان رکھتے تھے کہ یہ تحقیق و اجتہاد کے بعد شریعت کا جو حکم بھی بیان کریں گے' ان میں بشری غلطی تو ہو سکتی ہے' مگر بے ڈھب اور بے لگام اجتہاد یا اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش کا ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس خالص اخلاقی طاقت کا یہ کرشمہ تھا کہ پہلے بلاد مشرق کے عام مسلمانوں نے آپ سے آپ اس کو اسلام کا قانون مان لیا اور اپنے معاملات میں بطور خود اس کی پیروی شروع کر دی۔ پھر سلطنت عباسیہ کو اسے تسلیم کر کے ملک کا قانون قرار دینا پڑا۔ اس کے بعد وہی قانون اپنی اسی طاقت سے مغرب میں ترکی سلطنت کا اور مشرق میں ہندوستان کی مسلم حکومت کا قانون بنا۔ا

بعد کی بہت سی صدیوں میں یہ قانون اسی مقام پر کھڑا نہیں رہا۔ جہاں امام ابو حنیفہ نے اسے چھوڑا تھا' بلکہ ہر صدی میں اس کے اندر بہت سی ترمیمات بھی ہوئی ہیں' اور بہت سے نئے مسائل کے فیصلے بھی اس میں ہوتے رہے ہیں' جیسا کہ کتب ظاہر الروایہ اور بعد کی کتب فتاویٰ کے تقابل سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن یہ بعد کا سارا کام بھی حکومت کے ایوانوں سے باہر مدرسوں اور دار الافتاؤں میں ہی

ا۔ امام ابو حنیفہؒ کے بعد تدوین قانون اسلامی کا دوسرا کارنامہ امام مالکؒ نے انجام دیا اور وہ بھی محض اپنی اخلاقی طاقت کے زور سے اندلس اور شمالی افریقہ کی مسلم ریاستوں کا قانون بن گیا۔ پھر امام شافعیؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبل نے خالص غیر سرکاری حیثیت میں قوانین اسلامی کی تدوین کی اور یہ دونوں بھی محض عام مسلمانوں کی رضا سے متعدد مسلمان ریاستوں کے قوانین قرار پا گئے۔ اسی طرح زیدی اور جعفری فقہیں بھی اشخاص نے اپنی پرائیویٹ حیثیت میں مرتب کیں اور وہ بھی صرف اپنی اخلاقی طاقت سے شیعہ ریاستوں کا قانون بنیں۔ پھر اہل حدیث کے مسلک پر جو فقہی احکام مرتب ہوئے ان کو بھی کسی سیاسی اثر کے بغیر لاکھوں مسلمانوں نے اپنی زندگی کا قانون اپنی مرضی سے بنایا بغیر اس کے کہ کوئی جبران کی پشت پر ہوتا۔

ہوتا رہا' کیونکہ مسلمان بادشاہوں اور ان کے مسلمان امراء و حکام کے علم و تقویٰ پر مسلمان عوام کوئی اعتماد نہ رکھتے تھے' انھیں صرف خدا ترس علماء پر ہی اعتماد تھا اس لیے انہی کے فتوے اس قانون کے جز بنتے رہے اور انہی کے ہاتھوں اس کا ارتقاء ہوتا رہا۔ ایک دو مثالوں کو چھوڑ کر اس پورے زمانے میں کسی بددماغ سے بددماغ بادشاہ کو بھی اپنے متعلق یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں ایک قانون بناؤں گا اور مسلمان اسے شریعت مان لیں گے۔ اورنگ زیب جیسے پرہیزگار فرمانروا نے بھی وقت کے نامور علماء ہی کو جمع کیا۔ جنھیں مسلمان دینی حیثیت سے بھروسے کے قابل سمجھتے تھے' اور ان کے ذریعہ سے اس نے فقہاء حنفیہ ہی کے فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کرا کے اس کو قانون قرار دیا۔

اس بحث سے تین باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں:

ایک یہ کہ فقہ حنفی' جو انگریزوں کی آمد سے صدیوں پہلے سے مشرقی مسلمان مملکتوں کا قانون تھی اور جسے آکر انگریز بھی اپنے پورے دور میں کم از کم پرسنل لاء کی حد تک مسلمانوں کا قانون تسلیم کرتے رہے' دراصل مسلمانوں کی عام رضا اور پسند سے قانون قرار پائی تھی۔ اس کو کسی سیاسی طاقت نے نافذ (Enforce) نہیں کیا تھا بلکہ ان ممالک کے جمہور مسلمین اسی کو اسلامی قانون مان کر اس کی پیروی کرتے تھے اور حکومتوں نے اسے اس لیے قانون مانا کہ ان ملکوں کے عام مسلمان اس کے سوا کسی دوسری چیز کی پیروی قلب و ضمیر کے اطمینان کے ساتھ نہ کر سکتے تھے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان جس طرح انگریزی دور میں اپنا دین اور اپنی شریعت انگریزوں اور دوسرے غیر مسلموں کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہ تھے' اسی طرح وہ بنی امیہ کے زمانے سے لے کر آج تک کبھی ایسے مسلمانوں کے ہاتھ میں بھی انھیں دینے کے لیے تیار نہیں رہے ہیں جن کے علم دین اور تقویٰ اور احتیاط پر ان کو اطمینان نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ اب حالات بالکل کیا معنی' بالجز بھی نہیں بدلے ہیں۔ انگریزوں

کی جگہ بس مسلمانوں کا کرسی نشین ہو جانا بجائے خود اپنے اندر کوئی جوہری فرق نہیں رکھتا۔ خلافت راشدہ کے بعد جو خلاء پیدا ہوا تھا' مسلمان حکومتوں کی حد تک وہ اب بھی جوں کا توں باقی ہے' اور وہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک ہمارا نظام تعلیم ایسے خدا ترس فقیہ پیدا نہ کرنے لگے جن کے علم و تقویٰ پر مسلمان اعتماد کر سکیں' اور ہمارا نظام سیاست ایسا نہ بن جائے کہ اس طرح کے معتمد علیہ اصحاب ہی ملک میں قانون سازی کے منصب پر فائز ہونے لگیں۔ اگر اس ملک میں ہمیں قوم کے ضمیر اور قانون کے درمیان تضاد اور تصادم پیدا کرنا نہیں ہے تو جب تک یہ خلاء واقعی صحیح طریقہ سے بھر نہ جائے' اسے خام مواد سے بھرنے کی کوئی کوشش نہ کرنی چاہیے۔

فاضل جج کے بنیادی تصورات

اس کے بعد پیراگراف ۸ سے ۱۶ تک فاضل جج نے اسلامی قانون کے متعلق اپنے کچھ تصورات بیان فرمائے ہیں جو علی الترتیب حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام کی رو سے جو قانون ایک مسلمان پر اس کی زندگی کے ہر شعبے میں حکمران ہونا چاہیے' خواہ وہ اس کی زندگی کا مذہبی شعبہ ہو یا سیاسی' یا معاشرتی یا معاشی' وہ صرف خدا کا قانون ہے۔

(۲) قرآن نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں ان کے اندر مسلمانوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔

(۳) چونکہ قانون انسانی آزادی پر پابندی عائد کرنے والی طاقت ہے اس لیے خدا نے قانون سازی کے اختیارات پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ اسلام میں کسی شخص کو اس طرح کام کرنے کا اختیار نہیں ہے کہ گویا وہ دوسروں سے بالاتر ہے۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طرز عمل یہ تھا کہ جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے۔ اسلام کا عقیدہ عین

اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر برتری کی نفی کرتا ہے' وہ اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل کی راہ دکھاتا ہے۔

(۵) اس دنیا میں چونکہ انسانی حالات اور مسائل بدلتے رہتے ہیں' اس لیے اس بدلتی ہوئی دنیا کے اندر مستقل' ناقابل تغیر و تبدل احکام و قوانین نہیں چل سکتے۔ خود قرآن بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے مختلف معاملات میں چند وسیع اور عام قاعدے انسانی ہدایت کے لیے دے دیئے ہیں۔

(۶) قرآن سادہ اور آسان زبان میں ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اس کا پڑھنا اور سمجھنا ایک دو آدمیوں کا مخصوص حق نہیں ہے۔ تمام مسلمان اگر چاہیں تو اسے سمجھ سکتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ یہ حق تمام مسلمانوں کو دیا گیا ہے اور کوئی اسے ان سے سلب نہیں کر سکتا' خواہ وہ کیسا ہی عالی مرتبہ اور کیسا ہی فاضل کیوں نہ ہو۔

(۷) قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے میں یہ بات خود متضمن ہے کہ آدمی اس کی تعبیر کرے اور اس کی تعبیر کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی اس کو وقت کے حالات پر اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضروریات پر منطبق کرے۔

(۸) امام ابو حنیفہ' امام شافعی' امام مالک اور قدیم زمانے کے دوسرے مفسرین نے قرآن کی جو تعبیریں کی تھیں وہ آج کے زمانہ میں جوں کی توں نہیں مانی جا سکتیں۔ سوسائٹی کے بدلتے ہوئے حالات پر قرآن کے عام اصولوں کو منطبق کرنے کے لیے ان کی دانشمندانہ تعبیر کرنی ہو گی' اور ایسے طریقے سے تعبیر کرنی ہو گی کہ لوگ اپنی تقدیر اور اپنے خیالات اور اخلاقی تصورات کی تشکیل اس کے مطابق کر سکیں اور اپنے ملک اور زمانے کے لیے موزوں ترین طریقے پر کام کر سکیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح مسلمان بھی عقل اور ذہانت رکھتے ہیں اور یہ طاقت استعمال کرنے ہی کے لیے دی گئی ہے۔ تمام مسلمانوں کو قرآن پڑھنا اور اس کی

تعبیر کرنا ہو گا۔

(۹) قرآن کو سمجھنے اور اس کے مدعا کو پانے کی سخت کوشش ہی کا نام اجتہاد ہے۔ قرآن سب مسلمانوں سے' نہ کہ ان کے کسی خاص طبقے سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ اس کا علم حاصل کریں' اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس کی تعبیر کریں۔

(۱۰) اگر ہر شخص انفرادی طور پر بطور خود قرآن کی تعبیر کرے تو بے شمار مختلف تعبیرات وجود میں آ جائیں گی جن سے سخت بدنظمی کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح جن معاملات میں قرآن ساکت ہے' اگر ان کے بارے میں ہر شخص کو ایک قاعدہ بنا لینے اور ایک طرز عمل طے کر لینے کا اختیار ہو تو ایک پراگندہ اور غیر مربوط سوسائٹی پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بڑی تعداد کی رائے کو نافذ ہونا چاہیے۔

(۱۱) ایک آدمی یا چند آدمی فطرتاً عقل اور قوت میں ناقص ہوتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی طاقتور اور ذہین ہو' اس کے کامل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لاکھوں کروڑوں آدمی' جو اجتماعی زندگی ایک نظم کے ساتھ بسر کر رہے ہیں' اپنی اجتماعی ہیئت میں افراد کی بہ نسبت زیادہ عقل اور طاقت رکھتے ہیں۔ قرآن کی رو سے بھی کتاب اللہ کی تعبیر اور حالات پر اس کے عام اصولوں کا انطباق ایک آدمی یا چند آدمیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ یہ کام مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہیے۔

(۱۲) قانون سے مراد وہ ضابطہ ہے جس کے متعلق لوگوں کی اکثریت یہ خیال کرتی ہو کہ لوگوں کے معاملات اس کے مطابق چلنے چاہئیں۔ کئی کروڑ باشندوں کے ایک ملک میں باشندوں کی اکثریت کو قرآن کی ان آیات کی' جن کے اندر دو یا زائد تعبیروں کی گنجائش ہو' ایک ایسی تعبیر کرنی چاہیے جو ان کے حالات کے لیے موزوں ترین ہو۔ اور اسی طرح انہیں قرآن کے عام اصولوں کو حالات موجودہ پر منطبق کرنا چاہیے تاکہ فکر و عمل میں یکسانی و وحدت پیدا ہو سکے۔ اسی طرح یہ اکثریت کا

کام ہے کہ ان مسائل و معاملات میں' جن پر قرآن ساکت ہے' کوئی قانون بنائے۔

(۱۳) قدیم زمانے میں تو شاید یہ درست تھا کہ اجتہاد کو چند فقہاء تک محدود کر دیا جائے کیونکہ لوگوں میں آزادانہ اور عمومیت کے ساتھ علم نہیں پھیلایا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں یہ فریضہ باشندوں کے نمائندوں کو انجام دینا چاہئے' کیونکہ قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے عام اصولوں کو حالات پر منطبق کرنا ایک یا دو اشخاص کا مخصوص استحقاق نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا فرض اور حق ہے اور یہ کام ان لوگوں کو انجام دینا چاہئے جنہیں عام مسلمانوں نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہو۔

تصورات مذکورہ پر تنقید

اوپر کے تیرہ فقروں میں ہم نے اپنی حد تک پوری کوشش کی ہے کہ فاضل جج کے تمام بنیادی نظریات کا ایک صحیح خلاصہ بیان کر دیں۔ ان کی زبان اور سلسلہ وار ترتیب میں بھی ہم نے موصوف کی اپنی زبان اور منطقی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے' تا کہ ناظرین کے سامنے ان خیالات کی صحیح صورت آجائے جن پر آگے وہ اپنے فیصلے کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ان بنیادی نظریات میں چند باتیں قابل غور اور لائق تنقید ہیں۔

اولاً' فاضل جج کی نگاہ میں خدا کے قانون سے مراد صرف وہ قانون ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ سنت جو احکام و ہدایات دیتی ہے' انہیں وہ خدا کے قانون میں شمار نہیں کرتے۔ اوپر کے فقروں میں یہ بات مخفی ہے' لیکن آگے چل کر اپنے فیصلے میں وہ اس کی صراحت کرتے ہیں۔ اور اسی مقام پر ہم اس نقطہ نظر کی غلطی واضح کریں گے۔

ثانیاً' وہ جب کہتے ہیں کہ کسی انسان کو بھی دوسرے انسانوں پر برتری حاصل نہیں ہے' اور یہ کہ قرآن کو سمجھنا اور اس کی تعبیر کرنا چند انسانوں کا مخصوص حق نہیں ہے تو اس میں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شامل سمجھتے ہیں۔ یہ چیز بھی

مذکورۂ بالا فقرات میں نمایاں نہیں ہے۔ لیکن آگے چل کر اس کی تصریح انہوں نے خود کر دی ہے' لہٰذا ان کا یہ قاعدۂ کلیہ بھی محتاج تنقید ہے۔

ثالثاً" انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو ایک درجہ میں رکھ کر یہ فرمایا ہے کہ "جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے"۔ یہ بات قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ رسولؐ کی حیثیت اپنی نوعیت میں خلفائے راشدین سمیت تمام امراء مسلمین کی حیثیت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ حضورؐ کو ان کے زمرے میں رکھنا خود اس قرآن کے خلاف ہے جسے فاضل جج نے خدا کا قانون تسلیم کیا ہے۔ پھر ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ خلفائے راشدین کی طرح حضورؐ بھی جو کچھ کرتے تھے مسلمانوں کے مشورے سے کرتے تھے جن امور میں حضورؐ کو خدا کی طرف سے ہدایت ملتی تھی' ان میں آپ کا کام صرف حکم دینا اور مسلمانوں کا کام صرف اطاعت کرنا تھا۔ ان کے اندر مشورے کا کیا سوال' کسی مسلمان کو بولنے کا حق بھی نہ تھا اور خدا کی ہدایات حضورؐ کے پاس لازماً صرف قرآنی آیات ہی کی شکل میں نہیں آتی تھیں بلکہ وہ وحی غیر متلو کی شکل میں بھی آتی تھیں۔

رابعاً' فاضل جج نے عام مسلمانوں کے حق اجتہاد پر زور دینے کے بعد خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک منظم معاشرے میں انفرادی اجتہاد نہیں چل سکتا' قانون صرف وہی اجتہاد بنے گا جو اکثریت کے نمائندوں نے کیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ اکثریت کا چند آدمیوں کو منتخب کر کے اجتہاد کا اختیار دینا' اور اس کا چند آدمیوں پر اعتماد کر کے ان کے اجتہاد کو قبول کر لینا' ان دونوں میں آخر اصولاً کیا فرق ہے؟ اس ملک کی عظیم اکثریت نے اگر فقہائے حنفیہ پر اعتماد کر کے ان کی تعبیر قرآن و سنت اور ان کے اجتہاد کو اسلامی قانون مانا ہے تو فاضل جج خود اپنے بیان کردہ اصول کی رُو سے اس پر کیا اعتراض کر سکتے ہیں اور کیسے کر سکتے ہیں؟ ان پر تو مسلمانوں کے اعتماد کا یہ حال رہا ہے کہ جب اس قانون کو نافذ کرنے والی کوئی طاقت نہ رہی تھی

اور غیر مسلم برسراقتدار آچکے تھے' اس وقت بھی مسلمان اپنے گھروں میں اور اپنی شخصی و معاشرتی زندگی کے معاملات میں ان کے بیان کردہ قانون ہی کی پیروی کرتے رہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عام مسلمان کسی جبر کے بغیر خلوص دل کے ساتھ اور قلب و ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ اس کو صحیح قانون سمجھتے ہیں۔ کیا دنیا کی کسی پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو اس قدر زبردست جمہوری تائید حاصل ہونے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ اس کے مقابلے میں کسی ایک شخص کا' خواہ وہ ایک فاضل جج ہی کیوں نہ ہو' یہ استدلال کیا وزن رکھتا ہے کہ ان فقہاء کی تعبیریں آج کے زمانے میں نہیں مانی جا سکتیں؟ جسٹس محمد شفیع صاحب خود فرماتے ہیں کہ قانون وہ ہے جسے اکثریت مانے۔ سو اکثریت اس قانون کو مان رہی ہے۔ آخر کس دلیل سے ان کی انفرادی رائے اسے رد کر سکتی ہے؟

خامساً' فاضل جج ایک طرف خود تسلیم کرتے ہیں کہ قانون بنانا اور اس میں رد و بدل کرنا اکثریت کے نمائندوں کا کام ہے' افراد کا کام نہیں ہے' خواہ وہ بجائے خود کیسے ہی طاقتور اور ذہین ہوں۔ لیکن دوسری طرف انہوں نے خود ہی اکثریت کے تسلیم کردہ اصول قانون میں ترمیم بھی کی ہے' اور حضانت کے متعلق اکثریت کے مسلمہ قانون کو رد بھی کیا ہے۔ اگر یہ تضاد نہیں ہے تو ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہو گی کہ ان دونوں باتوں میں کس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے۔

اجتہاد کے چند نمونے

اس کے بعد پیراگراف ۱۶ تا ۲۰ میں فاضل جج نے خود قرآن مجید کی بعض آیات کی تعبیر کر کے اپنے اجتہاد کے چند نمونے پیش فرمائے ہیں جن سے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس زمانے میں قوت اجتہادیہ کو استعمال کر کے قرآن سے کس طرح احکام نکالے جانے چاہئیں۔

تعدد ازواج کے مسئلے میں فاضل جج کا اجتہاد

اس سلسلہ میں وہ سب سے پہلے سورۂ نساء کی تیسری آیت وان خفتم الا

تقسطوافی الیتمٰی فانکحوا ما طاب لکم من النسآء مثنٰی وثلاث ورباع کو لیتے ہیں جس کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ "اسے اکثر غلط استعمال کیا گیا ہے"۔

اس آیت پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے وہ پہلی بات یہ فرماتے ہیں کہ:

"قرآن پاک کے کسی حکم کا کوئی جزو بھی فضول یا بے معنی نہ سمجھا جانا چاہئے"۔

لیکن اس کے فوراً ہی بعد دوسرا فقرہ یہ ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ لوگوں کے منتخب نمائندوں کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں ایک قانون بنائیں کہ آیا ایک مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے' اور اگر کر سکتا ہے تو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ"۔

اس اجتہاد کی پہلی غلطی

تعجب ہے کہ فاضل جج کو اپنے ان دونوں فقروں میں تضاد کیوں نہ محسوس ہوا۔ پہلے فقرے میں جو اصولی بات انہوں نے خود بیان فرمائی ہے اس کی رو سے زیر بحث آیت کا کوئی لفظ زائد از ضرورت یا بے معنی نہیں ہے۔ اب دیکھیے' آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اس کے مخاطب افراد مسلمین ہیں۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ "اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے معاملہ میں تم انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو' دو دو سے' تین تین سے' اور چار چار سے' لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی سہی......"

ظاہر ہے کہ عورتوں کو پسند کرنا' ان سے نکاح کرنا اور اپنی بیویوں سے عدل کرنا یا نہ کرنا افراد کا کام ہے نہ کہ پوری قوم یا سوسائٹی کا۔ لہٰذا باقی تمام فقرے بھی جو بصیغہ جمع مخاطب ارشاد ہوئے ہیں' ان کا خطاب بھی لامحالہ افراد ہی سے ماننا پڑے گا۔ اس طرح یہ پوری آیت اول سے لے کر آخر تک دراصل افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں مخاطب کر رہی ہے' اور یہ بات انہی کی مرضی پر چھوڑ رہی ہے کہ اگر عدل کر سکیں تو چار کی حد تک جتنی عورتوں کو پسند کریں' ان سے نکاح کر

لیں' اور اگر یہ خطرہ محسوس کریں کہ عدل نہ کر سکیں گے تو ایک ہی پر اکتفا کریں۔ سوال یہ ہے کہ جب تک فانکحوا ما طاب لکم اور فان خفتم الا تعدلوا کے صیغہ خطاب کو فضول اور بے معنی نہ سمجھ لیا جائے' اس آیت کے ڈھانچے میں نمائندگان قوم کس راستے سے داخل ہو سکتے ہیں؟ آیت کا کون سا لفظ ان کے لیے مداخلت کا دروازہ کھولتا ہے؟ اور مداخلت بھی اس حد تک کہ وہی اس امر کا فیصلہ بھی کریں کہ ایک مسلمان دوسری بیوی کر بھی سکتا ہے یا نہیں' حالانکہ کر سکنے کا مجاز اسے اللہ تعالیٰ نے خود بالفاظ صریح کر دیا ہے' اور پھر "کر سکنے" کا فیصلہ کرنے کے بعد وہی یہ بھی طے کریں کہ "کن حالات میں اور کن شرائط کے مطابق کر سکتا ہے"۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز فرد کے اپنے انفرادی فیصلے پر چھوڑی ہے کہ اگر وہ عدل کی طاقت اپنے اندر پاتا ہو تو ایک سے زائد کرے ورنہ ایک ہی پر اکتفا کرے۔

دوسری غلطی

دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ "از راہ قیاس ایسی شادی کو (یعنی ایک سے زائد بیویوں کے ساتھ شادی کو) یتیموں کے فائدے کے لیے ہونا چاہئے"۔ وہی عام غلطی ہے جو اس آیت کا مطلب لینے میں جدید زمانے کے بعض لوگ کر رہے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ آیت میں چونکہ یتامیٰ کے ساتھ انصاف کا ذکر آگیا ہے' اس لیے لامحالہ ایک سے زائد بیویاں کرنے کے معاملہ میں کسی نہ کسی طرح یتامیٰ کا معاملہ بطور ایک لازمی شرط کے شامل ہونا چاہئے۔ حالانکہ اگر اس بات کو ایک قاعدہ کلیہ بنا لیا جائے کہ قرآن میں کسی خاص موقع پر جو حکم دیا گیا ہو' اور اس موقع کا ذکر بھی ساتھ ساتھ کر دیا گیا ہو' وہ حکم صرف اسی موقع کے لیے خاص ہو گا' تو اس سی بڑی قباحتیں لازم آئیں گی۔ مثلاً عرب کے لوگ اپنی لونڈیوں کو پیشہ کمانے پر زبردستی مجبور کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی ممانعت ان الفاظ میں فرمائی کہ لا تکرھوا فتیٰتکم علی البغآء ان اردن تحصنا (النور: ۳۳) "اپنی لونڈیوں

کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ بچی رہنا چاہتی ہوں"۔ کیا یہاں از قیاس یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ حکم صرف لونڈیوں سے متعلق ہے' اور یہ کہ لونڈی اگر خود بدکار رہنا چاہتی ہو تو اس سے پیشہ کرایا جا سکتا ہے؟

دراصل اس طرح کی قیود کا واقعاتی پس منظر جب تک نگاہ میں نہ ہو' آدمی قرآن مجید کی ایسی آیات کو' جن میں کوئی حکم بیان کرتے ہوئے کسی خاص حالت کا ذکر کیا گیا ہے' ٹھیک نہیں سمجھ سکتا۔ آیت ولن خفتم الا تقسطوافی الیتمیٰ کا واقعاتی پس منظر یہ ہے کہ عرب میں اور قدیم زمانے کی پوری سوسائٹی میں' صدہا برس سے تعدد ازواج مطلقاً مباح تھا۔ اس کے لیے کوئی نئی اجازت دینے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہ تھی' کیونکہ قرآن کا کسی رواج عام سے منع نہ کرنا خود ہی اس رواج کی اجازت کا ہم معنی تھا۔ اس لیے فی الحقیقت یہ آیت تعدد ازواج کی اجازت دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی' بلکہ جنگ احد کے بعد جو بہت سی عورتیں کئی کئی بچوں کے ساتھ بیوہ رہ گئی تھیں' ان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ اس میں مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ اگر شہدائے احد کے یتیم بچوں کے ساتھ تم یوں انصاف نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے ایک سے زائد بیویاں کرنے کا دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا ہے' ان کی بیوہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان کے ساتھ نکاح کر لو تاکہ ان کے بچے تمہارے اپنے بچے بن جائیں اور تمہیں ان کے مفاد سے ذاتی دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اس سے یہ نتیجہ کسی منطق کی رو سے بھی نہیں نکالا جا سکتا کہ تعدد ازواج صرف اسی حالت میں جائز ہے جبکہ یتیم بچوں کی پرورش کا مسئلہ درپیش ہو۔ اس آیت نے اگر کوئی نیا قانون بنایا ہے تو وہ تعدد ازواج کی اجازت دینا نہیں ہے' کیونکہ اس کی اجازت تو پہلے ہی تھی اور معاشرے میں ہزاروں برس سے اس کا رواج موجود تھا' بلکہ دراصل اس میں جو نیا قانون دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ بیویوں کی تعداد پر چار کی قید لگا دی گئی ہے جو پہلے نہ تھی۔

تیسری غلطی

تیسری بات فاضل جج یہ فرماتے ہیں کہ "اگر ایک مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کروں گا کیونکہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا' تو ۸ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی' تمدنی اور سیاسی حالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کا کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے"۔ اس عجیب طرز استدلال کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرے گا تو وہ اس آزادی کو استعمال کرتا ہے جو اسکی خانگی زندگی کے بارے میں خدا نے اسے دی ہے۔ وہ اس آزادی کو شادی نہ کرنے کے بارے میں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے' بیوی مر جائے تو دوسری شادی کرنے یا نہ کرنے میں بھی استعمال کر سکتا ہے' اور کسی وقت اس کی رائے بدل جائے تو ایک سے زائد بیویاں کرنے کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے لیکن جب قوم تمام افراد کے بارے میں کوئی مستقل قانون بنا دے گی تو فرد سے اس کی وہ آزادی سلب کر لے گی جو خدا نے اسے دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسی قیاس پر کیا قوم کسی وقت یہ فیصلہ کرنے کی بھی مجاز ہے کہ اس کے آدھے افراد شادی کریں اور آدھے نہ کریں؟ یا جس کی بیوی یا شوہر مر جائے وہ نکاح ثانی نہ کرے؟ ہر آزادی جو افراد کو دی گئی ہے اسے بنائے استدلال بنا کر قوم کو یہ آزادی دینا کہ وہ افراد سے ان کی آزادی سلب کرے' ایک منطقی مغالطہ تو ہو سکتا ہے' مگر ہمیں یہ نہیں معلوم کہ قانون میں یہ طرز استدلال کب سے مقبول ہوا ہے۔

تاہم تھوڑی دیر کے لیے ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت' مثلاً ان میں ۴ کروڑ ایک ہزار مل کر ایسا کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے صرف چند ہزار مل کر اپنی ذاتی رائے سے اس طرح کا کوئی قانون تجویز کریں اور اکثریت کی رائے کے خلاف

اسے مسلط کر دیں تو فاضل جج کے بیان کردہ اصول کی رو سے اس کا کیا جواز ہو گا؟ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی آبادی میں سے ایک لاکھ' بلکہ پچاس ہزار کا بھی نقطہ نظر یہ نہیں ہے کہ قوم کی معاشی' تمدنی اور سیاسی حالت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا تو قانوناً ممنوع ہو' البتہ اس کا "گرل فرینڈس" سے آزادانہ تعلق' یا طوائفوں سے ربط و ضبط' یا مستقل داشتہ رکھنا ازروئے قانون جائز رہے۔ خود وہ عورتیں بھی' جن کے لیے سوکن کا تصور ہی تکلیف دہ ہے' کم ہی ایسی ہوں گی جن کے نزدیک ایک عورت سے ان کے شوہر کا نکاح ہو جائے تو ان کی زندگی ستی سے بدتر ہو جائے گی' لیکن اسی عورت سے ان کے شوہر کا ناجائز تعلق رہے تو ان کی زندگی جنت کا نمونہ بنی رہے گی۔

چوتھی غلطی

پھر فاضل جج فرماتے ہیں:

"اس آیت کو قرآن کی دوسری دو آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ ان میں سے پہلی آیت سورۂ نور نمبر ۳۳ ہے جس میں طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کرنے کے ذرائع نہ رکھتے ہوں' ان کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک شخص کو ایک بیوی کرنے سے روکا جا سکتا ہے تو انہی وجوہ یا ایسے ہی وجوہ کی بنا پر اسے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے روک دیا جانا چاہیے"۔

یہاں پھر موصوف نے خود اپنے بیان کردہ اصول کو توڑ دیا ہے۔ آیت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

وليستعفف الذين لا يجدون نكاحا حتى يغنيهم الله من فضله

"اور عفت مآبی سے کام لیں وہ لوگ جو نکاح کا موقع نہیں پاتے یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے"۔

ان الفاظ میں یہ مفہوم کہاں سے نکلتا ہے کہ ایسے لوگوں کو نکاح نہ کرنا

چاہیے؟ اگر قرآن کی کسی آیت کے الفاظ کو "فضول اور بے معنی" سمجھنا درست نہیں ہے تو نکاح سے منع کر دینے کا تصور اس آیت میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ جب تک اللہ نکاح کے ذرائع فراہم نہ کر دے اس وقت تک مجرد لوگ عفت مآب بن کر رہیں۔ بدکاریاں کر کے نفس کی تسکین نہ کرتے پھریں۔ تاہم اگر کسی نہ کسی طرح نکاح سے منع کر دینے کا مفہوم ان الفاظ میں داخل کر بھی دیا جائے' پھر بھی اس کا روئے سخن فرد کی طرف ہے' نہ کہ قوم یا ریاست کی طرف۔ یہ بات فرد کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ کب وہ اپنے آپ کو شادی کر لینے کے قابل پاتا ہے اور کب نہیں پاتا' اور اسی کو یہ ہدایت کی گئی ہے (اگر فی الواقع ایسی کوئی ہدایت کی بھی گئی ہے) کہ جب تک وہ نکاح کے ذرائع نہ پائے' نکاح نہ کرے۔ اس میں ریاست کو یہ حق کہاں دیا گیا ہے کہ وہ فرد کے اس ذاتی معاملہ میں دخل دے اور یہ قانون بنا دے کہ کوئی شخص اس وقت تک نکاح نہ کرنے پائے جب تک وہ ایک عدالت کے سامنے اپنے آپ کو ایک بیوی اور گنتی کے چند بچوں کی (جن کی تعداد مقرر کر دینے کا حق بھی فاضل جج کی رائے میں یہی آیت ریاست کو عطا کرتی ہے) پرورش کے قابل ثابت نہ کر دے؟ آیت کے الفاظ اگر "فضول اور بے معنی" نہیں ہیں تو اس معاملہ میں ریاست کی قانون سازی کا جواز ہمیں بتایا جائے کہ اس کے کس لفظ سے نکلتا ہے؟ اور اگر نہیں نکلتا تو اس آیت کی بنیاد پر مزید پیش قدمی کر کے ایک سے زائد بیویوں اور مقررہ تعداد سے زائد بچوں کے معاملہ میں ریاست کو قانون بنانے کا حق کیسے دیا جا سکتا ہے؟

پانچویں غلطی

دوسری آیت جسے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ کے ساتھ ملا کر پڑھنے اور اس سے ایک حکم نکالنے کی فاضل جج نے کوشش فرمائی ہے وہ سورۂ نساء کی آیت ۱۲۹ ہے۔ اس کا صرف حوالہ دینے پر انہوں نے اکتفاء نہیں فرمایا ہے' بلکہ اس کے

الفاظ انہوں نے خود نقل کر دیے ہیں' اور وہ یہ ہیں:

ولا تستطیعوا ان تعدلوا بین النسآء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ وان تصلحوا وتتقوا فان اللہ کان غفورا رحیما۔

"اور تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ عدل کرو عورتوں (یعنی بیویوں) کے درمیان' خواہ تم اس کے کیسے ہی خواہش مند ہو۔ لہٰذا (ایک بیوی کی طرف) بالکل نہ جھک پڑو کہ (دوسری کو) معلق چھوڑ دو۔ اور اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ یقیناً درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔

ان الفاظ کی بنیاد پر فاضل جج پہلے تو یہ فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانی ہستیوں کے بس میں نہیں ہے"۔ پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بنائے' اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کر دے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ دو بیویاں کرنے کی صورت میں چونکہ سالہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے اور قرآن میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے' کہ دونوں بیویوں کے ساتھ یکساں برتاؤ نہیں ہو سکتا' لہٰذا یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے"۔

ہمیں سخت حیرت ہے کہ اس آیت میں سے اتنا بڑا مضمون کس طرح اور کہاں سے نکل آیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ تو ضرور فرمایا ہے کہ انسان دو یا زائد بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل اگر کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا' مگر کیا اس بنیاد پر اس نے تعدد ازواج کی وہ اجازت واپس لے لی جو عدل کی شرط کے ساتھ اس نے خود ہی سورۂ نساء کی آیت نمبر ۳ میں دی تھی؟ آیت کے الفاظ بتا رہے تھے کہ اس فطری حقیقت کو صریح لفظوں میں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ دو یا زائد بیویوں کے

شوہر سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک بیوی کی طرف اس طرح ہمہ تن نہ مائل ہو جائے کہ دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق چھوڑ دے۔ بالفاظ دیگر پورا پورا عدل نہ کر سکنے کا حاصل قرآن کی رو سے یہ نہیں ہے کہ تعدد ازواج کی اجازت ہی سرے سے منسوخ ہو جائے بلکہ اس کے برعکس اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ شوہر ازدواجی تعلق کے لیے ایک بیوی کو مخصوص کر لینے سے پرہیز کرے۔ اور ربط و تعلق سب بیویوں سے رکھے خواہ اس کا دلی میلان ایک ہی کی طرف ہو۔ یہ حکم ریاست کو مداخلت کا موقع صرف اس صورت میں دیتا ہے جبکہ ایک شوہر نے اپنی دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق کر کے رکھ دیا ہو۔ اسی صورت میں وہ بے انصافی واقع ہو گی جس کے ساتھ تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ لیکن کسی منطق کی رو سے بھی اس آیت کے الفاظ اور اس کی ترکیب اور تحویل سے یہ گنجائش نہیں نکالی جا سکتی کہ معلق نہ رکھنے کی صورت میں ایک ہی شخص کے لیے تعدد ازواج کو ازروئے قانون ممنوع ٹھہرایا جا سکے' کجا کہ اس میں سے اتنا بڑا مضمون نکال لیا جائے کہ ریاست تمام لوگوں کے لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنے کو مستقل طور پر ممنوع ٹھہرا دے۔ قرآن کی جتنی آیتوں کو بھی آدمی چاہے' ملا کر پڑھے' لیکن قرآن کے الفاظ میں قرآن ہی کا مفہوم پڑھنا چاہئے' کوئی دوسرا مفہوم کہیں سے لا کر قرآن پڑھنا اور پھر یہ کہنا کہ یہ مفہوم قرآن سے نکل رہا ہے' کسی طرح بھی درست طریق مطالعہ نہیں ہے کجا کہ اسے درست طریق اجتہاد مان لیا جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم فاضل جج کو' اور ان کا سا طرز فکر رکھنے والے دوسرے حضرات کو بھی' ایک سوال پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی جن آیات پر وہ کلام فرما رہے ہیں' ان کو نازل ہوئے ۱۳۷۸ سال گزر چکے ہیں۔ اس پوری مدت میں مسلم معاشرہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں مسلسل موجود رہا ہے۔ آج کسی ایسی معاشی یا تمدنی یا سیاسی حالت کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جو پہلے

کسی دور میں بھی مسلم معاشرے کو پیش نہ آئی ہو۔ لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ پچھلی صدی کے نصف آخر سے پہلے پوری دنیائے اسلام میں کبھی یہ تخیل پیدا نہ ہوا کہ تعدد ازواج کو روکنے یا اس پر سخت پابندیاں لگانے کی ضرورت ہے؟ کیا اس کی کوئی معقول توجیہ اس کے سوا کی جا سکتی ہے کہ اب ہمارے ہاں یہ تخیل ان مغربی قوموں کے غلبہ کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جو ایک سے زائد بیوی رکھنے کو ایک قبیح و شنیع فعل' اور خارج از نکاح تعلقات کو (بشرط تراضی طرفین) حلال و طیب' یا کم از کم قابل درگزر سمجھتی ہیں؟ جن کے ہاں داشتہ رکھنے کا طریقہ قریب قریب مسلم ہو چکا ہے مگر اسی داشتہ سے نکاح کر لینا حرام ہے؟ اگر صداقت کے ساتھ فی الواقع اس کے سوا اس تخیل کے پیدا ہونے کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی تو ہم پوچھتے ہیں کہ اس طرح خارجی اثرات سے متاثر ہو کر قرآنی آیات کی تعبیریں کرنا کیا کوئی صحیح طریق اجتہاد ہے؟ اور کیا عام مسلمانوں کے ضمیر کو ایسے اجتہاد پر مطمئن کیا جا سکتا ہے؟

دوسرا اجتہاد' حد سرقہ کے بارے میں

اس کے بعد فاضل جج نے سورۂ مائدہ کی آیت ۳۸۔۳۹ کو لیا ہے اور اس میں بطور نمونہ یہ اجتہاد کر کے بتایا ہے کہ اس مقام پر قرآن نے چوری کی انتہائی سزا قطع ید بتائی ہے۔ حالانکہ قرآن اس جرم کی انتہائی سزا (Maximum Punishment) نہیں بلکہ ایک ہی سزا (Only Punishment) قطع ید قرار دے رہا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما جزآء بما کسبا نکالا من اللہ

"اور چور مرد اور چور عورت' دونوں کے ہاتھ کاٹ دو ان کے کیے کرتوت کے بدلے میں عبرت ناک سزا کے طور اللہ کی طرف سے"۔

اگر قرآن فضول اور بے معنی الفاظ استعمال نہیں کرتا ہے تو اس جملے میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ چور مرد اور چور عورت کے لیے بالفاظ صریح ایک ہی سزا

بیان کی گئی ہے' اور وہ ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ اس میں "انتہائی سزا" کا تصور کس راستے سے داخل ہو سکتا ہے؟

تیسرا اجتہاد' حضانت کے مسئلے میں

آخری نمونہ اجتہاد فاضل جج نے ایسے بچوں کی حضانت کے مسئلے میں کر کے بتایا ہے جن کی مائیں اپنے شوہروں سے جدا ہو چکی ہیں۔ اس معاملہ میں وہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۳ اور سورۂ طلاق کی آیت ۶ نقل کر کے حسب ذیل دو باتیں ارشاد فرماتے ہیں اور دونوں قرآنی الفاظ کے حدود سے صریحاً خارج ہیں:

پہلی بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ "ان آیات کی رو سے ماؤں کو پورے دو سال اپنے بچوں کو دودھ پلانا ہو گا"۔ حالانکہ جو آیات انہوں نے نقل کی ہیں ان کی رو سے پورے دو سال تو درکنار' بجائے خود دودھ پلانا بھی لازم نہیں کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت میں فرمایا گیا ہے۔ والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة "اور مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلائیں پورے دو سال اس شخص کے لیے جو رضاعت پوری کرانا چاہتا ہو"۔ اور سورۂ طلاق والی آیت میں فرمایا گیا ہے فان ارضعن لکم فاتوھن اجورھن "پھر اگر وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو"۔

دوسری بات وہ یہ فرماتے ہیں کہ "قرآن میں ایسی کوئی ہدایت نہیں ہے کہ ایک عورت اگر طلاق پا کر دوسری شادی کر لے تو پہلا شوہر اس سے اپنا بچہ لے سکتا ہے"۔ اگر محض اس بنا پر کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے وہ بچہ سے محروم ہو سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ ایک مرد دوسری شادی کر لینے کی صورت میں کیوں نہ اپنے بچے سے محروم ہو"۔ یہ بات ارشاد فرماتے وقت فاضل جج کو غالباً یہ خیال نہ رہا کہ چند سطر اوپر جو آیات انہوں نے خود نقل کی ہیں' ان میں بچے کو باپ کا قرار دیا گیا ہے اور اول سے لے کر آخر تک ان میں سارے احکام اسی بنیاد پر دیئے گئے ہیں کہ بچہ باپ کا ہے۔ علی المولود له رزقھن وکسوتھن "جس کا

بچہ ہے اس کے ذمہ دودھ پلانے والی ماں) کے کھانے کپڑے کا خرچ ہے"۔ وان اردتم ان تسترضعوا اولادکم فلا جناح علیکم "اور اگر تم (کسی دوسری عورت سے) اپنے بچے کو دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔ فان ارضعن لکم فاتوھن اجورھن "پھر اگر وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کی اجرت ان کو دو"۔ ہائی کورٹ کے ایک فاضل جج سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ قرآن کے یہ الفاظ بچے کے معاملہ میں باپ اور ماں کی پوزیشن کے درمیان کیا فرق ظاہر کر رہے ہیں۔

بنیادی غلطی

ان تینوں مسائل میں فاضل جج نے اس انداز میں بحث کی ہے کہ گویا قرآن خلا میں سفر کرتا ہوا سیدھا ہمارے پاس پہنچ گیا ہے۔ مسلم معاشرے کا کوئی ماضی نہیں ہے جس میں اس کتاب کے احکام سمجھنے سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کا کوئی کام کبھی ہوا ہو اور جس سے ہمیں کسی قسم کے کوئی نظائر کہیں ملتے ہوں۔ کوئی نبی نہ تھا جس پر یہ قرآن اترا ہو اور اس نے اس کے کسی حکم کا مطلب بیان کیا ہو' یا اس پر عمل کرکے بتایا ہو۔ کوئی خلفاء' کوئی صحابہ' کوئی تابعین' کوئی فقہاء' کوئی قاضی اور حکام عدالت اس امت میں نہیں گزرے ہیں۔ ہمیں پہلی مرتبہ ہی ان مسائل سے سابقہ پیش آگیا ہے کہ یہ قرآن جو تعدد ازواج کی اجازت دیتا ہے' یا چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کرتا ہے' یا بچوں کی حضانت کے متعلق کچھ ہدایات دیتا ہے' ان پر ہم کیا قواعد و ضوابط بنائیں۔ اس طرح کے تمام معاملات میں تیرہ چودہ سو برس کا اسلامی معاشرہ ہمارے لیے گویا معدوم محض ہے' سب کچھ ہمیں قرآن ہاتھ میں لے کر نئے سرے سے کرنا ہے' اور وہ بھی اس طرح جس کے چند نمونے اوپر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

سنت کے متعلق فاضل جج کا نقطہ نظر

یہ انداز بحث محض اتفاقی نہیں ہے بلکہ پیراگراف ۲۱ سے جو بحث شروع ہوتی

ہے اس کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ فاضل جج کی سوچی سمجھی رائے کا نتیجہ ہے۔ یہ چونکہ ان کے فیصلے کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس لیے ہم اس کے ایک ایک نکتے کو نمبروار نقل کر کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید کرتے چلے جائیں گے تاکہ ہر نکتے کی بحث صاف ہوتی چلی جائے۔

سنت کے بارے میں امت کا رویہ

وہ فرماتے ہیں کہ:

"قرآن کے علاوہ حدیث یا سنت کو بھی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اسلامی قانون کا ایک اتنا ہی اہم ماخذ سمجھ لیا ہے"۔ (پیراگراف ۲۱)

کوئی شخص جس نے اسلامی قانون اور اس کی تاریخ کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہو یہ ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس فقرے میں صحیح صورت واقعہ بیان کی گئی ہے۔ صحیح صورت واقعہ یہ ہے کہ عہد رسالت سے لے کر آج تک پوری امت' تمام دنیائے اسلام میں سنت رسولؐ کو قرآن کے بعد قانون کا بنیادی ماخذ' اور حدیث کو سنت کے معلوم کرنے کا ذریعہ مانتی چلی آ رہی ہے اور آج بھی مان رہی ہے۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں' تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ ایک مختصر سا گروہ دوسری صدی ہجری میں ظاہر ہوا تھا۔ جس نے اس کا انکار کیا تھا' اور اس کی تعداد مسلمانوں میں بڑے مبالغہ کے ساتھ بھی بیان کی جائے تو دس ہزار میں ایک سے زیادہ نہ تھی۔ تیسری صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے یہ گروہ ناپید ہو گیا' کیونکہ سنت کے ماخذ قانون ہونے کے حق میں ایسے مضبوط علمی دلائل و شواہد موجود تھے کہ اس گمراہانہ خیال کا زیادہ دیر تک ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ پھر ۹ صدیوں تک دنیائے اسلام اس طرح کہ کسی گروہ کے وجود سے بالکل خالی رہی' حتیٰ کہ اسلامی تاریخ میں کسی ایک شخص کا ذکر بھی نہیں ملتا جس نے یہ خیال ظاہر کیا ہو۔ اب اس طرز خیال کے لوگ از سر نو پچھلی صدی سے ظاہر ہونے شروع ہوئے ہیں۔ لیکن اگر دیکھا

جائے کہ ایسے افراد کے پیرو دنیائے اسلام میں کتنے ہیں، تو ان کا اوسط ایک لاکھ میں ایک سے زیادہ نہ نکلے گا۔ کیا اس امر واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرنا کہ "مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے سنت کو ماخذ قانون سمجھ لیا ہے" حقیقت کی صحیح ترجمانی ہے؟ اس کے بجائے یہ کہنا صحیح تر ہو گا کہ "مسلمانوں کی ایک بالکل ناقابل لحاظ تعداد سنت کے ماخذ ہونے سے انکار کرنے لگی ہے"۔

فاضل جج کے نزدیک دین میں نبی کی حیثیت

اس کے بعد فاضل جج نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ دین میں نبی کی حیثیت کیا ہے۔ اس سوال پر بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"اسلامی قانون کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے حدیث کی قدر و قیمت کیا ہے، اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہئے کہ اسلامی دنیا میں رسول پاکؐ کا مرتبہ و مقام کیا ہے۔ میں اس فیصلہ کے ابتدائی حصہ میں یہ بتا چکا ہوں کہ اسلام ایک خدائی دین ہے۔ یہ اپنی سند خدا سے، اور صرف خدا ہی سے لیتا ہے۔ اگر یہ اسلام کا صحیح تصور ہے تو اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کے اقوال و افعال اور کردار کو خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کی سی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ ان سے یہ معلوم کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی، یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو واقعات پر کس طرح منطبق کیا گیا تھا۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محمد رسول اللہ ایک کامل انسان تھے۔ نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ جس عزت اور تکریم کے مستحق ہیں، یا جس عزت و تکریم کا ہم ان کے لیے اظہار کرنا چاہتے ہیں، اس کے اظہار کی قوت و قابلیت وہ رکھتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ وہ خدا نہ تھے، نہ خدا سمجھے جا سکتے ہیں۔ دوسرے تمام رسولوں کی طرح وہ بھی

انسان ہی ہیں"۔ (پیراگراف ۲۱)

"وہ ہماری طرح فانی تھے..... وہ ایک نذیر تھے مگر یقینا خدا نہ تھے..... ان کو بھی اسی طرح خدا کے احکام کی پیروی کرنی پڑتی تھی جس طرح ہمیں' بلکہ شاید قرآن کی رو سے ان کی ذمہ داریاں اور مسئولیتیں ہماری بہ نسبت بہت زیادہ تھیں۔ وہ مسلمانوں کو اس سے زیادہ کوئی چیز نہ دے سکتے تھے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان کو دی گئی تھی"۔ (پیراگراف ۲۱)

ان باتوں کے حق میں قرآن مجید کی چند آیات کے استدلال کرنے کے بعد وہ پھر فرماتے ہیں:

"محمدؐ رسول اللہ اگرچہ بڑے عالی مرتبہ انسان تھے' مگر ان کو خدا کے بعد دوسرا درجہ ہی دیا جا سکتا ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت سے' ماسوا اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی تھی' وہ خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور اپنے ان خیالات کے زیراثر وہ کام کرتے تھے' یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر وہ غلطیاں تو کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے' لیغفر لک اللّٰہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر....."

"ایک سے زیادہ مقامات پر قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ دنیا کے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہیں' مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک آدمی کو ویسا ہی ایماندار' ویسا ہی راست باز' ویسا ہی سرگرم اور ویسا ہی دیندار اور متقی ہونا چاہئے جیسے وہ تھے' نہ یہ کہ ہم بھی بعینہ اسی طرح سوچیں اور عمل کریں' جس طرح وہ سوچتے اور عمل کرتے تھے' کیونکہ یہ تو غیر فطری بات ہو گی اور ایسا کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں تو زندگی بالکل ہی مشکل ہو جائے گی"۔

(پیراگراف ۲۲)

یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن پاک اس کی تاکید کرتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کی اطاعت کی جائے۔ مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں انہوں نے ہم کو ایک خاص کام ایک خاص طرح کرنے کا حکم دیا ہے' ہم وہ کام اسی طرح کریں۔ اطاعت تو ایک حکم ہی کی ہو سکتی ہے۔ جہاں کوئی حکم نہ ہو وہاں نہ اطاعت ہو سکتی ہے' نہ عدم اطاعت۔ قرآن کے ان ارشادات سے یہ مطلب اخذ کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم ٹھیک وہی کچھ کریں جو رسولؐ نے کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک فرد واحد کے زمانہ حیات کا تجربہ واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا' اگرچہ وہ فرد واحد نبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ بات پورے زور کے ساتھ کہی جانی چاہیے کہ اسلام نے نبی کو کبھی خدا نہیں سمجھا ہے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ قرآن اور حدیث میں جوہری اور حقیقی فرق ہے"۔

(پیراگراف:۲۳)

نبی کی اصل حیثیت از روئے قرآن

ہم بڑے ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ درحقیقت ان تمام عبارتوں میں خلط مبحث زیادہ اور اصل مسئلہ زیر بحث سے تعرض بہت کم ہے۔ اصل مسئلہ جس کی تحقیق اس مقام پر مطلوب تھی وہ یہ نہیں تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ خدا ہیں یا نہیں' اور وہ انسان ہیں یا کچھ اور' اور دین کے احکام میں سند و مرجع خدا کا حکم ہے یا کسی اور کا۔ بلکہ تحقیق جس چیز کی کرنی چاہیے تھی وہ یہ تھی کہ رسول پاکؐ کو اللہ تعالیٰ نے کس کام کے لیے مقرر کیا ہے' دین میں ان کی حیثیت اور اختیارات کیا ہیں' اور خدا کے احکام آیا صرف وہی ہیں جو قرآن کی آیات میں بیان ہوئے ہیں یا وہ بھی ہیں جو رسول پاکؐ نے قرآن کے علاوہ ہم کو دیئے۔ ان سوالات کی تحقیق ان آیات سے نہیں ہو سکتی تھی جنہیں فاضل جج نے نقل کیا ہے'

کیونکہ ان میں سرے سے ان سوالات کا جواب دیا ہی نہیں گیا ہے۔ ان کا جواب تو حسب ذیل آیات سے ملتا ہے جن کی طرف فاضل جج نے سرے سے توجہ ہی نہیں کی۔

۱۔ لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ ۔ (آل عمران:۱۶۴)

اللہ نے احسان کیا مومنوں پر جبکہ بھیجا ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول' جو تلاوت کرتا ہے ان پر اس کی آیات' اور تزکیہ کرتا ہے ان کا' اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب کی اور دانائی کی۔

۲۔ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم۔ (النحل:۴۴)

اور ہم نے یہ ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا ہے تیری طرف تاکہ تو تشریح کر دے لوگوں کے لیے اس (کتاب) کی جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

۳۔ یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر ویحل لھم الطیبت ویحرم علیھم الخبئث۔ (الاعراف:۱۵۷)

وہ (نبیؐ) حکم دیتا ہے ان کو نیکی کا اور منع کرتا ہے ان کو برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان کے لیے ناپاک چیزیں۔

۴۔ وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا۔ (الحشر:۷)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ۔

۵۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ (النساء:۶۴)

اور ہم نے کوئی رسول بھی نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔

۶۔ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ (النساء:۸۰)
جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

۷۔وان تطیعوہ تہتدوا۔ (النور:۵۴)
اور اگر تم رسولؐ کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

۸۔لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ (الاحزاب:۲۱)
تمہارے لیے رسول کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

۹۔فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فی ماشجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (النساء:۶۵)

پس نہیں' تیرے رب کی قسم' وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے جب تک تجھے اس معاملہ میں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں جس میں ان کے درمیان اختلاف ہے' پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں اور اسے سربسر تسلیم کرلیں۔

۱۰۔یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر۔ (النساء:۵۹)

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو رسولؐ کی' اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو پھیر دو اس کو اللہ اور رسولؐ کی طرف' اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روز آخرت پر۔

۱۱۔قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ (آل عمران:۳۱)
(اے نبیؐ) ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت رکھے گا۔

ان گیارہ آیات کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو دین اسلام میں رسول پاکؐ کی حقیقی حیثیت بالکل قطعی اور واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بلاشبہ وہ خدا تو نہیں ہیں، انسان ہی ہیں، مگر وہ ایسے انسان ہیں جن کو خدا نے اپنا نمائندہ مجاز بنا کر بھیجا ہے۔ خدا کے احکام براہ راست ہمارے پاس نہیں آئے بلکہ ان کے واسطے سے آئے ہیں۔ وہ محض اس لیے مقرر نہیں کیے گئے کہ خدا کی کتاب کی آیات جو ان پر نازل ہوں، بس وہ پڑھ کر ہمیں سنا دیں، بلکہ ان کے تقرر کا مقصد یہ ہے کہ وہ کتاب کی تشریح کریں۔

ایک مربی کی حیثیت سے ہمارے افراد اور معاشرے کا تزکیہ* کریں، اور ہمیں کتاب اللہ کی اور دانائی کی تعلیم دیں۔ آیت نمبر ۳ تصریح کرتی ہے کہ ان کو تشریعی اختیارات (Legislature Powers) بھی اللہ تعالیٰ نے تفویض کیے ہیں۔ اور اس میں کوئی قید ان کے اختیارات کو صرف قرآنی احکام کی تشریح تک محدود کرنے والی نہیں ہے۔ آیت نمبر ۴ علی الاطلاق یہ حکم دیتی ہے کہ جو کچھ وہ دیں اسے لے لو اور جس چیز سے بھی روک دیں اس سے رک جاؤ۔ اس میں بھی کوئی قید ایسی نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ جو کچھ وہ آیات قرآنی کی شکل میں دیں صرف اسی کو لو۔ آیت نمبر ۸ ان کی سیرت و کردار اور ان کے عمل کو ہمارے لیے نمونہ قرار دیتی ہے۔ اس مقام پر بھی یہ شرط نہیں لگائی گئی ہے کہ اپنے جس قول اور عمل کی سند وہ قرآن سے دے دیں صرف اسی کو اپنے لیے نمونہ سمجھو، بلکہ اس کے برعکس مطلقاً ان کو معیار حق کی حیثیت سے ہمارے سامنے پیش

---

*"تزکیہ" کے معنی "برائیوں سے پاک کرنا اور بھلائیوں کو نشوونما دینا" ہیں۔ اس لفظ میں آپ سے یہ معنی بھی متضمن ہیں کہ تزکیہ کرنے والا ہی ان برائیوں کو مشخص کرے گا جن سے افراد اور معاشرے کو پاک کرنا ہے اور ان بھلائیوں کا تعین کرے گا جنہیں افراد اور معاشرے میں نشوونما دینا ہے۔

کر دیا گیا ہے۔ آیت نمبر ۵' ۶ اور ۷ ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیتی ہیں اور یہاں بھی قطعاً کوئی اشارہ اس امر کی طرف نہیں ہے کہ یہ اطاعت صرف ان احکام کی حد تک ہے جو آیات قرآنی کی شکل میں وہ ہمیں دیں۔ آیت نمبر ۹ ان کو ایک ایسا جج بناتی ہے جس کی طرف فیصلے کے لیے رجوع کرنا اور جس کا فیصلہ بظاہر ہی نہیں بلکہ دل سے ماننا شرط ایمان ہے۔ یہ وہ حیثیت ہے جو دنیا کی کسی عدالت اور کسی جج کو بھی حاصل نہیں ہے۔ آیت نمبر ۱۰ ان کی حیثیت کو مسلمانوں کے تمام دوسرے اولی الامر کی حیثیت سے الگ کر دیتی ہے۔ اولی الامر جن میں صدر ریاست' اس کے وزراء' اس کے اہل شوریٰ' اس کی حکومت کے جملہ منتظمین' اور عدلیہ کے حکام' سب شامل ہیں) اطاعت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آتے ہیں' اور اللہ کی اطاعت پہلے نمبر پر ہے۔ ان دونوں کے درمیان رسولؐ کا مقام ہے۔ اور اس مقام پر رسول کی حیثیت یہ ہے کہ اولی الامر سے تو مسلمانوں کی نزاع ہو سکتی ہے مگر رسولؐ سے نہیں ہو سکتی' بلکہ ہر نزاع جو پیدا ہو' اس میں فیصلے کے لیے رجوع اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف کیا جائے گا۔ اس پوزیشن کو تسلیم کرنا بھی شرط ایمان قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ آیت کے آخری الفاظ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ پھر آخری آیت اللہ کی محبت کا ایک ہی تقاضا' اور اس کی محبت حاصل ہونے کا ایک ہی راستہ بتاتی ہے' اور وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کے رسولؐ کا اتباع کرے۔

یہ ہے دین اسلام میں رسول کی اصل حیثیت جسے قرآن اتنی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ کیا اس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد فاضل جج اپنی اس رائے پر نظرثانی فرمائیں گے جو انہوں نے پیراگراف نمبر ۲۱ میں بیان کی ہے؟ کیا دونوں تصویروں کو بالمقابل رکھ کر یہ صاف نظر نہیں آتا کہ انہوں نے رسول پاکؐ کی حیثیت کا تخمینہ حضورؐ کی اصل حیثیت سے بہت کم' بلکہ بنیادی طور پر مختلف لگایا ہے؟

کیا وحی صرف قرآن تک محدود ہے؟

فاضل جج کا یہ ارشاد لفظاً بالکل صحیح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم "مسلمانوں کو اس سے زیادہ کوئی چیز نہ دے سکتے تھے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان کو دی گئی تھی"۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آں محترم کے نزدیک حضورؐ پر آیا صرف وہی وحی آتی تھی جو قرآن میں درج ہے' یا اس کے علاوہ بھی آپؐ کو وحی کے ذریعہ سے ہدایات ملتی تھیں۔ اگر پہلی بات ہے تو اس کی صحت قابل تسلیم نہیں ہے۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ نبی پر کتاب اللہ کی آیات کے سوا اور کوئی وحی نہیں آتی۔ بلکہ اس کے برعکس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیات کتاب کے علاوہ بھی نبیؐ کو خدا کی طرف سے ہدایات ملتی ہیں اور اگر دوسری بات ہے تو قرآن کے ساتھ سنت کو بھی ماخذ قانون ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے' کیونکہ وہ بھی اسی خدا کی طرف سے ہے جس کی طرف سے قرآن نازل ہوا ہے۔

کیا حضورؐ اپنے خیالات کی پیروی کے لیے آزاد تھے؟

پھر فاضل موصوف کا یہ ارشاد شدت کے ساتھ نظرثانی کا محتاج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ماسوا اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی تھی' خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور ان خیالات کے زیراثر کام کرتے تھے"۔ یہ بات نہ قرآن سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ عقل اس کو باور کر سکتی ہے۔ قرآن مجید بار بار اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے جو فرائض حضورؐ پر عائد کیے گئے تھے اور جو خدمات آپ کے سپرد کی گئی تھیں' ان کی انجام دہی میں آپ اپنے ذاتی خیالات و خواہشات کے مطابق کام کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیے گئے تھے' بلکہ آپ وحی کی رہنمائی کے پابند تھے۔ ان اتبع الا ما یوحی الی (الانعام:۵۰)۔ قل انما اتباع ما یوحی الی من ربی (الاعراف:۲۰۳) ماضل صاحبکم وماغویٰ' وماینطق عن الھویٰ' ان ھو الا

وحی یوحی (النجم:۲،۳،۴)۔ رہی عقل، تو وہ کسی طرح یہ نہیں مان سکتی کہ ایک شخص کو خدا کی طرف سے رسول بھی مقرر کیا جائے اور پھر اسے رسالت کا کام اپنی خواہشات و رجحانات اور ذاتی آراء کے مطابق انجام دینے کے لیے آزاد بھی چھوڑ دیا جائے۔ ایک معمولی حکومت بھی اگر کسی شخص کو کسی علاقے میں وائسرائے یا گورنر یا کسی ملک میں اپنا سفیر مقرر کرتی ہے تو وہ اسے اپنی سرکاری ڈیوٹی انجام دینے میں خود اپنی مرضی سے کوئی پالیسی بنا لینے اور اپنے ذاتی خیالات کی بنا پر بولنے اور کام کرنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیتی۔ اتنی بڑی ذمہ داری کا منصب دینے کے بعد اس کو سختی کے ساتھ حکومت بالادست کی پالیسی اور اس کی ہدایات کا پابند کیا جاتا ہے۔ اس کی سخت نگرانی رکھی جاتی ہے کہ وہ کوئی کام سرکاری پالیسی اور ہدایات کے خلاف نہ کرنے پائے۔ جو معاملات اس کی صوابدید پر چھوڑے جاتے ہیں ان میں بھی گہری نگاہ سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنی صوابدید کو ٹھیک استعمال کر رہا ہے یا غلط۔ اس کو صرف وہی ہدایات نہیں دی جاتیں جو پبلک میں پیش کرنے کے لیے، یا جس قوم کی طرف وہ سفیر بنایا گیا ہے، اسے سنانے کے لیے ہوں بلکہ اسے خفیہ ہدایات بھی دی جاتی ہیں جو اس کی اپنی رہنمائی کے لیے ہوں۔ اگر وہ کوئی بات حکومت بالادست کے منشا کے خلاف کر دے تو اس کی فوراً اصلاح کی جاتی ہے یا اسے واپس بلا لیا جاتا ہے۔ دنیا اس کے اقوال و افعال کے لیے اس حکومت کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے، اور اس کے قول و افعال کے متعلق لازماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اسے اس کی مقرر کرنے والی حکومت کی منظوری حاصل ہے، یا کم از کم یہ کہ حکومت اس کو ناپسند نہیں کرتی۔ حد یہ ہے کہ اس کی پرائیویٹ زندگی تک کی برائی اور بھلائی اس حکومت کی نام وری پر اثر انداز ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ اب کیا خدا ہی سے اس بے احتیاطی کی امید کی جائے کہ وہ ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کرتا ہے، دنیا بھر کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اسے اپنی طرف سے نمونے کا آدمی ٹھہراتا ہے، اس کی بے چون و چرا اطاعت

اور اس کے اتباع کا بار بار بتاکید حکم دیتا ہے' اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے کہ اپنے ذاتی خیالات کے مطابق جس طرح چاہے' رسالت کی خدمات انجام دے؟

حضورؐ کی سنت غلطیوں سے پاک ہے یا نہیں؟

فاضل جج فرماتے ہیں: "یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر وہ غلطیاں کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے"۔ اس کے متعلق اگر قرآن کا تتبع کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف پانچ مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غلطی پر تنبیہہ فرمائی ہے۔ ایک سورۂ انفال آیت ۶۷۔۶۸ میں' دوسرے سورہ توبہ آیت ۴۳ میں' تیسرے سورۂ احزاب آیت ۳۷ میں' چوتھے سورۂ تحریم آیت ۱ میں' پانچویں سورۂ عبس آیت ۱۔۱۰ میں' چھٹا مقام جہاں گمان کیا جا سکتا ہے کہ شاید یہاں کسی غلطی پر تنبیہہ کی گئی ہے۔ وہ سورۂ توبہ آیت ۸۴ ہے۔ پورے ۲۳ سال کے زمانہ نبوت میں ان پانچ یا چھ مواقع کے سوا قرآن مجید میں نہ حضورؐ کی کسی غلطی کا ذکر آیا ہے' نہ اس کی اصلاح کا۔ اس سے جو بات ثابت ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ اس پورے زمانے میں حضورؐ براہ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں فرائض نبوت انجام دیتے رہے ہیں' اللہ تعالیٰ اس بات پر نگاہ رکھتا رہا ہے کہ اس کا نمائندۂ مجاز کہیں اس کی غلط نمائندگی اور لوگوں کی غلط رہنمائی نہ کرنے پائے' اور ان پانچ یا چھ مواقع پر حضورؐ سے جو ذرا سی چوک ہو گئی ہے اس پر فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ اگر ان چند مواقع کے سوا کوئی اور غلطی آپ سے ہو جاتی تو اس کی بھی اسی طرح اصلاح کر دی جاتی جس طرح ان غلطیوں کی کر دی گئی ہے۔ لہٰذا یہ چیز حضورؐ کی رہنمائی پر سے ہمارا اطمینان رخصت کر دینے کے بجائے اس کو اور زیادہ مضبوط کر دینے والی ہے۔ ہم اب یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضورؐ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کا پورا کارنامہ خطا اور لغزش سے بالکل پاک ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا (Approval) حاصل ہے۔

اتباع رسولؐ کا حقیقی مفہوم

حضورؐ کے اتباع کا جو حکم قرآن میں دیا گیا ہے اس کو فاضل جج اس معنی میں لیتے ہیں کہ "ہم بھی ویسے ہی ایماندار اور راست باز اور ویسے ہی سرگرم اور دیندار و متقی بنیں جیسے حضورؐ تھے"۔ ان کے نزدیک اتباع کا یہ مفہوم "غیر فطری اور ناقابل عمل ہے کہ ہم بھی اسی طرح سوچیں اور عمل کریں جس طرح حضورؐ سوچتے اور عمل کرتے تھے"۔ وہ فرماتے تھے کہ یہ مفہوم اگر لیا جائے تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ اس کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ اتنے بڑے بنیادی مسئلے کو بہت ہی سطحی انداز میں لے لیا گیا ہے۔ اتباع کے معنی محض صفات میں ہم رنگ ہونے کے نہیں ہیں' بلکہ طرز فکر' معیار اقدار' اصول و نظریات' اخلاق و معاملات اور سیرت و کردار میں پیروی کرنا بھی لازماً اس میں شامل ہے' اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاں حضورؐ نے استاد کی حیثیت سے دین کے کسی حکم پر عمل کرکے بتایا ہو' وہاں شاگرد کی طرح اس عمل میں آپ کی پیروی کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جس تراش خراش کا لباس آپ پہنتے تھے' وہی ہم پہنیں' جس طرح کے کھانے آپؐ کھاتے تھے' وہی ہم کھائیں' جس قسم کی سواریاں آپؐ استعمال فرماتے تھے انہی پر ہم بیٹھیں' یا جن اسلحہ سے آپؐ جنگ کرتے تھے ان کے سوا ہم کوئی ہتھیار استعمال نہ کریں۔ اتباع کا یہ مفہوم اگر لیا جائے تو بے شک زندگی اجیرن ہو جائے' مگر امت میں آج تک کوئی ذی علم آدمی ایسا نہیں گزرا ہے جو اس معنی میں اتباع کے وجوب کا قائل ہو۔ اس کا مطلب ابتدا سے تمام مسلمانوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضورؐ نے اپنے قول و عمل سے اسلامی انداز فکر اور دین کے اصول و احکام کی جو تشریح فرمائی ہے' اس میں ہم آپؐ کی پیروی کریں۔

مثال کے طور پر اسی تعدد ازواج کے مسئلے کو لے لیجیے جس پر فاضل جج نے اس سے پہلے شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں حضورؐ کے قول و فعل سے قطعی طور پر یہ انداز فکر ظاہر ہوتا ہے کہ تعدد ازواج فی الاصل کوئی برائی

نہیں ہے جس پر پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہو' اور یک زوجی درحقیقت کوئی قدر مطلوب نہیں ہے جسے معیار کے طور پر نگاہ میں رکھ کر قانون سازی کی جائے۔ لہٰذا حضورؐ کے اتباع کا تقاضا یہ ہے کہ یہی اس مسئلے میں ہمارا طرزِ فکر بھی ہو۔ پھر اس سلسلے میں قرآن کی ہدایات پر حضورؐ اپنی حکومت میں جس طرح عمل کیا گیا وہ ان ہدایات کی صحیح ترین شرح ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے۔ آپ کے زمانہ میں لوگوں کے معاشی حالات ہمارے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب تھے۔ مگر آپ نے کبھی اشارتاً بھی ان وجوہ سے تعددِ ازواج پر پابندی نہیں لگائی۔ آپؐ نے کسی سے نہیں پوچھا کہ کس یتیم بچے کی پرورش کے لیے تم دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہو۔ آپ نے کسی سے نہیں کہا کہ پہلے اپنی پہلی بیوی کو راضی کرو۔ آپ کی حکومت میں یہ بات بالکل کھلے طور پر جائز تھی کہ ایک شخص اپنی مرضی کے مطابق چار تک جتنی چاہے شادیاں کرے۔ مداخلت آپ کے زمانے میں اگر کبھی ہوئی ہے تو صرف اس وقت جبکہ کسی نے بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کیا ہے۔ اب اگر ہم رسول پاکؐ کے متبع ہیں تو ہمارا کام یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دو تین آیتیں لے کر خود اجتہاد کرنے بیٹھ جائیں' بلکہ ہمیں لازماً یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جس رسول پر یہ آیتیں نازل ہوئی تھیں اس نے ان کا منشا کیا سمجھا تھا اور اسے کس طرح عمل کا جامہ پہنایا تھا۔

کیا حضورؐ کی رہنمائی صرف اپنے زمانے کے لیے تھی؟

فاضل جج کا ارشاد ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو فائدہ حضورؐ کے اقوال و افعال اور کردار سے اٹھایا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان سے "یہ معلوم کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی' یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو کس طرح منطبق کیا گیا تھا"۔ یہ ارشاد پڑھنے والے کو یہ تاثر دیتا ہے کہ موصوف کے نزدیک حضورؐ کی رہنمائی دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نہیں تھی بلکہ اپنے زمانے کی ایک مخصوص سوسائٹی کے لیے

تھی۔ یہی تاثر ان کے یہ الفاظ بھی دیتے ہیں کہ "ایک فرد واحد کے زمانہ حیات کا تجربہ واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا"۔

اس مسئلے پر چونکہ انہوں نے اپنے نقطہ نظر پوری طرح واضح نہیں کیا ہے اس لیے اس پر مفصل بحث تو نہیں کی جا سکتی' لیکن مجملاً جو تاثر ان کے یہ الفاظ دے رہے ہیں' اس کے بارے میں چند کلمات عرض کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید اس بات پر شاہد ہے کہ جس طرح وہ خود ایک خاص زمانے میں ایک خاص قوم کو خطاب کرنے کے باوجود ایک عالمگیر اور دائمی ہدایت ہے' اسی طرح اس کا لانے والا رسول' بھی ایک معاشرے کے اندر چند سال تک فرائض رسالت انجام دینے کے باوجود تمام انسانوں کے لیے ابد تک ہادی و رہنما ہے۔ جس طرح قرآن کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے:

ولوحی الی هذا القرآن لانذرکم به ومن بلغ (الانعام:۱۹)

اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے متنبہ کروں تم کو اور جس جس کو بھی یہ پہنچے۔

ٹھیک اسی طرح قرآن کے لانے والے رسول کے متعلق بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ:

قل یا ایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا (الاعراف:۵۸)

(اے محمدؐ) کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

وما ارسلنک الا کافة للناس بشیرا ونذیرا (سبا:۲۸)

اور (اے محمدؐ) نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام انسانوں کی طرف بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیین (الاحزاب:۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں' مگر وہ اللہ کے

رسولؐ ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں۔

اس لحاظ سے قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر وقتی اور محدود ہیں تو دونوں ہیں' اگر دائمی اور عالمگیر ہیں تو دونوں ہیں۔ آخر کون نہیں جانتا کہ قرآن کا نزول ۶۱۰ء میں شروع ہوا تھا اور ۶۳۲ء میں اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آخر کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ اس قرآن کے مخاطب اس زمانے کے اہل عرب تھے اور انہی کے حالات کو سامنے رکھ کر اس میں ہدایات دی گئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر کس بنا پر ہم ان ہدایات کو ہمیشہ کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ مانتے ہیں؟ جو جواب اس سوال کا ہے' بعینہٖ وہی جواب اس سوال کا بھی ہے کہ ایک فرد واحد کی پیغمبرانہ زندگی جو ساتویں صدی عیسوی میں صرف ۲۲ شمسی سالوں تک بسر ہوئی تھی' اس کا تجربہ تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے۔ یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں ہے کہ ہدایت کے یہ دونوں ذریعے زمان و مکان سے محدود ہونے کے باوجود کس کس طرح ابدی اور عالمگیر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ہم یہاں صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ قرآن کی عالمگیری اور ابدیت کے قائل ہیں وہ خدا کی کتاب اور خدا کے رسول کے درمیان فرق کس بنیاد پر کرتے ہیں؟ آخر کس دلیل سے ایک کی رہنمائی عام ہے اور دوسرے کی رہنمائی محدود و مخصوص؟

خلفائے راشدین کے اتباع سنت کی وجہ

اس اصولی بحث کے بعد پیراگراف ۲۴ میں فاضل جج یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے اگر اپنے دور حکومت میں سنت کا اتباع کیا بھی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں:

> "کوئی معتبر شہادت ایسی نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ محمدؐ رسول اللہ کے بعد جو چار خلیفہ ہوئے وہ ان کے اقوال' افعال اور کردار کو کیا اہمیت دیتے تھے' لیکن اگر بحث کی خاطر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ افراد کے

معاملات اور قومی اہمیت رکھنے والے مسائل کا فیصلہ کرنے میں بڑے وسیع پیمانے پر حدیث کو استعمال کرتے تھے تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے کیونکہ وہ ہماری بہ نسبت بلحاظ زمانہ بھی اور بلحاظ مقام بھی محمدؐ رسول اللہ سے قریب تر تھے"۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ زمانہ گذشتہ کے کسی واقعہ کے متعلق جو شہادت زیادہ سے زیادہ معتبر ہونی ممکن ہے۔ اتنی ہی معتبر شہادت اس امر کی موجود ہے کہ چاروں خلفائے راشدین سختی کے ساتھ سنت رسولؐ کی پابندی کرتے تھے' اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے زمانے کے حالات حضورؐ کے زمانے کے حالات سے مشابہ تھے' بلکہ اس کی وجہ تھی کہ قرآن کے بعد ان کے نزدیک اسلامی قانون کا آئینی مرجع سنت تھی جس سے تجاوز کرنے کا وہ اپنے آپ کو قطعاً مجاز نہ سمجھتے تھے۔ اس باب میں ان کے اپنے صریح اقوال ہم اسی کتاب کے صفحات ۱۳ تا ۱۱۸ پر نقل کر چکے ہیں۔ نیز اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری سے اس چودھویں صدی تک ہر صدی کا فقہی لٹریچر علی التواتر خلفاء راشدین کا یہی مسلک بیان کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بعض لوگ ان کے سنت سے تجاوز کی جو نظیریں پیش کر رہے ہیں ان میں سے ایک بھی فی الحقیقت اس بات کی نظیر نہیں ہے کہ کسی خلیفہ راشد نے کبھی عملاً سنت سے تجاوز کیا ہے' یا اصولاً اپنے آپ کو ایسے تجاوز کا مجاز سمجھا ہے۔ ان میں سے بعض نظائر کی حقیقت بھی ہم اسی کتاب کے صفحات ۱۹۲ تا ۱۹۶ پر ظاہر کر چکے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا علم حدیث اور اتباع سنتؐ

اس کے بعد فاضل جج امام ابو حنیفہؒ کے مسلک سے استناد فرماتے ہیں ان کا ارشاد ہے:

"مگر ابو حنیفہؒ نے' جو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور جن کا انتقال ۷۰ سال بعد ہوا' تقریباً ۱۷ یا ۱۸ حدیثیں ان مسائل کا فیصلہ کرنے میں استعمال کیں جو ان کے سامنے پیش کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ رسولؐ اللہ

کے زمانہ سے اس قدر قریب نہ تھے جس قدر پہلے چار خلفاء تھے۔ انہوں نے تمام فیصلوں کی بنا قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی اور متن قرآن کے الفاظ کے پیچھے ان محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو ان ہدایات کے موجب تھے۔ وہ استدلال و استنباط کی بڑی قوت رکھتے تھے۔ انہوں نے عملی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول اور نظریات مرتب کیے۔ اگر ابو حنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں کریں، تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا"۔

یہ ارشاد تمام تر غلط روایات اور مفروضات پر مبنی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے متعلق ابن خلدون نے نہ معلوم کس سند پر یہ بات لکھ دی تھی کہ "حدیث قبول کرنے میں ابو حنیفہ اس قدر متشدد تھے کہ ان کے نزدیک ۱۷ سے زیادہ حدیثیں صحیح نہ تھیں"۔ یہ بات چلتے چلتے لوگوں میں اس طرح مشہور ہوئی کہ امام ابو حنیفہؒ کو صرف ۱۷ احادیث کا علم تھا، یا یہ کہ انہوں نے صرف ۱۷ احادیث سے مسائل اخذ کیے ہیں حالانکہ یہ بالکل ایک خلاف واقعہ افسانہ ہے۔ آج امام ابو حنیفہ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسفؒ کی مرتب کردہ کتاب الآثار شائع شدہ موجود ہے جس میں انہوں نے اپنے استاذ کی روایت کردہ ایک ہزار احادیث جمع کی ہیں۔ اس کے علاوہ امام کے دوسرے دو نامور شاگردوں، امام محمد اور امام حسن بن زیاد اللؤلؤی نے اور امام کے صاحبزادے حماد بن ابی حنیفہ نے بھی ان کی روایت کردہ احادیث کے مجموعے مرتب کیے تھے۔ پھر مسلسل کئی صدیوں تک بکثرت علماء ان کی مرویات کو "مسند ابی حنیفہ"[۱] کے نام سے جمع کرتے رہے۔ ان میں سے ۱۵ مسانید

۱۔ علم حدیث کی اصطلاح میں مسند سے مراد وہ کتاب ہے جس میں ایک شخص کی روایت کردہ احادیث یکجا جمع کر دی گئی ہیں۔

کا ایک جامع نسخہ قاضی القضاۃ محمد بن محمود الخوارزمی نے "جامع مسانید الامام الاعظم" کے نام سے مرتب کیا جسے دائرۃ المعارف حیدر آباد نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں اس دعوے کی تردید قاطع ہیں کہ امام ابو حنیفہ صرف ۱۷ حدیثیں جانتے تھے' یا انہوں نے صرف ۱۷ حدیثوں سے استدلال کر کے فقہی مسائل نکالے ہیں۔ علم حدیث میں امام کے استادوں کی تعداد (جن سے انہوں نے روایات لی ہیں) چار ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان کا شمار اکابر حفاظ حدیث میں کیا گیا ہے۔ ان کی مسانید جمع کرنے والوں میں دار قطنی' ابن شاہین اور ابن عقدہ جیسے نامور علماء حدیث شامل ہیں۔ کوئی شخص فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں سے اگر صرف امام طحاوی کی "شرح معانی الاثار"' ابوبکر جصاص کی "احکام القرآن" اور امام سرخسی کی "المبسوط" ہی کو دیکھ لے تو اسے یہ غلط فہمی کبھی نہ لاحق ہو کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث سے بے نیاز ہو کر صرف قیاس اور قرآن پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی تھی۔

پھر حدیث سے استناد کے معاملہ میں امام ابو حنیفہ کا جو مسلک تھا اسے انہوں نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "مجھے جب کوئی حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اسی کو تھام لیتا ہوں۔ اور جب اس میں نہیں ملتا تو رسولؐ اللہ کی سنت اور آپؐ کے ان صحیح آثار کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف ہیں۔ پھر جب یہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے نہ سنت رسولؐ اللہ میں تو میں اصحاب رسولؐ کے قول (یعنی ان کے اجماع) کی پیروی کرتا ہوں' اور ان کے اختلاف کی صورت میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں' قبول کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں' چھوڑ دیتا ہوں۔ مگر ان سب کے اقوال سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا۔ رہے دوسرے لوگ تو جس

طرح اجتہاد کا حق انہیں ہے' مجھے بھی ہے"۔ا۔

امام ابو حنیفہؒ کے سامنے ایک مرتبہ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا:

"بخدا اس شخص نے جھوٹ کہا اور ہم پر افترا کیا جس نے کہا کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں' بھلا نص کے بعد بھی قیاس کی کوئی حاجت رہتی ہے؟"۔۲۔

خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ امام کو لکھا کہ میں نے سنا ہے آپ قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں جواب میں انہوں نے لکھا:

"امیر المومنین' جو بات آپ کو پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر' پھر ابوبکرو عمراور عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے فیصلوں پر' پھر باقی صحابہ کے فیصلوں پر' البتہ جب صحابہ میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں"۔۳۔

علامہ ابن حزمؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

"تمام اصحاب ابی حنیفہ اس بات پر متفق ہیں کہ ابو حنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ ضعیف حدیث بھی اگر مل جائے تو اس کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے"۔۴۔

ا۔ تاریخ بغداد للخطیب ج ۱۳' ص ۳۶۸۔ مناقب امام اعظم للموفق المکی' ج ۱' ص ۷۹' مناقب امام ابو حنیفہ وصاحبین للذہبی' ص ۲۰

۲۔ کتاب المیزان للشعرانی' ج ۱' ص ۶۱

۳۔ کتاب المیزان للشعرانی' ج ۱' ص ۶۲

۴۔ مناقب امام ابو حنیفہ وصاحبین للذہبی' ص ۲۱۔ واضح رہے کہ ضعیف حدیث کے معنی جھوٹی حدیث کے نہیں ہیں۔ اس جگہ ضعیف سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند تو قوی نہ ہو' مگر جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ یہ حضورؐ ہی کا قول ہوگا۔

فاضل جج کے نزدیک احادیث پر اعتماد نہ کرنے کے وجوہ

اس کے بعد پیراگراف ۲۵ میں فاضل جج وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ان کے نزدیک احادیث ناقابل اعتماد بھی ہیں' اور بجائے خود حجت و سند بھی نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی بحث کے نکات حسب ذیل ہیں:

(۱) "تمام فقہائے اسلام اس بات کو بالاتفاق مانتے ہیں کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا' جعلی حدیثوں کا ایک جم غفیر اسلامی قوانین کا ایک جائز و مسلم ماخذ بنتا چلا گیا۔ جھوٹی حدیثیں خود محمد رسول اللہ کے زمانے میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھی۔ جھوٹی اور غلط حدیثیں اتنی بڑھ گئی تھی کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں روایت حدیث پر پابندیاں لگا دیں بلکہ اسے منع تک کر دیا۔ امام بخاری نے ۶ لاکھ حدیثوں میں سے صرف ۹ ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا"۔

(۲) "میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس بات سے انکار کرے گا کہ جس طرح قرآن کو محفوظ کیا گیا اس طرح کی کوئی کوشش رسول اللہ کے اپنے عہد میں احادیث کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جو شہادت موجود ہے وہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ نے سختی کے ساتھ احادیث کو منع کر دیا تھا۔ اگر مسلم کی روایات صحیح ہیں تو محمدؐ رسول اللہ نے پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ ان کے اقوال اور افعال کو لکھ لیں۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ جس کسی نے ان کی احادیث کو محفوظ کر رکھا ہو' وہ انہیں فوراً ضائع کر دے۔ لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا ولا حرج[۱]۔ اسی حدیث یا ایسی ہی ایک حدیث کا ترجمہ مولانا

---

[۱] یہ عجیب بات ہے' شاید اتفاقاً ہی ایسا ہوا ہو کہ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں جتنی آیات اور احادیث کا حوالہ دیا ہے' ان کا ترجمہ بھی ساتھ ہی دے دیا ہے' لیکن اس حدیث کا ترجمہ انہوں نے نہیں دیا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: "مجھ سے کوئی چیز نہ لکھو' اور جس نے مجھ سے قرآن کے سوا کچھ لکھا ہو وہ اسے مٹا دے' البتہ زبانی روایت بیان کرو' اس میں کوئی مضائقہ نہیں"۔ اس حدیث کا خط کشیدہ فقرہ فاضل جج کے مدعا کے بالکل خلاف پڑتا ہے۔

محمد علی[1] نے اپنی کتاب "دین اسلام کے ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں صفحہ ۶۴ پر ان الفاظ میں دیا ہے۔ روایت ہے کہ ابوہریرہؓ نے کہا رسولؐ خدا ہمارے پاس آئے اس حال میں کہ ہم حدیث لکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا تم لوگ کیا لکھ رہے ہو۔ ہم نے کہا حدیث جو ہم آپؐ سے سنتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا یہ کیا! اللہ کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب!"

(۳) اس امر کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کے فوراً بعد جو چار خلیفہ ہوئے ان کے زمانے میں احادیث محفوظ یا مرتب کی گئی ہوں۔ اس امر واقعہ کا کیا مطلب لیا جانا چاہئے؟ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو گہری تحقیقات کا طالب ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ اور ان کے بعد آنے والے چاروں خلفاء نے احادیث کو محفوظ کرنے کی کوئی کوشش اس لیے نہیں کی کہ یہ احادیث عام انطباق کے لیے نہ تھیں؟"

(۴) "مسلمانوں کی بڑی اکثریت نے قرآن کو حفظ کر لیا۔ وہ جس وقت وحی آتی تھی، اس کے فوراً بعد کتابت کا جو سامان بھی میسر آتا تھا اس پر لکھ لیا جاتا تھا اور اس غرض کے لیے رسول کریمؐ نے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب کی خدمات حاصل رکھی تھیں۔ لیکن جہاں تک احادیث کا تعلق ہے، وہ نہ یاد کی گئیں، نہ محفوظ کی گئیں۔ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی ہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرنے کے بعد مر گئے۔ یہاں تک کہ رسولؐ کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا"۔

(۵) "یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ بعد میں پہلی مرتبہ رسولؐ اللہ کے تقریباً ایک سو سال بعد احادیث کو جمع کیا گیا، مگر ان کا ریکارڈ اب قابل حصول نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کو حسب ذیل اصحاب نے جمع کیا: امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ)، امام مسلم

---

[1] اس سے مراد لاہوری احمدیوں کے امیر ہیں، مولانا محمد علی جوہر نہیں ہیں۔

(متوفی ۲۶۱ھ)' ابوداؤد (متوفی ۲۷۵ھ)' جامع ترمذی ا۔ (متوفی ۲۷۹ھ)' سنن النسائی (متوفی ۳۰۳ھ)' سنن ابن ماجہ ۲۔ (متوفی ۲۸۳ھ)' سنن الدرمی ۳۔ (متوفی ۱۸۱ھ)' بیہقی (پیدائش ۲۸۴ھ) اور امام احمد (پیدائش ۱۶۴ھ)۔ فاضل جج نے اس کے بعد شیعہ محدثین کا ذکر کیا ہے جسے ہم اس لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کے متعلق کچھ کہنا شیعہ علماء کا کام ہے۔

(۶) "بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعین حدیث متفق ہوں۔ کیا یہ چیز احادیث کو انتہائی مشکوک نہیں بنا دیتی کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے؟"

(۷) "جن لوگوں کو تحقیقات کا کام سپرد کیا گیا ہو' وہ ضرور اس بات پر نگاہ رکھیں گے کہ ہزار در ہزار جعلی حدیثیں پھیلائی گئی ہیں تاکہ اسلام اور محمدؐ رسول اللہ کو بدنام کیا جائے"۔

(۸) "انہیں اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا ہو گا کہ عربوں کا حافظہ خواہ کتنا ہی قوی ہو' کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابل اعتماد سمجھی جا سکتی ہیں؟ آخر آج کے عربوں کا حافظہ بھی تو ویسا ہی ہے' جیسا ۱۳ سو برس پہلے ان کا حافظہ رہا ہو گا۔ آج کل عربوں کا حافظہ جیسا کچھ ہے' وہ ہمیں یہ رائے قائم کرنے کے لیے ایک اہم سراغ کا کام دے سکتا ہے کہ جو روایات ہم تک پہنچی ہیں کیا ان کے صحیح اور حقیقی ہونے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟"

(۹) "عربوں کے مبالغے نے' اور جن راویوں کے ذریعہ سے یہ روایات ہم

ا۔ فاضل جج نے یہ نام اسی طرح لکھا ہے۔ حالانکہ جامع ترمذی مصنف کا نام نہیں بلکہ کتاب کا نام ہے۔ مصنف صرف ترمذی کے نام سے مشہور ہیں۔

۲۔ یہ بھی مصنفین کے نہیں' کتابوں کے نام ہیں۔ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ کی تو ابھی وفات نہیں ہوئی ہے۔ ۳۔ ہمارے علم میں اس نام کا کوئی مصنف نہیں گزرا ہے' نہ کسی ایسی کتاب سے ہم واقف ہیں جس کا یہ نام ہو۔

تک پہنچی ہیں' ان کے اپنے معتقدات اور تعصبات نے بھی ضرور بڑی حد تک نقل روایت کو مسخ کیا ہو گا۔ جب الفاظ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں۔ وہ ذہن خواہ عرب کا ہو یا کسی اور کا' بہرحال ان الفاظ میں ایسے تغیرات ہو جاتے ہیں جو ہر ذہن کی اپنی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر ذہن ان کو اپنے طرز پر موڑتا توڑتا ہے اور جبکہ الفاظ بہت سے ذہنوں سے گزر کر آئے ہوں تو ایک شخص تصور کر سکتا ہے کہ ان میں کتنا بڑا تغیر ہو جائے گا"۔

وجوہ مذکورہ پر تنقید

یہ ۹ نکات ہم نے فاضل جج کے اپنے الفاظ میں' ان کی اپنی ترتیب کے ساتھ نقل کر دیئے ہیں۔ اب ہم ان کا علمی جائزہ لے کر دیکھیں گے کہ یہ کہاں تک صحیح ہیں اور ان کو احادیث پر اعتماد نہ کرنے' اور سنت کو حجت نہ ماننے کے لیے کس حد تک دلیل بنایا جا سکتا ہے۔

کیا جھوٹی حدیثیں اسلامی قانون کا ماخذ بنی ہیں؟

سب سے پہلے ان کے نکتہ نمبر ایک اور سات کو لیجئے۔ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے کہ جعلی حدیثوں کے ایک جم غفیر کا اسلامی قانون کے ماخذ میں داخل ہو جانا تمام فقہاء اسلام بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں۔ فقہاء اسلام اس بات کو تو بے شک تسلیم کرتے ہیں کہ جعلی حدیثیں کثرت سے گھڑی گئیں' لیکن ان میں سے کسی نے اگر یہ تسلیم کیا ہو کہ یہ حدیثیں اسلامی قانون کا ماخذ بھی بن گئیں' تو ایسے ایک ہی فقیہ' یا محدث یا معتبر عالم دین کا نام ہمیں بتایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت سے جعلی احادیث ظاہر ہونی شروع ہوئیں اسی وقت سے محدثین اور ائمہ مجتہدین اور فقہاء نے اپنی تمام کوششیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ یہ گندا نالہ اسلامی قوانین کے سوتوں میں نفوذ نہ کرنے پائے۔ ان کوششوں کا زیادہ تر زور ان احادیث ہی کی تحقیقات پر صرف ہوا ہے جن سے کوئی حکم شرعی ثابت ہوتا تھا۔ اور اسلامی عدالتوں کے قاضی بھی اس معاملے میں سخت چوکنے رہے ہیں کہ محض "قال رسول

اللہ" سن کر وہ کسی فوجداری یا دیوانی مقدمے کا فیصلہ نہ کر دیں بلکہ اس قول کی پوری چھان بین کریں جس کی رو سے کوئی ملزم چھوٹتا یا سزا پا سکتا ہو' یا کوئی مدعی کے معاملے میں اپنا حق ثابت کر سکتا ہو یا اس سے محروم ہو سکتا ہو۔ آغاز اسلام کے حاکمان عدالت انصاف کے معاملے میں ہمارے فاضل جج اور ان کے رفقاء سے کچھ کم محتاط تو نہ ہو سکتے تھے۔ آخر ان کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ ضروری تحقیقات کے بغیر کسی چیز کو قانونی حکم تسلیم کر کے فیصلے کر ڈالتے؟ اور مقدمات کے فریقین آخر کس طرح ٹھنڈے دل سے یہ برداشت کر سکتے تھے کہ ایک قانونی حکم کا ثبوت بہم پہنچے بغیر کسی کچی پکی روایت پر ان کے خلاف فیصلہ ہو جائے؟ اس لیے درحقیقت نہ یہ بات صحیح ہے کہ اسلامی قوانین کے ماخذ میں جعلی حدیثیں داخل ہوئی ہیں' اور نہ یہی بات درست ہے کہ فقہاء اسلام نے ان کے داخل ہو جانے کو "بالاتفاق" مانا ہے۔

کیا جھوٹی حدیثیں حضورؐ کے زمانے ہی میں رواج پانے لگی تھیں؟

فاضل جج کا یہ ارشاد بھی سخت غلط فہمی میں ڈالنے والا ہے کہ جھوٹی حدیثیں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ دراصل اس کی حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں ایک شخص مضافات مدینہ کے ایک قبیلے کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا' مگر لڑکی والوں نے انکار کر دیا تھا۔ ہجرت کے بعد شروع زمانے میں وہی شخص ایک حلہ پہنے ہوئے اس قبیلے میں پہنچا اور جا کر اس نے لڑکی والوں سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ حلہ پہنایا ہے' اور مجھ کو اس قبیلے کا حاکم بنا دیا ہے۔ قبیلے والوں نے اسے اتار لیا اور خاموشی کے ساتھ حضورؐ کو اس معاملے کی اطلاع دی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "جھوٹ کہا اس دشمن خدا نے"۔ پھر ایک آدمی کو حکم دیا کہ جاؤ' اگر اسے زندہ پاؤ تو قتل کر دو' اور اگر مردہ پاؤ تو اس کی لاش جلا ڈالو۔ وہ شخص وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مجرم کو سانپ نے کاٹا ہے اور وہ مر چکا ہے۔ چنانچہ حکم کے مطابق اس کی لاش جلا ڈالی گئی۔ اس

کے بعد حضورؐ نے اعلان عام فرمایا اور بعد میں بھی بار بار بتاکید آپ یہ اعلان فرماتے رہے کہ جو شخص میرا نام لے کر جھوٹی بات کہے وہ جہنم میں جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ا۔ اس شدید احتیاطی کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ۳۰' ۴۰ سال تک جھوٹی حدیث گھڑ کر پھیلانے کا پھر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

حضرت عمرؓ نے کثرت روایت سے کیوں منع کیا؟

ان کا یہ ارشاد بھی ایک دعویٰ بلا ثبوت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے جھوٹی حدیثیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ حضرت عمرؓ کو روایت حدیث پر پابندی لگا دینی پڑی' بلکہ اسے بالکل روک دینا پڑا۔ اگر اس کے بیان کے لیے کوئی تاریخی سند موجود ہو تو براہ کرم اس کا حوالہ دیا جائے۔ فی الواقع اس زمانے میں وضع حدیث کا کوئی فتنہ رونما نہیں ہوا تھا۔ تاریخ اس کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ حضرت عمرؓ جس وجہ سے کثرت روایت کو پسند نہ کرتے تھے' وہ دراصل یہ تھی کہ جنوبی حجاز کے مختصر خطے کے سوا اس وقت تک عرب میں قرآن مجید کی عام اشاعت نہ ہوئی تھی۔ عرب کا بیشتر حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری حصے میں اسلام کے زیر نگیں آیا تھا اور عام باشندگان عرب کی تعلیم کا انتظام ابھی پوری طرح شروع بھی نہ ہوا تھا کہ حضورؐ کی وفات' اور پھر خلافت صدیقی میں فتنہ ارتداد کے رونما ہونے سے یہ کام درہم برہم ہو گیا تھا۔ حضرت عمرؓ کا عہد وہ تھا جس میں مسلمانوں کو اطمینان کے ساتھ عوام کی تعلیم کے لیے کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت یہ ضروری تھا کہ پہلے ساری قوم کو قرآن کے علم سے روشناس کرا دیا جائے' اور ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جس سے قرآن کے ساتھ کوئی دوسری چیز خلط ملط ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اگر دین صحابہ جو حضورؐ کی طرف سے لوگوں کو قرآن پہنچا رہے

ا۔ اس واقعہ کو مشہور محدث عبداللہ بن عدی نے اپنی کتاب "الکامل فی معرفتہ الضعفاء والمتروکین" میں بیان کیا ہے۔

تھے' ساتھ ساتھ حضورؐ کی احادیث بھی بیان کرتے جاتے تو سخت خطرہ تھا کہ بدویوں کی ایک بڑی تعداد آیات قرآنی کو احادیث نبوی کے ساتھ گڈمڈ کر کے یاد کر لیتی۔ اس مصلحت کو حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر خود بیان فرمایا ہے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں قلم بند کر لی جائیں۔ اس کے متعلق صحابہؓ سے انہوں نے مشورہ لیا۔ سب نے رائے دی کہ یہ کام ضرور کرنا چاہیے مگر حضرت عمرؓ اسے شروع کرتے ہوئے ایک مہینے تک جھجکتے رہے اور اللہ سے دعا کرتے رہے کہ جس چیز میں خیر ہو اس کی طرف وہ آپ کی رہنمائی کر دے۔ آخر کار ایک مہینے کے بعد ایک روز انہوں نے فرمایا کہ "میں سنتیں لکھوانے کا ارادہ رکھتا تھا' مگر مجھے خیال آیا کہ تم سے پہلے ایک قوم گزر چکی ہے جس نے دوسری کتابیں لکھیں اور کتاب اللہ کو چھوڑ بیٹھی۔ لہٰذا خدا کی قسم' میں کتاب اللہ کے ساتھ دوسری کوئی چیز ہرگز شامل نہ کروں گا"۔[1]

امام بخاریؒ کی چھ لاکھ حدیثوں کا افسانہ

فاضل جج کی ایک اور بات جو سخت غلط فہمی پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ "امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف ۹ ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا"۔ اس سے ایک شخص یہ تاثر لیتا ہے کہ چھ لاکھ میں سے بس وہ ۹ ہزار تو صحیح تھیں جو امام بخاری نے لے لیں اور باقی ۵ لاکھ ۹۱ ہزار جھوٹی حدیثیں قوم میں پھیلی ہوئی تھیں حالانکہ اصل حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔ دراصل محدثین کی اصطلاح میں ایک واقعہ اگر سلسلہ سند سے نقل ہو تو وہ ایک حدیث ہے' اور وہ ایک واقعہ مثلاً دس' بیس یا پچاس مختلف سندوں سے نقل ہو کر آئے تو وہ اسے دس' بیس یا پچاس حدیثیں کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ کے زمانہ تک پہنچتے پہنچتے حضورؐ کے ایک ایک ارشاد اور آپ کی زندگی کے ایک ایک واقعہ کو بکثرت راوی بہت ہی مختلف

---

[1] تدریب الراوی' ص ۱۵۱' بحوالہ المدخل للبیہقی

سندوں سے روایت کرتے تھے' اور اس طرح چند ہزار حدیثیں کئی لاکھ حدیثوں کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ امام بخاریؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جتنی سندوں سے کوئی واقعہ انہیں پہنچا تھا انہیں وہ اپنی شرائط صحت (یعنی سند کی صحت نہ کہ اصل واقعہ کی صحت) کے مطابق جانچتے تھے اور ان میں سے جس سند یا جن سندوں کو وہ سب سے زیادہ معتبر سمجھتے تھے ان کا انتخاب کر لیتے تھے مگر انہوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو حدیثیں انہوں نے منتخب کی ہیں بس وہی صحیح ہیں اور باقی تمام روایات غیر صحیح ہیں۔ا۔ ان کا اپنا قول یہ ہے کہ "میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث داخل نہیں کی ہے جو صحیح نہ ہو' مگر بہت سی صحیح حدیثیں چھوڑ دی ہیں تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے"۔۲۔ بلکہ ایک اور موقع پر وہ اس کی تصریح بھی کرتے ہیں کہ "میں نے جو صحیح حدیثیں چھوڑ دی ہیں وہ میری منتخب کردہ حدیثوں سے زیادہ ہیں" اور یہ کہ "مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں"۔۳۔ قریب قریب یہی بات امام مسلم نے بھی کہی ہے۔ ان کا قول ہے "میں نے اپنی کتاب میں جو روایتیں جمع کی ہیں ان کو میں صحاح کہتا ہوں مگر یہ میں نے کبھی نہیں کہا کہ جو روایت میں نے نہیں لی ہے وہ ضعیف ہے"۔۴۔

۱۔ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی رفع کر دینی ضروری ہے۔ علم حدیث کی اصطلاح میں "صحیح" سے مراد وہ حدیث ہے جس کی سند میں صحت کی مخصوص شرائط پائی جاتی ہوں۔ اس سے کم تر درجے کی سندوں کے لیے وہ دوسری اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ مگر علم حدیث سے ناواقف لوگ "صحیح" کے لفظ کو سچی حدیث کے معنی میں لے لیتے ہیں اور یہ گمان کر لیتے ہیں کہ اس کے ماسوا جتنی حدیثیں ہیں' سب جھوٹی ہیں۔

۲۔ تاریخ بغداد' ج ۲ ص ۸۔۹۔ تہذیب النووی ج ۱ ص ۷۴۔ طبقات السبکی ج ۲ ص ۷

۳۔ شروط الائمۃ الخمسہ' ص ۴۹

۴۔ توجیہ النظر' ص ۹

جھوٹی حدیثیں آخر گھڑی کیوں گئیں؟

فاضل جج نے اس بات کو بڑی اہمیت دی ہے کہ ہزار در ہزار حدیثیں گھڑی گئیں اور اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ تحقیق کرنے والے اس پر خصوصیت کے ساتھ غور کریں۔ لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ تحقیق کرنے والوں کو ساتھ ساتھ اس سوال پر بھی غور کرنا چاہئے کہ یہ ہزار در ہزار حدیثیں اس زمانے میں آخر گھڑی کیوں گئیں؟ ان کے گھڑے جانے کی وجہ یہی تو تھی کہ حضورؐ کا قول و فعل حجت تھا اور آپ کی طرف ایک غلط بات منسوب کر کے جھوٹے لوگ کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اگر وہ حجت نہ ہوتا اور کسی شخص کے لیے اپنے کسی دعوے کے حق میں حدیث لانا اور نہ لانا یکساں بے فائدہ ہوتا تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ ایک بات تصنیف کرنے کی تکلیف اٹھاتا۔ دنیا میں ایک جعل ساز وہی نوٹ تو بناتا ہے جو بازار میں قدر و قیمت رکھتا ہو۔ جس نوٹ کی کوئی قیمت نہ ہو اسے آخر کون احمق جعلی بنائے گا؟ اب اگر فرض کیجئے کہ کسی وقت جعل سازوں کا کوئی گروہ پاکستان کے ہزاروں جعلی نوٹ بنا ڈالے تو کیا اس پر کسی کا یہ استدلال کرنا صحیح ہو گا کہ پاکستان کے سارے نوٹوں کو اٹھا کر پھینک دینا چاہئے کیونکہ جعلی نوٹوں کی موجودگی میں سرے سے اس کرنسی کا ہی کوئی اعتبار نہیں ہے؟ ملک کا ہر خیر اندیش آدمی تو فوراً اس فکر میں لگ جائے گا کہ ایسے جعل سازوں کو پکڑا جائے اور ملک کی کرنسی کو اس خطرے سے بچا لیا جائے۔ ٹھیک یہی اثر آغاز اسلام میں جھوٹی احادیث کا فتنہ رونما ہونے سے اسلام کے خیر اندیش لوگوں نے لیا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ایک ایک واضع حدیث کا پتہ چلا کر اس کا نام رجال کی کتابوں میں ثبت کر دیا' ایک ایک جھوٹی حدیث کی تحقیق کر کے احادیث موضوعہ کے مجموعے قریب کر دیئے' احادیث کی صحت و سقم جانچنے کے لیے بڑے سخت اصول قائم کر کے لوگوں کو اس قابل بنا دیا کہ صحیح اور جعلی حدیثوں میں امتیاز کر سکیں اور کسی وقت بھی کوئی جھوٹی حدیث اسلامی قانون کے ماخذ میں راہ نہ پا سکے۔ البتہ منکرین سنت کا

طرز فکر اس زمانے میں بھی یہی تھا کہ غلط احادیث کے پھیل جانے سے سارا ذخیرۂ حدیث مشتبہ ہو گیا ہے' لہٰذا تمام احادیث کو اٹھا کر پھینک دینا چاہیے۔ انھیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ سنت رسولؐ کو ساقط کر دینے سے اسلامی قانون پر کس قدر جاہ کن اثر پڑے گا اور خود اسلام کی صورت کس بری طرح مسخ ہو کر رہ جائے گی۔

استدلال کی تین غلط بنیادیں

اب ہم فاضل جج کے نکات نمبر ۲' ۳ اور ۴ کو لیتے ہیں۔ ان نکات میں ان کے استدلال کا سارا انحصار تین باتوں پر ہے جو بجائے خود غلط یا اصل حقیقت سے بہت مختلف ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ حضورؐ کے زمانے میں اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں اور آپ کے بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی قرآن کو محفوظ کرنے کا تو اہتمام کیا گیا' مگر احادیث کے محفوظ کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ تیسرے یہ کہ احادیث صحابہ اور تابعین کے ذہنوں میں چھپی پڑی تھیں' وہ کبھی کبھار اتفاقاً کسی کے سامنے ان کا ذکر کر دیا کرتے تھے' اور ان روایات کو جمع کرنے کا کام حضورؐ کی وفات کے چند سو برس بعد کیا گیا۔ ان تین خلاف واقعہ بنیادوں پر فاضل جج سوالیہ انداز میں اس نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں کہ احادیث کے ساتھ یہ برتاؤ اس لیے کیا گیا کہ دراصل وہ محض ایک وقتی حیثیت رکھتی تھیں' دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ کے لیے ان کو ماخذ قانون بنانا سرے سے مطلوب ہی نہ تھا۔

سطور ذیل میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ان تینوں باتوں میں' جن پر اس نتیجے کی بنا رکھی گئی ہے' صداقت کا جوہر کس قدر ہے' اور خود وہ نتیجہ جو ان سے برآمد کیا گیا ہے' بجائے خود کہاں تک صحیح ہے۔

کتابت حدیث کی ابتدائی ممانعت اور اس کے وجوہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن دو حدیثوں کا فاضل مصنف نے حوالہ دیا ہے ان میں صرف احادیث لکھنے سے منع کیا گیا ہے' ان کو زبانی روایت کرنے

سے منع نہیں کیا گیا ہے' بلکہ ان میں سے ایک حدیث میں تو بالفاظ صریح حضورؐ نے فرمایا ہے وحدثوا عنی ولا حرج "میری باتیں زبانی بیان کرو' اس میں کوئی حرج نہیں ہے"۔

لیکن دراصل یہ بات سرے سے ہی غلط ہے کہ صرف ان دو حدیثوں کو لے کر ان سے نتائج اخذ کر ڈالے جائیں اور اس سلسلے کو تمام دوسرے متعلقہ واقعات کو نظرانداز کر دیا جائے۔ پہلی بات جو اس باب میں جاننی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے ہیں' اس وقت عرب کی پوری قوم ان پڑھ تھی اور اپنے سارے معاملات حافظے اور زبان سے چلاتی تھی۔ قریش جیسے ترقی یافتہ قبیلے کا حال مورخ بلاذری کی ایک روایت کے مطابق یہ تھا کہ اس میں صرف ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مدینہ کے انصار میں بلاذری ہی کے بقول ۱۱ سے زیادہ آدمیوں کو لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا۔ کتابت کے لیے کاغذ ناپید تھا۔ جھلیوں اور ہڈیوں اور کھجور کے پتوں پر تحریریں لکھی جاتی تھیں۔ ان حالات میں جب حضورؐ مبعوث ہوئے تو آپؐ کے سامنے اولین کام یہ تھا کہ قرآن مجید کو اس طرح محفوظ کریں کہ اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ لکھنے والے چونکہ گنے چنے آدمی تھے' اس لیے آپ کو خطرہ تھا کہ جو لوگ وحی کے الفاظ اور آیات لکھ رہے ہیں' وہی لوگ اگر آپ ہی سے سن کر آپ کے حوالہ سے دوسری چیزیں بھی لکھیں گے تو قرآن آمیزش سے نہ بچ سکے گا۔ آمیزش نہ ہو گی تو کم از کم شک پڑ جائے گا کہ ایک چیز آیت قرآنی ہے یا حدیث رسولؐ۔ اس بنا پر ابتدائی دور میں حضورؐ نے احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا۔

کتابت حدیث کی عام اجازت

مگر یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی۔ مدینہ طیبہ پہنچنے کے تھوڑی مدت بعد آپؐ نے اصحاب اور ان کے بچوں کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دلوانے کا خود اہتمام فرمایا' اور جب ایک اچھی خاصی تعداد پڑھی لکھی ہو گئی تو احادیث لکھنے کی آپ نے

اجازت دے دی۔ اس سلسلے میں مستند روایات یہ ہیں:

(۱) عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا' وہ لکھ لیتا تھا۔ لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا رسولؐ اللہ ایک انسان ہیں' کبھی رضا کی حالت میں بولتے ہیں اور کبھی غضب کی حالت میں۔ تم سب کچھ لکھ ڈالتے ہو؟ اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک حضورؐ سے پوچھ نہ لوں' آپ کی کوئی بات نہ لکھوں گا۔ پھر جب حضورؐ سے میں نے پوچھا تو آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اکتب فوالذی نفسی بیدہ ما یخرج منہ الاحق "لکھو' اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا"۔ (ابوداؤد' مسند احمد' داری' حاکم' بیہقی فی المدخل)

(۲) ابوہریرہؓ کہتے ہیں انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا "میں آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں مگر یاد نہیں رکھ سکتا"۔ حضورؐ نے فرمایا استعن بیمینک ولوما بیدہ الی الخط۔ "اپنے ہاتھ سے مدد لو" اور پھر ہاتھ کے اشارہ سے بتایا کہ لکھ لیا کرو۔ (ترمذی)

(۳) ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا۔ بعد میں (یمن کے ایک صاحب) ابوشاہ نے عرض کیا کہ میرے لیے اسے لکھوا دیجیے۔ حضورؐ نے فرمایا اکتبوا لابی شاہ۔ "ابوشاہ کو لکھ کر دے دو"۔ (بخاری' احمد' ترمذی)۔ اسی واقعہ کی تفصیل ہے جو حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری روایت میں یوں بیان ہوئی ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں حرم مکہ کے احکام اور قتل کے معاملہ میں چند قوانین بیان فرمائے۔ اہل یمن میں سے ایک شخص (ابوشاہ) نے اٹھ کر عرض کیا کہ یہ احکام مجھے لکھوا دیں۔ آپ نے فرمایا اسے یہ احکام لکھ کر دے دیئے جائیں۔ (بخاری)

(۴) ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ صحابہ میں سے کوئی مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ رکھتا

تھا مگر عبداللہ بن عمرو بن عاص اس سے مستثنٰی ہیں۔ اس لیے کہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا۔ (بخاری' مسلم' ترمذی' ابوداؤد اور نسائی)۔

(۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مختلف لوگوں نے پوچھا' اور ایک مرتبہ برسر منبر بھی آپ سے پوچھا گیا کہ آیا آپ کے پاس کوئی ایسا علم بھی ہے جو خاص طور پر آپ ہی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں میرے پاس صرف کتاب اللہ ہے' اور یہ چند احکام ہیں جو میں نے حضورؐ سے سن کر لکھ لیے تھے۔ پھر وہ تحریر آپ نے نکال کر دکھائی۔ اسؔ میں زکوٰۃ' اور قانون تعزیرات اور حرم مدینہ' اور ایسے ہی بعض اور معاملات کے متعلق چند احکام تھے (بخاری' مسلم' احمد اور نسائی نے اس مضمون کی متعدد روایات مختلف سندوں کے ساتھ نقل کی ہیں)۔

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکام کو مختلف علاقوں کی طرف بھیجتے وقت متعدد مواقع پر فوجداری اور دیوانی قوانین اور زکوٰۃ اور میراث کے احکام لکھوا کر دیے تھے جن کو ابوداؤد' نسائی' دار قطنی' دارمی' طبقات ابن سعد' کتاب الاموال لابی عبید' کتاب الخراج لابی یوسف اور المحلی لابن حزم وغیرہ کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

احادیث کو زبانی روایت کرنے کی ہمت افزائی بلکہ تاکید

یہ تو ہے معاملہ کتابت حدیث کا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' اہل عرب ہزاروں برس سے اپنے کام کتابت کے بجائے حفظ و روایت اور زبانی کلام سے چلانے کے عادی تھے' اور یہی عادت ان کو اسلام کے ابتدائی دور میں بھی برسوں تک رہی۔ ان حالات میں قرآن کو محفوظ کرنے کے لیے تو کتابت ضروری سمجھی گئی' کیونکہ اس کا لفظ لفظ آیات اور سورتوں کی ٹھیک اسی ترتیب کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی تھی' محفوظ کرنا مطلوب تھا لیکن حدیث کے معاملہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی' کیونکہ اس میں مخصوص الفاظ اور ان کی خاص

ترتیب کے وحی ہونے کا نہ دعویٰ تھا نہ تصور، بلکہ مقصود صرف ان احکام اور تعلیمات و ہدایات کو یاد رکھنا اور پہنچانا تھا جو صحابہ کو حضورؐ سے ملی تھیں۔ اس باب میں زبانی نقل و روایت کی محض کھلی اجازت ہی نہ تھی بلکہ بکثرت احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بار بار اور بکثرت اس کی تاکید فرمائی تھی۔ مثال کے طور پر چند احادیث ملاحظہ ہوں:

(۱) زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، جبیر بن مطعم اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہم حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: نضر اللّٰه امرأ سمع منا حديثا فحفظه حتى يبلغه فرب حامل فقه الى من هو افقه ورب حامل فقه ليس بفقيه۔ "اللہ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جو ہم سے کوئی بات سنے اور دوسروں تک پہنچائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص سمجھ کی بات کسی ایسے شخص کو پہنچا دیتا ہے، جو اس سے زیادہ فقیہ ہو۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص خود فقیہ نہیں ہوتا مگر فقہ پہنچانے والا بن جاتا ہے"۔ (ابوداؤد، ترمذی، احمد، ابن ماجہ، دارمی)

(۲) ابو بکرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ليبلغ الغائب الشاهد عسى ان يبلغ من هو اوعى منه "جو حاضر ہے وہ ان لوگوں تک پہنچا دے جو حاضر نہیں ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی تک پہنچا دے جو اس سے زیادہ سمائی رکھتا ہو۔ (بخاری و مسلم)

(۳) ابو شریح کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے دوسرے دن حضورؐ نے خطبہ دیا جسے میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور خوب یاد رکھا ہے اور وہ موقع اب تک میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔ خطبہ ختم کر کے حضورؐ نے فرمایا وليبلغ الشاهد الغائب۔ "جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں تک پہنچا دیں جو حاضر نہیں ہیں"۔ (بخاری)

(۴) حجۃ الوداع کے موقع پر بھی تقریر ختم کر کے آپ نے قریب قریب وہی بات فرمائی تھی جو اوپر والی دونوں حدیثوں میں منقول ہوئی ہے"۔ (بخاری)

(۵) بنی عبدالقیس کا وفد جب بحرین سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے چلتے وقت عرض کیا کہ ہم بہت دور دراز کے باشندے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان کفار حائل ہیں۔ ہم صرف حرام مہینوں میں ہی حاضر خدمت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ ہمیں کچھ ایسی ہدایات دیں جو ہم واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو بتائیں اور جنت کے مستحق ہوں۔ حضورؐ نے جواب میں ان کو دین کے چند احکام بتائے اور فرمایا احفظوہ واخبروہ من وراءکم "ان باتوں کو یاد کر لو اور وہاں کے لوگوں کو بتا دو"۔ (بخاری و مسلم)

کیا یہ ہدایات اور بار بار کی تاکیدیں یہی ظاہر کرتی ہیں کہ حضورؐ روایت حدیث کی حوصلہ افزائی نہ کرنا چاہتے تھے؟ یا یہ کہ آپ اپنے احکام کو وقتی احکام سمجھتے تھے اور یہ نہ چاہتے تھے کہ لوگوں میں وہ پھیلیں اور عام حالات پر ان کا انطباق کیا جانے لگے؟

جھوٹی حدیث روایت کرنے پر سخت وعید

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حدیث کی نشرواشاعت کے لیے تاکید فرماتے تھے' بلکہ اس کے ساتھ آپؐ نے ان کی حفاظت اور ان میں جھوٹ کی آمیزش سے احتراز کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ' ابوہریرہؓ' حضرت زبیرؓ اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار۔ "جو شخص میرا نام لے کر قصداً جھوٹی بات میری طرف منسوب کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے"۔ (بخاری و ترمذی)

ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: حدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعدہ من النار۔ "میری باتیں روایت کرو' اس میں کوئی حرج نہیں' مگر جو میری طرف جان بوجھ کر جھوٹی بات منسوب کرے گا'

وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا"۔ (مسلم)

ابن عباسؓ' ابن مسعودؓ اور جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار۔ "میری طرف سے کوئی بات بیان نہ کرو جب تک کہ تمہیں یہ علم نہ ہو کہ میں نے وہ کہی ہے' کیونکہ جو میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا' وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے گا"۔ (ترمذی' ابن ماجہ)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا لا تکذبوا علی فانہ من کذب علی فلیلج النار۔ "میرا نام لے کر جھوٹ نہ بولو' کیونکہ جو شخص میرا نام لے کر جھوٹ بولے گا وہ آگ میں داخل ہو گا"۔ (بخاری)

حضرت سلمہؓ کہتے ہیں سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول من یقل علی مالم اقل فلیتبوا مقعدہ من النار۔ "میں نے حضورؐ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص میرا نام لے کر وہ بات کہے جو میں نے نہ کہی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے"۔ (بخاری)

کیا یہ بار بار کی سخت وعید یہی ظاہر کرتی ہے کہ حضورؐ کے ارشادات کی دین میں کوئی اہمیت نہ تھی؟ اگر آپ کی سنت کی کوئی قانونی حیثیت دین میں نہ ہوتی اور اس سے احکام دین کے متاثر ہونے کا خطرہ نہ ہوتا تو کیا ضرورت پڑی تھی کہ جہنم کی وعید سنا سنا کر لوگوں کو جھوٹی حدیث روایت کرنے سے روکا جاتا؟ بادشاہوں اور رئیسوں کی طرف تاریخوں میں بہت سی غلط باتیں منسوب ہو جاتی ہیں۔ ان سے آخر دین پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر حضورؐ کی سنت کی بھی یہی حیثیت ہے تو آپ کی تاریخ کو مسخ کر دینے کی یہ سزا کیوں ہو کہ آدمی کو واصل جہنم کر دیا جائے؟

سنت رسولؐ کے حجت ہونے کی صریح دلیل

اس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب ایک مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول کی صاف صاف تصریحات موجود ہوں تو اس کے بارے میں غیر متعلق

چیزوں سے نتائج نکالنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنے رسول کو تشریح کتاب اللہ کے اختیارات بھی دیئے ہیں اور تشریعی اختیارات بھی۔ سورہ نحل کی آیت ۴۴' سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ اور سورہ حشر کی آیت ۷' جنہیں اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں' اس معاملے میں بالکل واضح ہیں' پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صاف صاف اپنے ان اختیارات کو بیان کیا ہے:

ابو رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاالفین احدکم متکئا علی اریکته یاتیه الامر من امری مما امرت به اونهیت فیقول لا ادری' ماوجدنا فی کتاب الله اتبعناه۔ میں ہرگز نہ پاؤں تم میں سے کسی شخص کو کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور اس کو میرے احکام میں سے کوئی حکم پہنچے' خواہ میں نے کسی چیز سے منع کیا ہو یا کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہو۔ اور وہ سن کر کہے کہ میں نہیں جانتا' جو کچھ ہم کتاب اللہ میں پائیں گے اس کی پیروی کریں گے"۔ (احمد' شافعی' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ' بیہقی فی دلائل النبوۃ)

مقدام بن معدیکرب کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الا انی اوتیت القرآن ومثله معه الا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه' وان ما حرم رسول الله کما حرم الله' الا لایحل لکم الحمار الاهلی' ولا کل ذی ناب من السباع..... "خبردار رہو' مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ویسی ہی ایک اور چیز بھی۔ خبردار ایسا نہ ہو کہ کوئی پیٹ بھرا شخص اپنی مسند پر بیٹھا ہوا یہ کہنے لگے کہ بس تم قرآن کی پیروی کرو' جو کچھ اس میں حلال پاؤ' اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ حالانکہ دراصل جو کچھ اللہ کا رسول حرام قرار دے وہ ویسا ہی حرام ہے جیسے اللہ کا حرام کیا ہوا۔ خبردار رہو' تمہارے لیے پالتو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ کوئی کچلیوں والا

درندہ حلال ہے۱...... (ابوداؤد' ابن ماجہ' دارمی' حاکم)

عرباض بن ساریہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور اس میں فرمایا ایحسب احدکم متکئا علی اریکتہ یظن ان اللہ لم یحرم شیئا الا ما فی القرآن الا وانی واللہ قد امرت ووعظت ونہیت عن اشیاء انہا لمثل القرآن او اکثر وان اللہ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اہل الکتب الا باذن ولا ضرب نساء ہم ولا اکل ثمار ہم اذا اعطوکم الذی علیہم "کیا تم میں سے کوئی شخص اپنی مسند پر تکیہ لگائے یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اللہ نے کوئی چیز حرام نہیں کی سوائی ان چیزوں کے جو قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں؟ خبردار رہو' خدا کی قسم میں نے جن باتوں کا حکم دیا ہے اور جو نصیحتیں کی ہیں اور جن کاموں سے منع کیا ہے وہ بھی قرآن ہی کی طرح ہیں بلکہ کچھ زیادہ۔ اللہ نے تمہارے لیے ہرگز یہ حلال نہیں کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں اجازت کے بغیر گھس جاؤ' یا ان کی عورتوں کو مارو پیٹو' یا ان کے پھل کھا جاؤ جبکہ وہ اپنے واجبات ادا کر چکے ہوں"۔۲ (ابوداؤد)

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا فمن رغب عن سنتی فلیس منی "جو شخص میری سنت سے منہ پھیرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں"۔ (بخاری و مسلم)

۱۔ یہ آخری جملے واضح کر رہے ہیں کہ کچھ لوگوں نے گدھے اور کتے اور دوسرے درندوں کو اس دلیل سے حلال ٹھیرانے کی کوشش کی ہوگی کہ قرآن میں ان کی حرمت کا کوئی حکم نہیں آیا ہے۔ اس پر حضورؐ نے یہ تقریر فرمائی ہوگی۔

۲۔ حدیث کا یہ آخری ٹکڑا صاف بتا رہا ہے کہ کچھ منافقین نے ذمیوں پر دست درازیاں کی ہوں گی اور قرآن کا سہارا لے کر کہا ہو گا کہ بتاؤ قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں داخل ہونے کے لیے بھی اجازت کی ضرورت ہے۔ اور قرآن میں کہاں ان کی عورتوں پر ہاتھ ڈالنے اور ان کے باغوں کے پھل کھا لینے سے منع کیا گیا ہے۔ اس پر حضورؐ نے یہ تقریر فرمائی ہوگی۔

اللہ اور رسول کے ان صاف صاف ارشادات کے بعد آخر اس استدلال میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ حدیثیں چونکہ لکھوائی نہیں گئیں اس لیے وہ عام انطباق کے لیے نہ تھیں۔

کیا قابلِ اعتماد صرف لکھی ہوئی چیز ہی ہوتی ہے

فاضل جج بار بار لکھنے کے مسئلے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک لکھنا اور محفوظ کرنا گویا ہم معنی ہیں۔ ان کے استدلال کا بڑا انحصار اسی خیال پر ہے کہ قرآن اس لیے قابلِ اعتماد اعتماد ہے کہ وہ لکھوا لیا گیا' اور احادیث اس لیے قابلِ اعتماد و استناد نہیں ہیں کہ وہ عہدِ رسالت اور عہدِ خلافت میں نہیں لکھوائی گئیں۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کو جس وجہ سے لکھوا لیا گیا وہ یہ تھی کہ اس کے الفاظ اور معانی دونوں من جانب اللہ تھے۔ اس کے الفاظ کی ترتیب ہی نہیں' اس کی آیتوں کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب بھی خدا کی طرف سے تھی۔ اس کے الفاظ کو دوسرے الفاظ کے ساتھ بدلنا بھی جائز نہ تھا۔ اور وہ اس لیے نازل ہوا تھا کہ لوگ ان ہی الفاظ میں اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اس کے مقابلہ میں سنت کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ وہ محض لفظی نہ تھی بلکہ عملی بھی تھی اور جو لفظی تھی اس کے الفاظ قرآن کے الفاظ کی طرح بذریعہ وحی نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ حضورؐ نے اس کو اپنی زبان میں ادا کیا تھا۔ پھر اس کا ایک بڑا حصہ ایسا تھا جسے حضورؐ کے ہم عصروں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا' مثلاً یہ کہ حضورؐ کے اخلاق ایسے تھے' حضورؐ کی زندگی ایسی تھی' اور فلاں موقع پر حضورؐ نے یوں عمل کیا۔ حضورؐ کے اقوال اور تقریریں نقل کرنے کے بارے میں بھی یہ پابندی نہ تھی کہ سننے والے انھیں لفظاً بلفظ نقل کریں' بلکہ اہلِ زبان سامعین کے لیے یہ جائز تھا اور وہ اس پر قادر بھی تھے کہ آپ سے ایک بات سن کر معنی و مفہوم بدلے بغیر اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیں۔ حضورؐ کے الفاظ کی تلاوت

مقصود نہ تھی بلکہ اس تعلیم کی پیروی مقصود تھی جو آپ نے دی ہو۔ احادیث میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی طرح یہ ترتیب محفوظ کرنا بھی ضروری نہ تھا کہ فلاں حدیث پہلے ہو اور فلاں اس کے بعد۔ اس بنا پر احادیث کے معاملے میں یہ بالکل کافی تھا کہ لوگ انہیں یاد رکھیں اور دیانت کے ساتھ انہیں لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے معاملے میں کتابت کی وہ اہمیت نہ تھی جو قرآن کے معاملے میں تھی۔

دوسری بات جسے خوب سمجھ لینا چاہیے' یہ ہے کہ کسی چیز کے سند اور حجت ہونے کے لیے اس کا لکھا ہوا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اعتماد کی اصل بنیاد اس شخص کا ان اشخاص کا بھروسے کے قابل ہونا ہے جس کے یا جن کے ذریعہ سے کوئی بات دوسروں تک پہنچے' خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔ خود قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لکھوا کر نہیں بھیجا بلکہ نبی کی زبان سے اس کو بندوں تک پہنچایا۔ اللہ نے پورا انحصار اس بات پر کیا کہ جو لوگ نبی کو سچا مانیں گے وہ نبی کے اعتماد پر قرآن کو بھی ہمارا کلام مان لیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قرآن کی جتنی تبلیغ و اشاعت کی' زبانی ہی کی۔ آپ' کے جو صحابہ مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے وہ قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی نہ لے جاتے تھے۔ لکھی ہوئی آیات اور سورتیں تو اس تھیلے میں پڑی رہتی تھیں جس کے اندر آپ انہیں کاتبان وحی سے لکھوا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ باقی ساری تبلیغ و اشاعت زبان سے ہوتی تھی اور ایمان لانے والے اس ایک صحابی کے اعتماد پر یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ وہ سنا رہا ہے' وہ حضور' ہی کا حکم ہے۔

تیسرا اہم نکتہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ لکھی ہوئی چیز بجائے خود کبھی قابل اعتماد نہیں ہوتی جب تک کہ زندہ اور قابل اعتماد انسانوں کی شہادت اس کی توثیق نہ کرے۔ محض لکھی ہوئی کوئی چیز اگر ہمیں ملے اور ہم اصل لکھنے والے کا خط نہ پہچانتے ہوں' یا لکھنے والا خود نہ بتائے کہ یہ اسی کی تحریر ہے' یا ایسے شاہد موجود نہ

ہوں جو اس امر کی تصدیق کریں کہ یہ تحریر اسی شخص کی ہے جس کی طرف منسوب کی گئی ہے تو ہمارے لیے محض وہ تحریر یقینی کیا معنی ظنی حجت بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی اصولی حقیقت ہے جسے موجودہ زمانے کا قانون شہادت بھی تسلیم کرتا ہے اور فاضل جج خود اپنی عدالت میں اس پر عمل فرماتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر جو یقین ہم رکھتے ہیں کیا اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ لکھا گیا تھا۔ کاتبین وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے جو حضورؐ نے املا کرائے تھے آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ اگر وہ موجود ہوتے تو بھی آج کون یہ تصدیق کرتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضورؐ نے لکھوائے تھے۔ خود یہ بات بھی کہ حضورؐ اس قرآن کو نزول وحی کے ساتھ لکھ لیا کرتے تھے' زبانی روایات ہی سے معلوم ہوئی ہے' ورنہ اس کے جاننے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ پس قرآن کے محفوظ ہونے پر ہمارے یقین کی اصل وجہ اس کا لکھا ہوا ہونا نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ زندہ انسان زندہ انسانوں سے مسلسل اس کو سنتے اور آگے زندہ انسانوں تک اسے پہنچاتے چلے آ رہے ہیں۔ لہذا یہ غلط خیال ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ کسی چیز کے محفوظ ہونے کی واحد سبیل بس اس کا لکھا ہوا ہونا ہے۔

ان امور پر اگر فاضل جج اور ان کی طرح سوچنے والے حضرات غور فرمائیں تو انہیں یہ تسلیم کرنے میں انشاء اللہ کوئی زحمت نہ پیش آئے گی کہ اگر معتبر ذرائع سے کوئی چیز پہنچے تو وہ سند بننے کی پوری قابلیت رکھتی ہے' خواہ وہ لکھی نہ گئی ہو۔

کیا احادیث ڈھائی سو برس تک گوشہ خمول میں پڑی رہیں؟

پھر نکتہ نمبر ۴ کے آخر میں فاضل جج کا یہ ارشاد کہ "احادیث نہ یاد کی گئیں' نہ محفوظ کی گئیں بلکہ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کر کے مر گئے یہاں تک کہ ان کی وفات کے کئی سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا"" یہ نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے بلکہ درحقیقت یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا اور آپ کے ساتھ ابتدائی دور کے

مسلمانوں کی عقیدت کا بہت ہی حقیر اندازہ ہے۔ واقعات سے قطع نظر ایک شخص محض اپنی عقل ہی پر زور ڈال کر صحیح صورت حال کا تصور کرے تو وہ کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جس عظیم الشان شخصیت نے عرب کے لوگوں کو اخلاق و تہذیب اور عقائد و اعمال کی انتہائی پستیوں سے نکال کر بلند ترین مقام تک پہنچا دیا تھا۔ اس کی باتوں اور اس کے کاموں کو وہی لوگ اس قدر ناقابل التفات سمجھتے تھے کہ انہوں نے اس کی کوئی بات یاد رکھنے کی کوشش نہ کی' نہ دوسروں کے سامنے اتفاقاً ذکر آ جانے سے بڑھ کر کبھی اس کا چرچا کیا' نہ بعد کی آنے والی نسلوں نے اس کو کوئی اہمیت دی کہ اس کے دیکھنے والوں سے کبھی اس کے حالات پوچھتے۔ ایک معمولی لیڈر تک سے جس کسی کو شرف صحبت نصیب ہو جاتا ہے تو وہ اس سے اپنی ملاقاتوں کی ایک ایک بات یاد رکھتا ہے اور دوسروں کے سامنے اس کا ذکر کرتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد نئی آنے والی نسلوں کے لوگ جا جا کر اس کے ملنے والوں سے اس کے حالات دریافت کرتے ہیں۔ آخر جسٹس محمد شفیع صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا سمجھ لیا ہے کہ حضورؐ کو آپ کے ہم عصر اور آپ سے متصل زمانے کے لوگ اتنے التفات کا بھی مستحق نہ سمجھتے تھے؟

اب ذرا اصل صورت واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے لیے ایک ایسے پیشوا تھے جن سے وہ ہر وقت عقائد اور عبادات اور اخلاق اور تہذیب و شائستگی کا سبق حاصل کرتے تھے۔ آپ کی زندگی کے ایک ایک رخ اور ایک ایک پہلو کو دیکھ کر وہ پاکیزہ انسانوں کی طرح رہنا سیکھتے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ آپ کی بعثت سے پہلے ہم کیا تھے اور آپ نے ہمیں کیا کچھ بنا دیا ہے۔ ان کے لیے ہر پیش آنے والے مسئلے میں مفتی بھی آپ ہی تھے اور قاضی بھی آپ۔ آپ ہی کی قیادت میں وہ لڑتے بھی تھے اور صلح بھی کرتے تھے۔ ان کو تجربہ تھا کہ اس قیادت کی پیروی میں ہم کہاں سے چلے تھے اور بالآخر کہاں پہنچ کر رہے۔ اس بنا پر وہ آپ کی ایک ایک بات کو یاد رکھتے تھے جو قریب رہتے تھے وہ بالالتزام

آپ کی صحبتوں میں بیٹھتے تھے، جنہیں کسی وقت آپ کی مجلس سے غیر حاضر رہنا ہوتا تو وہ دوسروں سے پوچھ کر معلوم کرتے تھے کہ آج آپ نے کیا کیا اور کیا کہا۔ دور دور سے آنے والے لوگ اپنے اوقات کو جو آپ کے ساتھ بسر ہو جاتے تھے، اپنا حاصل زندگی سمجھتے تھے اور عمر بھر ان کی یاد دل سے نہ نکلتی تھی جنہیں حاضر ہونے کا موقع نصیب نہ ہوتا تھا۔ وہ ہر اس شخص کے گرد اکٹھے ہو جاتے تھے جو آپ سے مل کر آتا تھا اور کرید کرید کر ایک ایک بات اس سے پوچھتے تھے جنہوں نے آپ کو دور سے کبھی دیکھا تھا یا کسی بڑے مجمع میں صرف آپ کی تقریر سن لی تھی وہ جیتے جی اس موقع کو نہ بھولتے تھے اور فخریہ اپنے اس شرف کو بیان کرتے تھے کہ ہماری آنکھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور ہمارے کان آپؐ کی تقریر سن چکے ہیں۔ پھر حضورؐ کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں، ان کے لیے تو دنیا میں سب سے اہم اگر کوئی چیز تھی تو وہ اس رسول عظیم کی سیرت تھی جس کی قیادت کے معجزے نے عرب کے شتربانوں کو اٹھا کر سندھ سے اسپین تک کا فرمانروا بنا دیا تھا۔ وہ ایک ایک ایسے شخص کے پاس پہنچتے تھے جس نے آپؐ کی صحبت پائی تھی، یا آپؐ کو کبھی دیکھا تھا، یا آپؐ کی کوئی تقریر سنی تھی اور جوں جوں صحابہ دنیا سے اٹھتے چلے گئے، یہ اشتیاق بڑھتا گیا، حتیٰ کہ تابعین کے گروہ نے وہ سارا علم نچوڑ لیا جو سیرت پاک کے متعلق صحابہ سے ان کو مل سکتا تھا۔

صحابہؓ کی روایت حدیث

عقل گواہی دیتی ہے کہ ایسا ضرور ہوا ہو گا اور تاریخ گواہی دیتی ہے کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا ہے۔ آج حدیث کا جو علم دنیا میں موجود ہے وہ تقریباً دس ہزار صحابہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ تابعین نے صرف ان کی احادیث ہی نہیں لی ہیں بلکہ ان سب صحابیوں کے حالات بھی بیان کر دیے ہیں۔ اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس نے حضورؐ کی کتنی صحبت پائی ہے یا کب اور کہاں آپ کو دیکھا ہے اور کن کن مواقع پر آپ کی خدمت میں حاضری دی ہے۔ فاضل جج تو یہ فرماتے ہیں کہ احادیث ابتدائی

دور کے مسلمانوں کے ذہن میں دفن پڑی رہیں اور دو ڈھائی صدی بعد امام بخاریؒ اور ان کے ہم عصروں نے انہیں کھود کر نکالا۔ لیکن تاریخ ہمارے سامنے جو نقشہ پیش کرتی ہے وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ صحابہؓ میں سے جن حضرات نے سب سے زیادہ روایات بیان کی ہیں' ان کی اور ان کے مرویات کی فہرست ملاحظہ ہو:

	تعداد احادیث
ابو ہریرہؓ' متوفی ۵۷ھ	۵۳۷۴
(ان کے شاگردوں کی تعداد ۸۰۰ کے لگ بھگ تھی اور ان کے بکثرت شاگردوں نے ان کی احادیث کو قلمبند کیا تھا)	
ابو سعید خدری' متوفی ۴۶ھ	۱۱۷۰
جابر بن عبداللہ' متوفی ۷۴ھ	۱۵۴۰
انس بن مالک' متوفی ۹۳ھ	۱۲۸۶
ام المومنین عائشہ صدیقہ' متوفیہ ۵۹ھ	۲۲۱۰
عبداللہ بن عباس' متوفی ۶۸ھ	۱۶۶۰
عبداللہ بن عمر' متوفی ۷۰ھ	۱۶۳۰
عبداللہ بن عمرو بن عاص' متوفی ۶۳ھ	۷۰۰
عبداللہ بن مسعود' متوفی ۳۲ھ	۸۴۸

کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صحابہ کرامؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو اپنے سینوں میں دفن کر کے یونہی اپنے ساتھ دنیا سے لے گئے؟

دور صحابہؓ سے امام بخاریؒ کے دور تک علم حدیث کی مسلسل تاریخ

اس کے بعد ان تابعین کو دیکھیے جنہوں نے صحابہ کرامؓ سے سیرت پاکؐ کا علم حاصل کیا اور بعد کی نسلوں تک اس کو منتقل کیا۔ ان کی تعداد کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف طبقات ابن سعد میں چند مرکزی شہروں کے جن تابعین کے

حالات ملتے ہیں' وہ حسب ذیل ہیں:

مدینہ	۴۸۴
مکہ	۱۳۱
کوفہ	۴۱۳
بصرہ	۱۹۳

ان میں سے جن اکابر تابعین نے حدیث کے علم کو حاصل کرنے' محفوظ کرنے اور آگے پہنچانے کا سب سے بڑھ کر کام کیا ہے' وہ یہ ہیں:

نام	پیدائش	وفات
سعید بن المسیب	۱۴ھ	۹۳ھ
حسن بصری	۲۱ھ	۱۱۰ھ
ابن سیرین	۳۳ھ	۱۱۰ھ
عروہ بن زبیر	۲۲ھ	۹۴ھ
(انہوں نے سیرت رسولؐ پر پہلی کتاب لکھی)		
علی بن حسین (زین العابدین)	۳۸ھ	۹۴ھ
مجاہد	۲۱ھ	۱۰۴ھ
قاسم بن محمد بن ابی بکر	۳۷ھ	۱۰۶ھ
شریح (حضرت عمرؓ کے زمانے میں قاضی مقرر ہوئے)	"	۷۸ھ
مسروق (حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں مدینہ آئے)	"	۶۳ھ
اسود بن یزید	"	۷۵ھ
مکحول	"	۱۱۲ھ
رجاء بن حیوہ	"	۱۰۳ھ
ہمام بن منبہ	۴۰ھ	۱۳۱ھ

(انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے

آج بھی موجود ہے اور شائع ہو چکا ہے)۔

نام	پیدائش	وفات
سالم بن عبداللہ بن عمر		۱۰۶ھ
نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر		۱۱۷ھ
سعید بن جبیر	۴۵ھ	۹۵ھ
سلیمان الاعمش	۶۱ھ	۱۴۸ھ
ایوب السختیانی	۶۶ھ	۱۳۱ھ
محمد بن المنکدر	۵۴ھ	۱۳۰ھ
ابن شہاب زہری	۵۸ھ	۱۲۴ھ
(انہوں نے حدیث کا بہت بڑا تحریری ذخیرہ چھوڑا)		
سلیمان بن یسار	۳۴ھ	۱۰۷ھ
عکرمہ مولیٰ ابن عباس	۲۲ھ	۱۰۵ھ
عطاء بن ابی رباح	۲۷ھ	۱۱۵ھ
قتادہ بن دعامہ	۶۱ھ	۱۱۷ھ
عامر الشعبی	۱۷ھ	۱۰۴ھ
علقمہ		۶۲ھ
(یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جوان تھے مگر حضورؐ سے ملے نہیں)		
ابراہیم النخعی	۴۶ھ	۹۶ھ
یزید بن ابی حبیب	۵۳ھ	۱۲۸ھ

ان حضرات کی تواریخ پیدائش و وفات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں نے صحابہؓ کے عہد کا بہت بڑا حصہ دیکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر وہ تھے جنہوں نے صحابہؓ کے گھروں میں اور صحابیات کی گودوں میں پرورش پائی ہے' اور بعض وہ تھے جن کی عمر کسی نہ کسی صحابی کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔ ان کے

حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک شخص نے بکثرت صحابہؓ سے مل کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کیے ہیں اور آپ کے ارشادات اور فیصلوں کے متعلق وسیع واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ اسی وجہ سے روایت حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ انہی لوگوں سے بعد کی نسلوں کو پہنچا ہے۔ تاوقتیکہ کوئی شخص یہ فرض نہ کر لے کہ پہلی صدی ہجری کے تمام مسلمان منافق تھے' اس بات کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ ان لوگوں نے گھر بیٹھے حدیثیں گھڑلی ہوں گی اور پھر بھی پوری امت نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا ہو گا اور ان کو اپنے اکابر علماء میں شمار کیا ہو گا۔

اس کے بعد اصاغر تابعین اور تبع تابعین کا وہ گروہ ہمارے سامنے آتا ہے جو ہزارہا کی تعداد میں تمام دنیائے اسلام میں پھیلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے بہت بڑے پیمانے پر تابعین سے احادیث لیں اور دور دور کے سفر کر کے ایک ایک علاقے کے صحابہ اور ان کے شاگردوں کا علم جمع کیا' ان کی چند نمایاں شخصیتیں یہ ہیں:

نام	پیدائش	وفات
جعفر بن محمد بن علی (جعفر الصادق)	۸۰ھ	۱۴۸ھ
ابو حنیفہ النعمان (امام اعظم)	۸۰ھ	۱۵۰ھ
شعبہ بن الحجاج	۸۳ھ	۱۶۰ھ
لیث بن سعد	۹۳ھ	۱۶۵ھ
ربیعہ الرائے (استاذ امام مالک)		۱۳۶ھ
سعید بن عروبہ		۱۵۶ھ
مسعر بن کدام		۱۲۶ھ
عبدالرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر		۱۲۶ھ
سفیان الثوری	۹۷ھ	۱۶۱ھ
حماد بن زید	۹۸ھ	۱۷۹ھ

دوسری صدی ہجری کے جامعین حدیث

یہی دور تھا جس میں حدیث کے مجموعے لکھنے اور مرتب کرنے کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع ہوا۔ اس زمانے میں جن لوگوں نے احادیث کے مجموعے مرتب کیے وہ حسب ذیل ہیں:

ربیع بن صبیح وفات ۱۶۰ھ	انہوں نے ایک ایک فقہی عنوان پر الگ الگ رسائل مرتب کیے
سعید بن عروبہ " ۱۵۶ھ	------ ایضاً -------
موسیٰ بن عقبہ " ۱۴۱ھ	انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کی تاریخ مرتب کی
امام مالک پیدائش ۹۳ھ ۔ ۱۷۹ھ	انہوں نے احکام شرعی کے متعلق احادیث و آثار کو جمع کیا۔
ابن جریج " ۸۰ھ " ۱۵۰ھ	------ ایضاً -------
امام اوزاعی " ۸۸ھ " ۱۸۶ھ	------ ایضاً -------
سفیان ثوری " ۹۷ھ " ۱۶۱ھ	------ ایضاً -------
حماد بن سلمہ بن دینار " ۱۷۶ھ	------ ایضاً -------
امام ابو یوسف " ۱۱۳ھ " ۱۸۳ھ	------ ایضاً -------
امام محمد " ۱۳۱ھ " ۱۸۹ھ	------ ایضاً -------
محمد بن اسحاق " ۱۵۱ھ۔	انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک مرتب کی۔
ابن سعد " ۱۶۸ھ " ۲۲۰ھ	انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے حالات جمع کیے۔
عبید اللہ بن موسیٰ العبسی " ۲۱۳ھ	انہوں نے ایک ایک صحابی کی روایات الگ الگ جمع کیں۔

مسدد بن مسرھد البصری " ۲۱۸ھ ———— ایضاً ————

اسد بن موسیٰ " ۲۱۲ھ ———— ایضاً ————

نعیم بن حماد الخزاعی وفات ۲۱۸ھ ———— ایضاً ————

امام احمد بن حنبل پیدائش ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ ———— ایضاً ————

اسحاق بن راھویہ پیدائش ۱۶۱ھ وفات ۲۳۰ھ ———— ایضاً ————

عثمان بن ابی شیبہ " ۱۵٦ھ " ۲۳۱ھ ———— ایضاً ————

ابوبکر بن ابی شیبہ " ۱۵۹ھ " ۲۳۵ھ انہوں نے فقہی ابواب اور صحابہؓ کی جداگانہ مرویات دونوں کے لحاظ سے احادیث جمع کیں۔

ان میں سے امام مالک' امام ابویوسف' امام محمد' محمد بن اسحاق' ابن سعد' امام احمد بن حنبل اور ابوبکر ابن ابی شیبہ کی کتابیں آج تک موجود ہیں اور شائع ہو چکی ہیں۔ نیز موسیٰ بن عقبہ کی کتاب المغازی کا ایک حصہ بھی شائع ہو چکا ہے اور جن حضرات کی کتابیں آج نہیں ملتیں وہ بھی حقیقت ضائع نہیں ہوئی ہیں' بلکہ ان کا پورا مواد بخاری و مسلم اور ان کے ہم عصروں نے اور ان کے بعد آنے والوں نے اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ اس لیے لوگ ان سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔

امام بخاریؒ کے دور تک علم حدیث کی اس مسلسل تاریخ کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص فاضل جج کے ان ارشادات کو آخر کیا وزن دے سکتا ہے' کہ "احادیث نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں بلکہ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کر کے مر گئے یہاں تک کہ ان کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا"۔ اور یہ کہ "بعد میں پہلی مرتبہ رسول اللہ کے تقریباً ایک سو برس بعد احادیث کو جمع کیا گیا مگر ان کا ریکارڈ اب محفوظ نہیں

ہے"۔ اس موقع پر ہم یہ عرض کرنے کے لیے مجبور ہیں کہ ہائی کورٹ جیسی بلند پایہ عدالت کے ججوں کو علمی مسائل پر اظہار خیال کرنے میں اس سے زیادہ محتاط اور باخبر ہونا چاہیے۔

احادیث میں اختلاف کی حقیقت

آگے چل کر فاضل جج نے اپنے نکتہ ششم میں احادیث کے "انتہائی مشکوک" اور "ناقابل اعتماد" ہونے کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ "بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعین حدیث متفق ہوں"۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو سرسری طور پر چند مختلف احادیث پر ایک نگاہ ڈال کر تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر تفصیل کے ساتھ کتب حدیث کا متقابل مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اتفاق بہت زیادہ اور اختلاف بہت کم ہے۔ پھر جن میں اختلاف ہے، ان کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ تر اختلافات حسب ذیل چار نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کے پائے جاتے ہیں:

ایک یہ کہ مختلف راویوں نے ایک ہی بات یا واقعہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے اور ان کے درمیان معانی میں کوئی اہم اختلاف نہیں ہے، یا مختلف راویوں نے ایک ہی واقعہ یا تقریر کے مختلف اجزاء نقل کیے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود حضورؐ نے ایک مضمون کو مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ تیسرے یہ کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے عمل فرمایا ہے۔ چوتھے یہ کہ ایک حدیث پہلے کی ہے اور دوسری حدیث بعد کی اور اس نے پہلی کو منسوخ کر دیا ہے۔

ان چار اقسام کو چھوڑ کر جن احادیث کا باہمی اختلاف رفع کرنے میں واقعی مشکل پیش آتی ہے ان کی تعداد پورے ذخیرۂ حدیث میں ایک فی صدی سے بھی بہت کم ہے۔ کیا چند روایات میں اس خرابی کا پایا جانا یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی ہے کہ پورا ذخیرۂ حدیث مشکوک اور ناقابل اعتماد ہے؟ روایات کسی ایک ناقابل

تقسیم کل کا نام نہیں ہے۔ جس کے کسی جزء کے ساقط ہو جانے سے کل کا ساقط ہو جانا لازم آئے۔ ہر روایت اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اور اپنی جداگانہ سند کے ساتھ آئی ہے۔ اس بنا پر ایک دو نہیں' دو چار سو روایتوں کے ساقط ہو جانے سے بھی بقیہ روایات کا سقوط لازم نہیں آ سکتا۔ علمی تنقید پر جو جو روایات بھی پوری اتریں انہیں ماننا ہی ہو گا۔

محدثین کے درمیان اختلاف کی ایک اور صورت یہ ہے کہ کسی روایت کی سند کو ایک محدث اپنی تنقید کے اعتبار سے درست سمجھتا ہے۔ اور دوسرا محدث اسے کمزور قرار دیتا ہے۔ یہ رائے اور تحقیق کا اختلاف ہے جس سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیا عدالتوں میں کسی شہادت کو قبول کرنے اور نہ قبول کرنے پر اختلاف کبھی نہیں ہوتا؟

کیا حافظہ سے نقل کی ہوئی روایات ناقابل اعتماد ہیں؟

اب ہمیں فاضل جج کے آخری دو نکتوں کو لینا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کے عربوں کا حافظہ جیسا کچھ قوی ہے' پہلی صدی ہجری کے عربوں کا حافظہ بھی اتنا ہی قوی ہو گا۔ تاہم اسے خواہ کتنا ہی قوی مان لیا جائے' کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابل اعتماد سمجھی جا سکتی ہیں؟ پھر ان کا ارشاد ہے کہ "ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے پہنچتے بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور ہر ذہن کے اپنے خیالات اور تعصبات اس کو موڑتے توڑتے چلے جاتے ہیں"۔ یہ دو مزید وجہیں ہیں جن کی بنا پر وہ احادیث کو اعتماد و استناد کے قابل نہیں سمجھتے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ تجربے اور مشاہدے کے خلاف ہے۔ تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آدمی اپنی جس قوت سے زیادہ کام لیتا ہے' وہ ترقی کرتی ہے اور جس سے کام لیتا ہے وہ کمزور ہو جاتی ہے۔ یہ بات جس طرح تمام انسانی قوتوں کے معاملے میں صحیح ہے' حافظہ کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اہل عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہزاروں برس سے اپنا کام تحریر کے بجائے یاد

اور حافظے سے چلانے کے خوگر تھے۔ ان کے تاجر لاکھوں روپے کا لین دین کرتے تھے اور کوئی لکھا پڑھی نہ ہوتی تھی۔ پائی پائی کا حساب' اور بیسیوں گاہکوں کا تفصیلی حساب وہ نوک زبان پر رکھتے تھے۔ ان کی قبائلی زندگی میں نسب اور خونی رشتوں کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ سب کچھ بھی حافظے میں محفوظ رہتا اور زبانی روایت سے ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک پہنچتا تھا۔ ان کا سارا لٹریچر بھی کاغذ پر نہیں بلکہ لوح قلب پر لکھا ہوا تھا۔ ان کی یہی عادت تحریر کا رواج ہو جانے کے بعد بھی تقریباً ایک صدی تک جاری رہی۔ اس لیے کہ قومی عادتیں بدلتے بدلتے ہی بدلتی ہیں۔ وہ کاغذ کی تحریر پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے حافظے پر اعتماد کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ انھیں اس پر فخر تھا' اور ان کی نگاہ سے وہ شخص گر جاتا تھا جس سے کوئی بات پوچھی جائے اور وہ زبانی بتانے کے بجائے گھر سے کتاب لا کر اس کا جواب دے۔ ایک مدت دراز تک وہ لکھنے کے باوجود یاد کرتے تھے اور تحریر پڑھ کر سنانے کے بجائے نوک زبان سے سنانا نہ صرف باعث عزت سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک آدمی کے علم پر اعتماد بھی اسی طریقے سے قائم ہوتا تھا۔

کوئی وجہ نہیں کہ حافظے کی یہ کیفیت آج کے عربوں میں باقی رہے۔ صدیوں سے کتابت پر اعتماد کرتے رہنے اور حافظے سے کام کم لینے کے باعث اب کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کی یادداشت قدیم عربوں کی سی رہ جائے لیکن عربوں اور غیر عربوں' سب میں آج بھی اس امر کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ان پڑھ لوگ اور اندھے آدمی پڑھے لکھے اور بینا انسانوں کی بہ نسبت زیادہ یادداشت رکھتے ہیں۔ ناخواندہ تاجروں میں بکثرت لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں جنھیں بہت سے گاہکوں کے ساتھ اپنا ہزارہا روپے کا لین دین پوری تفصیل کے ساتھ یاد رہتا ہے۔ بے شمار اندھے ایسے موجود ہیں جن کی قوت حافظہ آدمی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ تحریر پر اعتماد کر لینے کے بعد ایک قوم کے حافظے کی وہ حالت باقی نہیں رہ سکتی جو ناخواندگی کے دور میں اس کی تھی۔

احادیث کے محفوظ رہنے کی اصل علت

یہ اس معاملے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ صحابہ کے لیے خاص طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو ٹھیک ٹھیک یاد رکھنے اور انھیں صحیح صحیح بیان کرنے کے کچھ مزید محرکات بھی تھے جنھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

اولاً' وہ سچے دل سے آپ' کو خدا کا نبی' اور دنیا کا سب سے بڑا انسان سمجھتے تھے۔ ان کے دلوں پر آپ' کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کے لیے آپ' کی بات اور آپ' کے واقعات و حالات کی حیثیت عام انسانی وقائع جیسی نہ تھی کہ وہ ان کو اپنے معمولی حافظے کے حوالے کر دیتے۔ ان کے لیے تو ایک ایک لمحہ جو انہوں نے آپ کی معیت میں گزارا' ان کی زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی لمحہ تھا اور اس کی یاد کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔

ثانیاً' وہ آپ کی ایک ایک تقریر' ایک ایک گفتگو' اور آپ کی زندگی کے ایک ایک عمل سے وہ علم حاصل کر رہے تھے جو انھیں اس سے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ وہ خود جانتے تھے کہ ہم اس سے پہلے سخت جاہل اور گمراہ تھے' اور یہ پاکیزہ ترین انسان اب ہم کو صحیح علم دے رہا ہے اور مہذب انسان کی طرح جینا سکھا رہا ہے۔ اس لیے وہ پوری توجہ کے ساتھ ہر بات سنتے اور ہر فعل کو دیکھتے تھے' کیونکہ انھیں اپنی زندگی میں عملاً اسی کا نقش پیوست کرنا تھا' اسی کی نقل اتارنی تھی' اور اسی کی راہنمائی میں کام کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس شعور و احساس کے ساتھ آدمی جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے اسے یاد رکھنے میں وہ اتنا سہل انگار نہیں ہو سکتا جتنا وہ کسی میلے یا کسی بازار میں سنی اور دیکھی ہوئی باتیں یاد رکھنے میں ہو سکتا ہے۔

ثالثاً' وہ قرآن کی رو سے بھی یہ جانتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار متنبہ کرنے سے بھی ان کو شدت کے ساتھ اس بات کا احساس تھا کہ خدا کے نبی پر افترا کرنا بہت بڑا گناہ ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہو گی۔ اس بنا پر وہ حضورؐ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات بیان کرنے میں سخت محتاط تھے۔ صحابہ کرام میں کوئی

ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی صحابی نے اپنی کسی ذاتی غرض سے یا اپنا کوئی کام نکالنے کے لیے حضورؐ کے نام سے کبھی ناجائز فائدہ اٹھایا ہو' حتیٰ کہ ان کے درمیان جب اختلافات برپا ہوئے اور دو خونریز لڑائیاں تک ہو گئیں' اس وقت بھی فریقین میں سے کسی ایک شخص نے بھی کوئی حدیث گھڑ کر دوسرے کے خلاف استعمال نہیں کی۔ اس قسم کی حدیثیں بعد کے ناخدا ترس لوگوں نے تو ضرور تصنیف کیں مگر صحابہؓ کے واقعات میں اس کی مثال ناپید ہے۔

رابعاً' وہ اپنے اوپر اس بات کی بہت بڑی ذمہ داری محسوس کرتے تھے کہ بعد کے آنے والوں کو حضورؐ کے حالات اور آپ کی ہدایات و تعلیمات بالکل صحیح صورت میں پہنچائیں اور اس میں کسی قسم کا مبالغہ یا آمیزش نہ کریں' کیونکہ ان کے نزدیک یہ دین تھا اور اس میں اپنی طرف سے تغیر کر دینا کوئی معمولی جرم نہیں بلکہ ایک عظیم خیانت تھا۔ اسی وجہ سے صحابہ کے حالات میں اس قسم کے بکثرت واقعات ملتے ہیں کہ حدیث بیان کرتے ہوئے وہ کانپ جاتے تھے' ان کے چہرہ کا رنگ اڑ جاتا تھا' جہاں ذرہ برابر بھی خدشہ ہوتا تھا کہ شاید حضورؐ کے الفاظ کچھ اور ہوں وہاں بات نقل کر کے او کما قال کہہ دیتے تھے تاکہ سننے والا ان کے الفاظ کو بعینہٖ حضورؐ کے الفاظ نہ سمجھ لے۔

خامساً' اکابر صحابہ خاص طور پر عام صحابیوں کو احادیث روایت کرنے میں احتیاط کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ اس معاملے میں سہل انگاری برتنے سے شدت کے ساتھ روکتے تھے اور بعض اوقات ان سے حضورؐ کا کوئی ارشاد سن کر شہادت طلب کرتے تھے تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ دوسروں نے بھی یہ بات سنی ہے۔ اسی اطمینان کے لیے صحابیوں نے ایک دوسرے کے حافظے کا امتحان بھی لیا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کو حج کے موقع پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے ایک حدیث پہنچی۔ دوسرے سال حج میں ام المومنین نے پھر اسی حدیث کو دریافت کرنے کے لیے ان کے پاس آدمی بھیجا۔ دونوں مرتبہ حضرت عبداللہ کے بیان میں

ایک حرف کا فرق بھی نہ تھا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا واقعی عبداللہ کو بات ٹھیک یاد ہے۔ (بخاری و مسلم)

سادساً' حضورؐ کی ہدایات و تعلیمات کا بہت بڑا حصہ وہ تھا جس کی حیثیت محض زبانی روایات ہی کی نہ تھی' بلکہ صحابہؓ کے معاشرے میں' ان کی شخصی زندگیوں میں' ان کے گھروں میں' ان کی معیشت اور حکومت اور عدالت میں اس کا پورا ٹھپہ لگا ہوا تھا جس کے آثار و نقوش ہر طرف لوگوں کو چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ایسی ایک چیز کے متعلق کوئی شخص حافظے کی غلطی' یا اپنے ذاتی خیالات و تعصبات کی بنا پر کوئی نرالی بات لا کر پیش کرتا بھی تو وہ چل کہاں سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی نرالی حدیث آئی بھی ہے تو وہ الگ پہچان لی گئی ہے اور محدثین نے اس کی نشاندہی کر دی ہے کہ اس خاص راوی کے سوا یہ بات کسی اور نے بیان نہیں کی ہے۔ یا اس پر عمل درآمد کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

احادیث کی صحت کا ایک ثبوت

ان سب کے علاوہ ایک نہایت اہم بات اور بھی ہے جسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عربی زبان جانتے ہیں اور جنہوں نے محض سرسری طور پر کبھی کبھار متفرق احادیث کا مطالعہ نہیں کر لیا ہے بلکہ گہری نگاہ سے حدیث کی پوری پوری کتابوں کو' یا کم از کم ایک ہی کتاب (مثلاً بخاری یا مسلم) کو از اول تا آخر پڑھا ہے۔ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ایک خاص زبان اور آپ کا اپنا ایک مخصوص انداز بیان ہے جو تمام صحیح احادیث میں بالکل یکسانیت اور یک رنگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ قرآن کی طرح آپ کا لٹریچر اور اسٹائل اپنی ایسی انفرادیت رکھتا ہے کہ اس کی نقل کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ اس میں آپ کی شخصیت بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں آپ کا بلند منصب و مقام جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے آدمی کا دل یہ گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ باتیں محمدؐ رسول اللہ کے سوا کوئی دوسرا شخص کہہ نہیں سکتا۔ جن لوگوں نے

کثرت سے احادیث کو پڑھ کر حضورؐ کی زبان اور طرز بیان کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے' وہ حدیث کی سند کو دیکھے بغیر محض متن کو پڑھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع' کیونکہ موضوع کی زبان ہی بتا دیتی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان نہیں ہے حتیٰ کہ صحیح احادیث تک میں روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کا فرق صاف محسوس ہو جاتا ہے' کیونکہ جہاں راوی نے حضورؐ کی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے' وہاں آپ کے اسٹائل سے واقفیت رکھنے والا یہ بات پا لیتا ہے کہ یہ خیال اور بیان تو حضورؐ ہی کا ہے لیکن زبان میں فرق ہے۔ یہ انفرادی خصوصیت احادیث میں کبھی نہ پائی جا سکتی اگر بہت سے کمزور حافظوں نے ان کو غلط طریقوں سے نقل کیا ہوتا اور بہت سے ذہنوں کی کارفرمائی نے ان کو اپنے اپنے خیالات و تعصبات کے مطابق توڑا مروڑا ہوتا۔ کیا یہ بات عقل میں سماتی ہے کہ بہت سے ذہن مل کر ایک یک رنگ لٹریچر اور ایک انفرادی اسٹائل پیدا کر سکتے ہیں؟

اور یہ معاملہ صرف زبان و ادب کی حد تک ہی نہیں ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ طہارت جسم و لباس سے لے کر صلح و جنگ اور بین الاقوامی معاملات تک زندگی کے تمام مختلف شعبوں اور ایمان و اخلاق سے لے کر علامات قیامت اور احوال آخرت تک تمام فکری اور اعتقادی مسائل میں صحیح احادیث ایک ایسا نظام فکر و عمل پیش کرتی ہیں جو اول سے آخر تک اپنا ایک ہی مزاج رکھتا ہے اور جس کے تمام اجزاء میں پورا پورا منطقی ربط ہے۔ ایسا مربوط اور ہم رنگ نظام اور اتنا مکمل وحدانی نظام لازماً ایک ہی فکر سے بن سکتا ہے' بہت سے مختلف ذہن مل کر اسے نہیں بنا سکتے۔ یہ ایک اور اہم ذریعہ ہے جس سے موضوع احادیث ہی نہیں مشکوک احادیث تک پہچانی جاتی ہیں۔ سند کو دیکھنے سے پہلے ایک بصیرت رکھنے والا آدمی اس طرح کی کسی حدیث کے مضمون ہی کو دیکھ کر یہ بات صاف محسوس کر لیتا ہی کہ صحیح احادیث اور قرآن مجید نے مل کر اسلام کا جو نظام فکر اور نظام حیات بنایا ہے اس کے اندر یہ مضمون کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتا کیونکہ

اس کا مزاج پورے نظام کے مزاج سے مختلف نظر آتا ہے۔

چند احادیث پر فاضل جج کے اعتراضات

آگے چل کر فاضل جج فرماتے ہیں کہ احادیث کے مجموعوں میں ایسی حدیثیں بھی موجود ہیں جن کو صحیح ماننا سخت مشکل ہے۔ اس کے لیے مثال کے طور پر وہ ۱۳ حدیثیں مشکوٰۃ کے اس انگریزی ترجمے سے نقل فرماتے ہیں جو الحاج مولوی فضل الکریم صاحب ایم اے بی ایل نے کیا ہے اور کلکتہ سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان احادیث پر محترم جج صاحب کے اعتراضات کے بارے میں کچھ عرض کریں، ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ مشکوٰۃ کے اس ترجمے میں مترجم نے ایسی فاش غلطیاں کی ہیں جو علم حدیث ہی سے نہیں، عربی زبان سے بھی ان کی ناواقفیت کا ثبوت دیتی ہیں۔ اور بدقسمتی سے فاضل جج نے ان تمام غلطیوں سمیت اس کی عبارتیں نقل کردی ہیں۔ اگرچہ اس کا مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن ہم یہاں صرف اس بات کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس معاملے کا ذکر کرتے ہیں کہ پاکستان اس وقت دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست ہے۔ اس کی عدالت عالیہ کے فیصلے میں حدیث کی قانونی حیثیت پر اس قدر دور رس بحث کی جائے، اور پھر حدیث کے علم و فن سے اتنی سرسری، بلکہ ناقص واقفیت کا کھلا کھلا ثبوت بہم پہنچایا جائے۔ یہ چیز آخر دنیا کے اہل علم پر کیا اثر ڈالے گی اور ہماری عدالتوں کے وقار میں کیا اضافہ کرے گی؟ مثال کے طور پر پہلی ہی حدیث کے دو فقرے ملاحظہ ہوں: وای شانہ لم یکن عجبًا کا ترجمہ "اور اس سے زیادہ عجیب بات اور کیا ہو سکتی ہے" کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے: "ان کی کون سی بات عجیب نہ تھی"۔ ذرینی اتعبد لربی کو مترجم نے ذرینی اتعبد لربی پڑھا اور اس کا ترجمہ یوں کر دیا "چھوڑ دے مجھ کو، کیا تو میرے رب کی عبادت کرے گی؟" حالانکہ صرف یہ ترجمہ ہی مہمل نہیں ہے بلکہ اصل عبارت کو پڑھنے میں مترجم نے وہ غلطی کی ہے جو عربی گرامر کی ابجد سے واقفیت رکھنے والا

آدمی بھی نہیں کر سکتا۔ تعبد صیغہ مذکر ہے اور سیاق عبارت بتا رہا ہے کہ مخاطب عورت ہے۔ عورت کو خطاب کر کے تعبدین کہا جاتا نہ کہ تعبد۔ صحیح ترجمہ اس فقرے کا یہ ہے کہ "مجھے چھوڑ دے تاکہ میں اپنے رب کی عبادت کروں"۔ اس طرح کی غلطیوں کو دیکھ کر آخر کون صاحب علم یہ باور کرے گا کہ فاضل جج حدیث کے علم میں کم از کم اتنا درک رکھتے ہیں جتنا کسی فن پر ماہرانہ رائے دینے کے لیے ناگزیر ہے۔

بعض احادیث میں عریاں مضامین کیوں ہیں؟

اب ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پیراگراف ۲۶ میں فاضل جج یکے بعد دیگرے ۹ حدیثیں نقل کرتے چلے گئے ہیں اور کسی جگہ انہوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ کس حدیث کے مضمون پر انہیں کیا اعتراض ہے۔ البتہ پیراگراف ۲۷ میں وہ اختصار کے ساتھ اس خیال کا اظہار فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں جو "عریانی" پائی جاتی ہے اس کی بنا پر وہ یہ باور نہیں کر سکتے کہ واقعی یہ احادیث سچی ہوں گی۔ غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خواتین کے درمیان اور پھر ازواج مطہرات اور ان کے شاگردوں کے درمیان ایسی کھلی کھلی گفتگو آخر کیسے ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں فاضل جج کی پیش کردہ احادیث پر فرداً فرداً کلام کرنے سے پہلے چند اصولی باتیں بیان کر دینی ضروری ہیں' کیونکہ موجودہ زمانے کے "تعلیم یافتہ" اصحاب بالعموم انہی باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس طرح کی احادیث پر الجھتے ہیں۔

اول یہ کہ انسان کی داخلی زندگی کے چند گوشے ایسے ہیں جن کے متعلق اس کو ضروری تعلیم و تربیت اور ہدایات دینے میں شرم کا بے جا احساس اکثر مانع ہوتا رہا ہے' اور اسی وجہ سے اعلیٰ ترقی یافتہ قومیں تک ان کے بارے میں طہارت و نظافت کے ابتدائی اصولوں تک سے ناواقف رہی ہیں۔ شریعت الٰہی کا یہ احسان ہے کہ اس نے ان گوشوں کے بارے میں بھی ہم کو ہدایات دیں اور ان کے متعلق قواعد و

ضوابط بتا کر ہمیں غلطیوں سے بچایا۔ غیر قوموں کے صاحب فکر لوگ اس چیز کی قدر کرتے ہیں' کیونکہ ان کی قومیں اس خاص شعبہ زندگی کی تعلیم و تربیت سے محروم ہیں۔ مگر مسلمان جن کو گھر بیٹھے یہ ضابطے مل گئے' آج اس تعلیم کی ناقدری کر رہے ہیں' اور عجیب لطیفہ ہے کہ اس ناقدری کے اظہار میں وہ لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں جو اہل مغرب کی تقلید میں (Sex Education) تک مدارس میں رائج کرنے کے قائل ہیں۔

دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس نبی پاکؐ کو ہماری تعلیم کے لیے مامور فرمایا تھا' اسی کے ذمہ یہ خدمت بھی کی تھی کہ اس خاص شعبہ زندگی کی تعلیم و تربیت بھی ہمیں دے۔ اہل عرب اس معاملہ میں ابتدائی ضابطوں تک سے ناواقف تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی طہارت' استنجا' اور غسل وغیرہ کے مسائل' نیز ایسے ہی دوسرے مسائل نہ صرف زبان سے سمجھائے' بلکہ اپنی ازواج مطہرات کو بھی اجازت دی کہ آپؐ کی خانگی زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کریں اور عام لوگوں کو بتائیں کہ حضورؐ خود کن ضابطوں پر عمل فرماتے تھے۔

سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسی ضرورت کی خاطر حضورؐ کی ازواج مطہرات کو مومنین کے لیے ماں کا درجہ عطا فرمایا تھا تاکہ مسلمان ان کی خدمت میں حاضر ہو کر زندگی کے ان گوشوں کے متعلق رہنمائی حاصل کر سکیں اور جانبین میں ان مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کسی قسم کے ناپاک جذبہ کی دخل اندازی کا خطرہ نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایک نظیر بھی اس بات کی نہیں ملتی کہ جو باتیں امہات المومنین سے پوچھی گئی ہیں وہ خلفائے راشدین یا دوسرے صحابیوں کی بیگمات سے بھی کبھی پوچھی گئی ہوں اور انہوں نے مردوں سے اس نوعیت کی گفتگو کی ہو۔

چہارم یہ کہ لوگ اپنے گمان سے' یا یہود و نصاریٰ کے اثر سے جن چیزوں کو

حرام یا مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھ بیٹھے تھے' ان کے متعلق صرف یہ سن کر ان کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ شریعت میں وہ جائز ہیں۔ حکم جواز کے باوجود ان کے دلوں میں یہ شک باقی رہ جاتا تھا کہ شاید یہ کراہت سے خالی نہ ہو اس لیے وہ اپنے اطمینان کی خاطر یہ معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ حضورؐ کا اپنا طرز عمل کیا تھا۔ جب وہ یہ جان لیتے تھے کہ حضورؐ نے خود فلاں عمل کیا ہے' تب ان کے دلوں سے کراہت کا خیال نکل جاتا تھا' کیونکہ وہ حضورؐ کو ایک مثالی انسان سمجھتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ جو کام آپؐ نے کیا ہو وہ مکروہ یا پایہ ثقاہت سے گرا ہوا نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک اہم درجہ ہے جس کی بنا پر ازواج مطہرات کو حضورؐ کی خانگی زندگی کے بعض ایسے معاملات کو بیان کرنا پڑا جو دوسری خواتین نہ بیان کر سکتی ہیں' نہ ان کو بیان کرنا چاہیے۔

پنجم یہ کہ احادیث کا یہ حصہ درحقیقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کی نبوت کے بڑے اہم شواہد میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ محمدؐ رسول اللہ کے سوا دنیا میں کون یہ ہمت کر سکتا تھا' اور پوری تاریخ انسانی میں کس نے یہ ہمت کی ہے کہ ۲۳ سال تک شب و روز کے ہر لمحے اپنے آپ کو منظر عام پر رکھ دے' اپنی پرائیویٹ زندگی کو بھی پبلک بنا دے' اور اپنی بیویوں تک کو اجازت دے دے کہ میری گھر کی زندگی کا حال بھی لوگوں کو صاف صاف بتا دو۔

اعتراضات کا تفصیلی جائزہ

ان امور کو نگاہ میں رکھ کر فرداً فرداً ان احادیث کو ملاحظہ فرمایئے جو فاضل جج نے پیش کی ہیں۔

پہلی حدیث میں حضرت عائشہؓ دراصل یہ بتانا چاہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ رہبانیت سے بالکل دور تھے' اور اپنی بیویوں سے وہی ربط و تعلق رکھتے تھے جو دنیا کے ہر شوہر کا اپنی بیوی سے ہوتا ہے' لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے آپؐ کا ایسا گہرا تعلق تھا کہ بستر میں بیوی کے ساتھ لیٹ جانے کے بعد بھی بسا اوقات

یکایک آپؐ پر عبادت کا شوق غالب آ جاتا تھا اور آپؐ دنیا کا لطف و عیش چھوڑ کر اس طرح اٹھ جاتے تھے کہ گویا آپؐ کو خدا کی بندگی کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا یہ مخفی گوشہ آپؐ کی اہلیہ کے سوا اور کون بتا سکتا تھا؟ اور اگر یہ روشنی میں نہ آتا تو آپؐ کے اخلاص للہ کی صحیح کیفیت دنیا کیسے جانتی؟ مجلس وعظ میں خدا کی محبت اور خشیت کا مظاہرہ کون نہیں کرتا۔ سچی اور گہری محبت و خشیت کا حال تو اسی وقت کھلتا ہے جب معلوم ہو کہ گوشہ تنہائی میں آدمی کا رنگ زندگی کیا ہوتا ہے۔

دوسری حدیث میں دراصل بتانے کا مقصود یہ ہے کہ بوسہ بجائے خود وضو توڑنے والی چیز نہیں ہے جب تک کہ غلبہ جذبات سے کوئی رطوبت خارج نہ ہو جائے۔ عام طور پر لوگ خود بوسے ہی کو ناقض وضو سمجھتے تھے۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ اس سے اگر وضو ٹوٹتا نہیں ہے تو کم از کم طہارت میں فرق ضرور آ جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ کو ان کا شک دور کرنے کے لیے یہ بتانا پڑا کہ حضورؐ نے خود اس کے بعد وضو کیے بغیر نماز پڑھی ہے۔ یہ مسئلہ دوسرے لوگوں کے لیے چاہے کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو' مگر جنہیں نماز پڑھنی ہو' ان کو تو یہ معلوم ہونے کی بہرحال ضرورت ہے کہ کس حالت میں وہ نماز پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں اور کس حالت میں نہیں ہوتے۔

تیسری حدیث میں ایک خاتون کو اس مسئلے سے سابقہ پیش آ جاتا ہے کہ اگر ایک عورت اسی طرح کا خواب دیکھے جیسا عام طور پر بالغ مرد دیکھا کرتے ہیں تو وہ کیا کرے۔ یہ صورت چونکہ عورتوں کو بہت کم پیش آتی ہے اس لیے عورتیں اس کے شرعی حکم سے ناواقف تھیں۔ ان خاتون نے جا کر مسئلہ پوچھ لیا اور حضورؐ نے یہ بتا کر عورت کو بھی مرد ہی کی طرح غسل کرنا چاہیے' نہ صرف ان کو بلکہ تمام عورتوں کو ایک ضروری تعلیم دے دی۔ اس پر اگر کسی کو اعتراض ہے تو گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ عورتیں اپنی زندگی کے مسائل کسی سے نہ پوچھیں اور شرم کے مارے

خود ہی جو کچھ اپنی سمجھ میں آئے' کرتی رہیں۔ رہا حدیث کا دوسرا ٹکڑا تو اس میں ایک خاتون کے اظہار تعجب پر حضورؐ نے یہ علمی حقیقت بیان فرمائی ہے کہ عورت سے بھی اسی طرح مادہ خارج ہوتا ہے۔ جس طرح مرد سے ہوتا ہے۔ اولاد ان دونوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے اور دونوں میں سے جس کا نطفہ بھی غالب رہتا ہے بچے میں اسی کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ اس حدیث کی جو تفصیلات بخاری و مسلم کے مختلف ابواب میں آئی ہیں ان کو ملا کر دیکھیے۔ ایک روایت میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں:

وهل يكون الشبه الامن قبل ذالك؟ اذا علا ماء ها ماء الرجل اشبه الولد اخواله واذا علا ماء الرجل ماء ها اشبه الولد اعمامه۔

"اور کیا اولاد کی مشابہت اس کے سوا کسی اور وجہ سے ہوتی ہے؟ جب عورت کا نطفہ مرد کے نطفے پر غالب رہتا ہے تو بچہ ننھیال پر جاتا ہے اور جب مرد کا نطفہ اس کے نطفے پر غالب رہتا ہے تو بچہ ددھیال پر جاتا ہے"۔

منکرین حدیث نے جہالت یا شرارت سے ان احادیث کو یہ معنی پہنائے ہیں کہ مجامعت میں اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے ورنہ ماں پر۔ ہم اس ملک کی حالت پر حیران ہیں کہ یہاں جہلاء اور اشرار اعلانیہ اس قسم کی علمی دغابازی کر رہے ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تک تحقیق کے بغیر اس سے متاثر ہو کر اس غلط فہمی میں پڑ رہے ہیں کہ احادیث ناقابل یقین باتوں سے لبریز ہیں۔

چوتھی حدیث میں حضرت عائشہؓ نے یہ بتایا ہے کہ زوجین ایک ساتھ غسل کر سکتے ہیں اور حضورؐ نے خود ایسا کیا ہے۔ اس مسئلے کے معلوم کرنے کی ضرورت دراصل ان لوگوں کو پیش آئی تھی جن کے ہاں بیویاں اور شوہر سب نماز کے پابند تھے۔ فجر کے وقت ان کو بارہا اس صورت حال سے سابقہ پیش آتا تھا کہ وقت کی تنگی کے باعث یکے بعد دیگرے غسل کرنے سے ایک کی جماعت چھوٹ جاتی تھی۔

ایسی حالت میں ان کو یہ بتانا ضروری تھا تاکہ دونوں کا ایک ساتھ غسل کر لینا نہ صرف جائز ہے بلکہ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ مدینے میں اس وقت بجلی کی روشنی والے غسل خانے نہیں تھے اور فجر کی نماز اس زمانے میں اول وقت ہوا کرتی تھی' اور عورتیں بھی صبح اور عشاء کی نمازوں میں مسجد جایا کرتی تھیں۔ ان باتوں کو نگاہ میں رکھ کر ہمیں بتایا جائے کہ اس حدیث میں کیا چیز ماننے کے لائق نہیں ہے۔

پانچویں حدیث میں حضرت عائشہؓ نے بتایا ہے کہ خواب سے غسل کس حالت میں واجب ہوتا ہے اور کس حالت میں واجب نہیں ہوتا۔ اور چھٹی حدیث میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ بیداری کی حالت میں غسل کب واجب ہو جاتا ہے۔ ان دونوں حدیثوں کو آدمی اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ وجوب غسل کے معاملہ میں اس وقت صحابہ کرام اور تابعین کے درمیان ایک اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ بعض صحابہ اور ان کے شاگرد اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ غسل صرف اس وقت واجب ہوتا ہے جب مادہ خارج ہو۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے حضرت عائشہؓ کو یہ بتانا پڑا کہ یہ حکم صرف خواب کی حالت کے لیے ہے' بیداری میں مجرد دخول موجب غسل ہو جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل اسی طریقے پر تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ نماز پڑھنے والوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ جو شخص صرف خروج مادہ پر غسل واجب ہونے کا قائل ہوتا وہ مباشرت بلا اخراج مادہ کے بعد نماز پڑھنے کی غلطی کر سکتا تھا' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل بتانے ہی سے اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہوا۔

احادیث نمبر ۷' ۸' ۹' ۱۰ اور ۱۱ کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کے ناپاک ہونے کا تصور قدیم شریعتوں میں بھی تھا اور شریعت محمدیہ میں بھی پیش کیا گیا۔ لیکن قدیم شریعتوں میں یہودیوں اور عیسائی راہبوں کی مبالغہ آرائی نے اس تصور کو حد اعتدال سے اتنا بڑھا دیا تھا کہ وہ اس

حالت میں انسان کے وجود ہی کو ناپاک سمجھنے لگے تھے' اور ان کے اثر سے حجاز کے' اور خصوصاً مدینے کے باشندوں میں بھی یہ تصور حد مبالغہ کو پہنچ گیا تھا۔ خصوصاً حائضہ عورت کا تو اس معاشرے میں گویا پورا مقاطعہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اسی کتاب مشکوٰۃ میں' جس سے فاضل جج نے یہ حدیث نقل کی ہیں' باب الحیض کی پہلی حدیث یہ ہے کہ "جب عورت کو حیض آتا تھا تو یہودی اس کے ساتھ کھانا پینا اور اس کے ساتھ رہنا سہنا چھوڑ دیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا کہ اس حالت میں صرف فعل مباشرت ناجائز ہے' باقی ساری معاشرت اسی طرح رہنی چاہئے جیسی عام حالت میں ہوتی ہے"۔ لیکن اس کے باوجود ایک مدت تک لوگوں میں قدیم تعصبات باقی رہے اور لوگ یہ سمجھتے رہے کہ جنابت اور حیض کی حالت میں انسان کا وجود کچھ نہ کچھ گندا تو رہتا ہی ہے' اور اس حالت میں اس کا ہاتھ جس چیز کو لگ جائے وہ بھی کم از کم مکروہ تو ضرور ہو جاتی ہے۔ ان تصورات کو اعتدال پر لانے کے لیے حضرت عائشہؓ کو یہ بتانا پڑا کہ حضورؐ خود اس حالت میں کوئی اجتناب نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ کے نزدیک نہ پانی گندا ہوتا تھا' نہ بستر' نہ جانماز۔ نیز یہ بھی انہوں نے ہی بتایا کہ حائضہ بیوی کے ساتھ اس کا شوہر صرف ایک فعل نہیں کر سکتا' باقی ہر قسم کا اختلاط جائز ہے۔ ان تعصبات کو حضورؐ کا اپنا فعل بتا کر حضرت عائشہؓ اور دوسری ازواج مطہرات نے نہ توڑ دیا ہوتا تو آج ہمیں اپنی گھریلو معاشرت میں جن تنگیوں سے سابقہ پیش آ سکتا تھا ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن اپنے ان محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے ہم اب بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں کہ بھلا نبیؐ کی بیوی اور ایسی باتیں بیان کرے!

دو مزید حدیثوں پر اعتراض

پھر پیراگراف ۲۸ میں فاضل جج دو حدیثیں نقل فرماتے ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپ نے جنت کو دیکھا اور اس کے اکثر باشندے فقراء و مساکین تھے' اور آپؐ نے دوزخ کو دیکھا اور اس میں کثرت عورتوں کی

تھی۔ ان حادیث کے متعلق وہ نہ صرف یہ خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ "میں اپنے آپ کو یہ یقین کرنے کے ناقابل پاتا ہوں کہ محمدؐ رسول اللہ نے یہ باتیں کہی ہوں گی"۔ بلکہ وہ ان احادیث کے پہلے حصے پر یہ رائے زنی بھی کرتے ہیں کہ "اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ مسلمانوں کو دولت حاصل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے"۔

اس طرح کی کوئی حدیث اگر سرسری طور پر کبھی آدمی کی نظر سے گزر جائے تو وہی غلط فہمی لاحق ہوتی ہے جس کا ذکر فاضل جج نے کیا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے احادیث کا وسیع مطالعہ کیا ہے اور جن کی نگاہ سے اس نوعیت کی بیشتر احادیث گزری ہیں' ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ حضورؐ نے اپنے یہ مشاہدات محض بیان واقعہ کی خاطر بیان نہیں کیے ہیں بلکہ مختلف انسانی گروہوں کی اصلاح کے لیے بیان فرمائے ہیں۔ آپ نے صرف یہی نہیں بتایا کہ غریب آدمیوں کی بہ نسبت دولت مند لوگ جہنم کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں بلکہ دولت مندوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی وہ کیا برائیاں ہیں جو آخرت میں ان کا مستقبل خراب کرتی ہیں' اور انہیں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ دنیا کی طرح آخرت میں بھی خوشحال رہیں۔ اسی طرح آپ نے اپنے مختلف ارشادات میں عورتوں کو یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے کون سے عیوب انہیں جہنم کے خطرے میں مبتلا کرتے ہیں جن سے انہیں بچنا چاہیے' اور کون سی بھلائیاں اختیار کر کے وہ جنت کی مستحق ہو سکتی ہیں۔ جن اصحاب کو ایک مسئلے کے تمام متعلقات کا مطالعہ کرنے کی فرصت نہ ہو' انہیں کیا ضرورت ہے کہ جزوی معلومات پر اعتماد کر کے اظہار رائے فرمائیں۔

ایک اور حدیث پر اعتراض

اس کے بعد پیراگراف ۲۹ میں فاضل جج فرماتے ہیں:

"مزید برآں کیا یہ قابل یقین ہے کہ محمدؐ رسول اللہ نے وہ بات فرمائی ہوگی جو حدیث بخاری کے صفحہ ۸۵۲ پر روایت نمبر ۴۲/۷۲/۲ میں عبداللہ بن قیس سے مروی ہے کہ مسلمان جنت میں ان عورتوں سے مباشرت کریں گے جو ایک خیمے کے

مختلف گوشوں میں بیٹھی ہوں گی"۔

ہم حیران تھے کہ یہ "حدیث بخاری" آخر کون سی کتاب ہے جس کے صفحہ ۸۵۲ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آخر شبہ گزرا کہ شاید اس سے مراد تجرید البخاری کا اردو ترجمہ ہو جو ملک دین محمد اینڈ سنز نے شائع کیا ہے۔ اسے نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی حوالہ اسی کا ہے۔ اب ذرا اس ستم کو ملاحظہ کیجئے کہ فاضل جج علم حدیث پر ایک عدالتی فیصلے میں ماہرانہ اظہار رائے فرما رہے ہیں اور حوالہ ایک ایسے غلط سلط ترجمے کا دے رہے ہیں جس کے مترجم کا نام تک کتاب میں ظاہر نہیں کیا گیا ہے، پھر اس پر مزید ستم یہ کہ اصل حدیث کے الفاظ پڑھنے کے بجائے ترجمے کے الفاظ پڑھ کر رائے قائم فرما رہے ہیں اور یہ تک محسوس نہیں فرماتے کہ ترجمے میں کیا غلطی ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ اور ان کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

ان فی الجنة خیمة من لولوة مجوفة عرضها ستون میلا وفی کل زاویة منها اهل ما یرون الاخرین۔

جنت میں ایک خیمہ ہے جو کھوکھلے موتی سے بنا ہوا ہے اس کا عرض ۶۰ میل ہے۔ اس کے ہر گوشے میں رہنے والے دوسرے گوشوں میں رہنے والوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ مومن ان پر گشت کریں گے۔
(یعنی وقتاً فوقتاً ہر ایک گوشے والوں کے پاس جاتے رہیں گے)

خط کشیدہ فقرے میں یطوفون علیھم کا ترجمہ مترجم نے "ان سے مباشرت کریں گے" کر دیا ہے اور فاضل جج نے اسی پر اپنی رائے کا مدار رکھ دیا ہے۔ حالانکہ "طاف علیه" کے معنی وقتاً فوقتاً کسی کے پاس جاتے رہنے کے ہیں نہ کہ مباشرت کرنے کے۔ قرآن مجید میں جنت ہی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یطوفون علیھم ولدان مخلدون۔ "ان پر ایسے لڑکے گشت کرتے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہنے والے ہیں"۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لڑکے ان سے مباشرت کریں گے؟ سورۂ نور میں لونڈی غلاموں اور نابالغ لڑکیوں کے متعلق حکم دیا

گیا ہے کہ وہ تین اوقات میں تو صاحب خانہ کی خلوت گاہ میں اجازت لیے بغیر داخل نہ ہوں' البتہ باقی اوقات میں وہ بلااجازت آسکتے ہیں' اور اس حکم کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ "طوافون علیکم" "وہ تم پر گشت کرنے والے ہیں"۔ کیا یہاں بھی اس طواف کے معنی مباشرت ہی کے ہوں گے؟ زیر بحث حدیث میں "اہل" سے مراد اگر ایک مومن کی بیویاں ہی ہوں جو اس ۴۰ میل چوڑے خیمے کے مختلف حصوں میں رہیں گی' تب بھی کسی شخص کو اپنی مختلف بیویوں کے گھروں میں جانا کیا لازماً مباشرت ہی کا ہم معنی ہے؟ کیا کوئی بھلا آدمی اس ایک کام کے سوا اپنی بیوی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا؟ طواف کا یہ ترجمہ تو صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کے ذہن پر جنس بری طرح سوار ہو۔

سنت کے حجت نہ ہونے پر دو مزید دلیلیں

پیراگراف ۳۰ میں فاضل جج دو اور دلیلیں پیش فرماتے ہیں۔ اول یہ کہ رافع بن خدیج والی روایت میں (جس کا حوالہ انہوں نے دیا ہے) حضورؐ نے خود یہ فرمایا ہے کہ جو معاملات دین سے تعلق نہیں رکھتے' ان میں آپ کی بات کو حرف آخر نہ سمجھ لیا جائے۔ دوم یہ کہ حضورؐ نے خود اس پر زور دیا ہے (اور یہاں کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا) کہ صرف قرآن ہی وہ ایک کتاب ہے جو تمام شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں کی رہنما ہونی چاہئے۔

ان میں سے پہلی دلیل خود اس حدیث ہی سے ٹوٹ جاتی ہے جس کا حوالہ انہوں نے دیا ہے۔ اس میں واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے اہل مدینہ کو کھجوروں کی باغبانی کے معاملے میں ایک مشورہ دیا تھا جس پر عمل کیا گیا تو پیداوار کم ہو گئی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ "میں جب تمہارے دین کے معاملہ میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی پیروی کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بس ایک بشر ہی ہوں"۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن معاملات کو دین اسلام نے اپنے دائرۂ رہنمائی میں لیا ہے ان میں تو حضورؐ کے ارشاد گرامی کی پیروی لازم ہے'

البتہ جن معاملات کو دین نے اپنے دائرے میں نہیں لیا ہے ان میں آپ کی رائے واجب الاتباع نہیں ہے۔ اب ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ دین نے کن معاملات کو اپنے دائرے میں لیا ہے اور کن کو نہیں لیا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو باغبانی' یا درزی کا کام یا باورچی کا کام سکھانا دین نے اپنے ذمہ نہیں لیا ہے۔ لیکن خود قرآن ہی اس بات پر شاہد ہے کہ دیوانی اور فوجداری قوانین' عائلی قوانین' معاشی قوانین اور اسی طرح اجتماعی زندگی کے تمام معاملات کے متعلق احکام قوانین بیان کرنے کو دین اسلام نے اپنے دائرۂ عمل میں لیا ہے۔ ان امور کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو رد کر دینے کے لیے مذکورۂ بالا حدیث کو دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

رہی دوسری دلیل' تو براہ کرم ہمیں بتایا جائے کہ حضورؐ کی کس حدیث میں یہ مضمون آیا ہے کہ مسلمانوں کو رہنمائی کے لیے صرف قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حضورؐ نے تو اس کے برعکس یہ فرمایا ہے کہ:

> ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما' کتاب اللّٰہ وسنۃ رسولہ۔ (موطا)
>
> میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' جب تک تم انہیں تھامے رہو' ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ ایک خدا کی کتاب' دوسرے اس کے رسولؐ کی سنت۔

کیا محدثین کو خود احادیث پر اعتماد نہ تھا

پیراگراف ۳۱ میں فاضل جج ایک اور دلیل لاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: "یہ بات کہ محدثین خود اپنی جمع کردہ احادیث کی صحت پر مطمئن نہ تھے' صرف اسی ایک امر واقعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے یہ نہیں کہتے کہ ہماری جمع کردہ احادیث کو صحیح مان لو بلکہ یہ کہتی ہیں کہ انہیں ہمارے معیار صحت پر جانچ کر اپنا اطمینان کر لو۔ اگر انہیں ان احادیث کی صحت کا یقین ہوتا تو یہ جانچنے کا سوال بالکل غیر ضروری تھا"۔

درحقیقت یہ ایک عجیب استدلال ہے۔ دنیا کا کوئی محقق آدمی کسی چیز کو اس وقت تک صحیح نہیں کہتا جب تک اسے اپنی جگہ اس کی صحت کا اطمینان نہیں ہو جاتا لیکن آپ کسی ایماندار محقق سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی تحقیق پر ایمان لے آنے کا دنیا بھر سے مطالبہ کرے گا اور دھڑلے کے ساتھ لوگوں سے کہے گا کہ میں اسے صحیح سمجھتا ہوں' لہٰذا تم کو بھی اسے صحیح مان لینا چاہیے۔ وہ تو یہی کرے گا کہ اپنی تحقیقات کے دوران میں جو مواد بھی اس کے سامنے آیا ہے' وہ سب کا سب لوگوں کے سامنے رکھ دے گا اور بتا دے گا کہ اس مواد کی بنیاد پر میں ان نتائج تک پہنچا ہوں۔ تم بھی انہیں جانچ لو' اگر تمہارا اطمینان میرے اخذ کردہ نتائج پر ہو تو انہیں قبول کر لو' ورنہ یہ مواد حاضر ہے' اس کے ذریعہ سے خود تحقیق کر لو۔ محدثین نے یہی کام کیا ہے۔ انہیں حضورؐ کا جو فعل یا قول بھی پہنچا ہے اس کی پوری سند انہوں نے بیان کر دی ہے۔ ہر سند میں جتنے راوی آئے ہیں ان میں سے ایک ایک کر کے حالات بیان کر دیئے ہیں' مختلف سندوں سے آنے والی روایات میں جن جن پہلوؤں سے ضعف یا قوت کا کوئی پہلو نکلتا ہے' اسے بھی صاف صاف بتا دیتا ہے اور ہر حدیث کے متعلق اپنی رائے دے دی ہے کہ ہم فلاں فلاں دلائل کی بنا پر اس کو صحت یا کمزوری کے اعتبار سے یہ درجہ دیتے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن حدیثوں کو وہ اس مدلل طریقے سے صحیح کہتے ہیں وہ ان کے نزدیک صحیح ہی ہیں۔ ان کی صحت کا انہیں یقین نہ ہوتا تو وہ آخر انہیں صحیح کہتے ہی کیوں۔ مگر کیا اس کے بعد انہیں یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ اے مسلمانو! تم بھی ان کی صحت پر ایمان لاؤ کیونکہ ہم انہیں صحیح قرار دے رہے ہیں؟

احادیث میں اجمال اور بے ربطی کی شکایت

پیراگراف ۳۳ میں فاضل جج دو باتیں اور ارشاد فرماتے ہیں جن پر ان کے دلائل کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ "بہت سی احادیث بہت مختصر اور بے ربط ہیں جنہیں پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کو سیاق و سباق

اور موقع و محل سے الگ کر کے بیان کیا گیا ہے۔ ان کو ٹھیک سمجھنا اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا مشخص کرنا ممکن نہیں ہے۔ جب تک ان کا سیاق سامنے نہ ہو' اور وہ حالات معلوم نہ ہوں جن میں رسول پاکؐ نے کوئی بات کہی ہے یا کوئی کام کیا ہے"۔ دوسری بات وہ فرماتے ہیں کہ "یہ کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ حدیث قرآن کے احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی' مگر کم از کم ایک مسئلے میں تو احادیث نے قرآن پاک میں ترمیم کر دی ہے اور وہ وصیت کا مسئلہ ہے"۔

ان دونوں باتوں کے متعلق بھی چند کلمات عرض کر کے ہم اس تنقید کو ختم کرتے ہیں۔

پہلی بات دراصل ایک ایسا تاثر ہے جو حدیث کی محض کتابوں میں سے کسی کو سرسری طور پر پڑھنے سے ایک عام ناظر لیتا ہے۔ لیکن ذخیرۂ احادیث کے وسیع علمی مطالعہ کے بعد آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر احادیث جو کسی جگہ مختصر اور بے ربط ہیں' کسی دوسری جگہ ان کا پورا سیاق و سباق' تمام متعلقہ واقعات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ پھر جن احادیث کے معاملہ میں تفصیلات نہیں ملتیں' ان پر بھی اگر غور کیا جائے تو ان کے الفاظ خود ان کے پس منظر کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے پس منظر کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے حدیث اور سیرت کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد اور اس وقت کے معاشرے کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ وہ ایک مختصر حدیث میں اچانک کسی قول یا کسی واقعہ کا ذکر دیکھ کر بآسانی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ بات کن حالات میں اور کس محل پر کہی گئی ہے' اور یہ واقعہ کس سلسلہ واقعات میں پیش آیا ہے۔ اس کی کچھ مثالیں اس سے پہلے اسی تنقید کے سلسلے میں بعض احادیث کی تشریح کرتے ہوئے ہم پیش کر چکے ہیں۔

کیا حدیث' قرآن میں ترمیم کرتی ہے؟

دوسری بات کے متعلق ہم عرض کریں گے کہ وصیت کے متعلق جن احادیث کو فاضل جج قرآن میں ترمیم کا ہم معنی قرار دے رہے ہیں' ان کو اگر سورۂ نساء

کے احکام میراث کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حکم قرآن کی ترمیم نہیں بلکہ توضیح کی گئی ہے۔ اس سورہ کے دوسری رکوع میں چند رشتہ داروں کے حصے مقرر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ حصے مورث کی وصیت پوری کرنے کے بعد اور اس کا قرض ادا کرنے کے بعد نکالے جائیں۔ اب اگر فرض کیجئے کہ ایک شخص یہ وصیت کرے کہ کسی وارث کو قرآن کے مقرر کردہ حصے سے کم دیا جائے' اور کسی کو اس سے زیادہ دیا جائے' اور کسی کو کچھ نہ دیا جائے' تو دراصل وہ وصیت کے ذریعہ سے قرآن کے حکم میں ترمیم کا مرتکب ہو گا۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لاوصیة لوارث "وارث کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کی جا سکتی" یعنی اس کا جو حصہ قرآن میں مقرر کر دیا گیا ہے' اسے وصیت کے ذریعہ سے نہ ساقط کیا جا سکتا ہے' نہ گھٹایا جا سکتا ہے' نہ بڑھایا جا سکتا ہے' بلکہ لازماً قرآن ہی کے مطابق وارثوں میں ترکہ تقسیم کرنا ہو گا۔ البتہ غیر وارث لوگوں کے حق میں' یا اجتماعی مفاد کے لیے یا راہ خدا میں صرف کرنے کے لیے ایک شخص وصیت کر سکتا ہے لیکن اس صورت میں یہ امکان بھی تھا کہ ایک شخص کسی وجہ سے اپنا تمام مال یا اس کا بڑا حصہ غیروارثوں ہی کو دے دینے کی وصیت کر بیٹھے اور وارثوں کو محروم کر دے۔ اس لیے حضورؐ نے مورث کے اختیارات پر ایک اور پابندی یہ عائد کر دی کہ وہ صرف ۱/۳ مال کی حد تک ہی وصیت کر سکتا ہے' باقی ۲/۳ لازماً اسے ان حق داروں کے لیے چھوڑنا ہو گا جن کو قرآن نے قریب ترین حق دار قرار دیا ہے اور تنبیہ کر دی ہے کہ لا تدرون ایھم اقرب لکم نفعا۔ قرآنی حکم پر عمل کرنے کے لیے یہ قواعد و ضوابط جو قرآن کے لانے والے رسولؐ نے بنا دیئے ہیں' ان کو اچھی طرح سمجھ کر ہمیں بتایا جائے کہ آخر کس معقول دلیل سے ان کو "ترمیم" کی تعریف میں لایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی باتیں کرنے سے پہلے آخر کچھ تو سوچنا چاہئے کہ قرآن مجید کے احکام کی توضیح و تشریح اگر اس کا لانے والا ہی نہ کرے گا تو اور کون کرے گا۔ اور اگر یہ تشریح اس وقت نہ کر دی جاتی تو وصیت کے اختیارات استعمال کرنے میں لوگ قرآن کے

قانون وراثت کا کس طرح حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے۔ پھر اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ اس صحیح تشریح کو تو فاضل جج "ترمیم" قرار دیتے ہیں، لیکن خود اپنے اسی فیصلے میں انہوں نے بطور نمونہ قرآن کے تین احکام کی جو مجتہدانہ تعبیریں فرمائی ہیں ان کے متعلق وہ بالکل محسوس نہیں فرماتے کہ دراصل ترمیم کی تعریف میں تو ان کی اپنی یہ تعبیرات آتی ہیں۔

آخری گزارش

یہ ہیں وہ جملہ دلائل جو فاضل جج نے حدیث و سنت کے متعلق اپنی رائے کے حق میں پیش کیے ہیں۔ ہم نے ان میں سے ایک ایک دلیل کا تفصیلی جائزہ لے کر جو بحث کی ہے اسے پڑھ کر ہر صاحب علم آدمی خود یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ ان دلائل میں کتنا وزن ہے اور ان کے مقابلے میں سنت کے ماخذ قانون ہونے اور احادیث کے قابل استناد ہونے پر جو دلیلیں ہم نے قائم کی ہیں وہ کس حد تک وزنی ہیں۔ ہم خاص طور پر خود فاضل جج سے، اور مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور ان کے رفقاء سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ پورے غور کے ساتھ ہماری اس تنقید کو ملاحظہ فرمائیں اور اگر ان کی بے لاگ رائے میں، جیسی کہ ایک عدالت عالیہ کے فاضل ججوں کی رائے بے لاگ ہونی چاہیے، یہ تنقید فی الواقع مضبوط دلائل پر مبنی ہو تو وہ قانون کے مطابق کوئی ایسی تدبیر عمل میں لائیں جس سے یہ فیصلہ آئندہ کے لیے نظیر نہ بن سکے۔ عدالتوں کا وقار ہر ملک کے نظام عدل و انصاف کی جان ہوتا ہے اور بہت بڑی حد تک اسی پر ایک مملکت کے استحکام کا انحصار ہوتا ہے۔ اس وقار کے لیے کوئی چیز اس سے بڑھ کر نقصان دہ نہیں ہے کہ ملک کی بلند ترین عدالتوں کے فیصلے علمی حیثیت سے کمزور دلائل اور ناکافی معلومات پر مشتمل ہوں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ جب ایماندارانہ تنقید سے ایسی کسی غلطی کی نشان دہی ہو جائے تو اولین فرصت میں خود حاکمان عدالت ہی اس کی تلافی کی طرف توجہ فرمائیں۔